

کسی دیکھی کسی سارا لایا

میمونہ خورشید علی

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.

پاکستانی پوائنٹ

www.PakistaniPoint.Com



میمونہ خورشید علی

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار، کراچی

کسی راستے کی تلاش میں

”دیکھو بھی کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ میں دن بھر کی تھکی ہوئی ہوں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

”آ۔۔۔ رام۔۔۔ ارے بھی خوب کہی۔ ذہن دروازے پہ پہنچنے والی ہے اور تم آرام کرنے چاہو۔“ شائستہ بیگم نے بھابھو کوٹھکا۔

”ماما۔۔۔ میں بھی سو بنے جا رہی ہوں اور پلینز مجھے صبح جلدی کوئی نہ جگائے۔“ دلنشین نے جمائی۔

”ارے یہ کیا۔ سب ہی گھر والے سو جائیں گے تو ذہن کا استقبال کون کرے گا اور یہ دل آویز کہاں ہے؟“ شائستہ بیگم کو خیرانی ہو رہی تھی۔

”دل آویز کی طبیعت پہلے ہی خراب ہو رہی تھی۔ میرج ہال سے بھی جلدی لوٹ آئی تھی۔ شاید وہ تو صبح ہی مری ہو۔ میں نے تو اپنی بیٹی کو بھی نہیں دیکھا۔ پہلے اسے دیکھوں گی پھر کہیں جا کر نیند آئے گی۔“

”ماما پلینز۔ آپ کو سونے دیں۔ وہ پہلے ہی بہت تھکی ہوئی ہیں۔ شاید انہوں نے نیند کی ٹیبلٹ لے لی ہو۔ صبح ہی مل لیجئے گا۔“

”بیگم صاحبہ! یہ مزید سامان آگیا، کہاں رکھوں؟“

”میرے سر پہ رکھو۔۔۔ اتنا بڑا گھر ہے کہیں بھی رکھ دو۔“

”مگر بیگم صاحبہ! یہ قیمتی سامان ہے۔ میرے مطلب ہے زیورات ہیں اس میں۔“

”یہ زیورات ضرور ہیں مگر قیمتی نہیں ہیں۔ اس کے کمرے میں جا کر ڈال آؤ۔ مجھے کیا لینا دینا اس لیے؟“

”آج کل لوگ جہیز پہلے اٹھوا دیتے ہیں۔ مگر انہیں تو گویا ضد سی ہو گئی تھی کہ جس روز بارات آئے

گی اسی روز جہیز دیں گے۔ اگر پہلے سے یہ کاٹھ کباڑ آجاتا تو اتنی دقت تو نہ ہوتی۔ بس، بارائیاں نے جہیز دیکھ لیا۔ بڑی واہ واہ ہو گئی۔“

”اوہ ماما! بات تو دراصل کچھ اور تھی۔۔۔ درحقیقت انہیں اعتبار نہیں تھا ہم لوگوں پہ۔ سمجھ رہے تھے پہلے سے جہیز پہنچا دیا تو ہم کچھ چوری کر لیں گے۔“ دلنشین نے پھر خیال آرائی کی۔

”ہم تو لعنت بھی نہ بھیجیں، اس سامان پر۔۔۔ میری بیٹی کا جہیز آٹھ دن پہلے اٹھا تھا۔ کسی چیز کو ڈھنگ طریقے سے نہ سجایا، چیزیں چوری کیس کیلئے، ہم تو اپنی بیٹی کا صدقہ جان کر صبر کیے بیٹھے ہیں۔“

”صبر ہی کیا جاسکتا ہے اور صبر کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے؟“ شائستہ نے بھابھ کے دکھ پہ افسوس کرتے ہوئے محل سے کہا۔

”بیگم صاحبہ! یہ عمرے کا ٹکٹ ہے۔ صاحب نے کہا ہے۔ انہیں سنبھال کر رکھ لیں۔“

”عمرے کا ٹکٹ؟“ پہلے تو دلشاد بیگم کو جھوٹا لگا پھر طنز یہ مسکراہٹ چہرے پر پھیل گئی۔ ”نام وری کے لیے لوگ۔“

”بائے کہاں کہاں سے قرضے لیتے ہیں۔ سلائی میں داماد کو عمرے کے ٹکٹ دیے ہیں۔“

آج سے تین سال قبل جب انہوں نے اپنی دل آویز کی شادی کی تھی تو کوئی کسیرس چھوڑی تھی۔ دل آویز کے مقابلے میں بہت ہی معمولی جہیز آیا تھا۔ مگر آنے والی کی قسمت دل آویز سے زیادہ اچھی تھی اور یہ بات دلشاد کو انگاروں پہ لوٹا رہی تھی۔

حورالعین کیونکر اس گھر میں راج کر سکتی تھی۔ نہ تو وہ دلشاد بیگم کی پسند سے اس گھر میں آ رہی تھی اور نہ ہی ان کی بیٹیوں کی۔

طارق، دلشاد بیگم کا چہیتا اور فرماں بردار بیٹا۔ دلشاد بیگم کیسے گوارا کر سکتی تھیں کہ ان کی غریب زندگی بیٹی اس گھر میں آئے جبکہ انہوں نے تو اپنی بیٹی لانے کے خواب دیکھے تھے۔ مگر وہ خواب ان کی آنکھوں میں ہی کرچی کرچی ہو گئے۔ جب ابراہیم نے بیوی کے سامنے بڑے مجبور اور دھیسے لہجے میں یہ کہا۔

”یہ رشتہ اماں نے کیا تھا۔ حورالعین طارق کی بیچپن کی مانگ ہے۔ میں انکار نہیں کر سکتا۔ اُن کو میرے انکار سے رنج ہوگا۔ میں نے زندگی میں کبھی ماں کو دکھ نہیں دیا۔ مرنے کے بعد میں تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔“

طارق تمام صورت حال سے واقف تھا۔ اس کی سوچ دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ باپ جو چاہتا تھا درحقیقت اس کی چاہت بھی وہی تھی، لیکن جب ماں بہنوں کی طرف دیکھتا تو متذبذب ہو جاتا۔

”بابا۔۔۔ میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔“ اس نے تک آ کر فیصلہ سنا دیا۔

”دماغ پھر گیا ہے تمہارا۔ تم ماں بہنوں کی باتوں میں آ کر انکار کر رہے ہو، میں نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا، یہ شادی ضرور ہوگی۔“ ابراہیم صاحب بیٹے پہ بگڑے۔

”میں ماں بہنوں کی باتوں میں آ کر انکار نہیں کر رہا۔ ان مسائل کو دیکھ رہا ہوں جو شادی کے بعد پیدا ہونے والے ہیں۔“ طارق کی سنجیدگی بدستور قائم تھی۔

”فضول سوچ ہے تمہاری۔“ انہوں نے بیٹے کے مفروضے کو رد کر دیا۔

”دل آویز آپنی کی شادی کا بھی اتنا ہی جوش تھا نا آپ کو۔ کون سی خوشی حاصل ہوئی آپ کو ان کی مائی کر کے۔“

”فضول باتیں کر رہے ہوں۔ جو کچھ دل آویز کے ساتھ ہوا، یہ اس کی قسمت تھی۔“
 ”جانتے بوجھتے ہوئے اسے جہنم میں دھکیل دیا آپ نے۔ بابا! کم از کم لڑکا تو دیکھ لیتے آپ۔“
 طارِق کے لہجے میں تاسف تھا۔

”دل آویز کی بات چھوڑو اس کا مسئلہ تم سے مختلف ہے۔“
 ”کیا آپ کو ان کا رنج نہیں؟“ طارِق نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں تو ابراہیم صاحب نے نظریں چرائیں۔

”میں نے اپنی طرف سے اس کی بہتری ہی چاہی تھی۔“
 ”لیکن اس کے ساتھ اچھا تو نہیں ہوا؟“

”طارِق تم صرف خود کو دیکھ رہے ہو۔ دو خاندانوں میں یہ بات بیس سال سے پھیلی ہوئی ہے کہ حور امین، طارِق کی منگیت ہے۔ اگر اس وقت یہ بات ختم ہوگی تو میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا، کچھ لہسا کر سو جاؤں گا۔“ طارِق کو خاموش ہوتے ہی بنی۔

اور جب دو لہبا بنا طارِق اپنی دلہن کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو گھر میں اس کے استقبال کے لیے سرف ملازمین تھے۔ یا صرف شائستہ پھپھو، جو انڈیا سے آئی ہوئی تھیں۔ محض شادی اینڈ کرنے۔ سب سے بڑی پھپھو کو دیکھ کر طارِق کو کچھ تقویت ہوئی۔
 ”ارے بیٹا! کھڑے کیوں رہ گئے۔ اندر آؤ نا۔ ابراہیم! تم بھی تھک گئے ہو گے۔ اب آرام کرو۔“

”آپا! وہ باہر سامان کا ٹرک ہے۔ آپ طارِق کی دلہن کو اندر لے کر چلیں جب تک میں وہ سامان اترواتا ہوں۔“

ملازمین نے پھول نچھاور کیے تھے۔ طارِق اور حور امین سچ سچ چلتے ہوئے شائستہ کے ہمراہ لاؤنج میں آ گئے۔ طارِق کو یک دم ٹھن ہونے لگی تھی۔ وہی ہوا۔ جس کا اسے اول روز سے ڈر تھا۔ شائستہ علیحدہ ہنسنے لگی تھیں۔ یہ رسموں کا وقت تھا۔ بہنیں اپنی مرضی سے نیک مائیں، بھائی کو ستائیں، بھانج کو چھیڑتیں، لیکن یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ رات زیادہ ہونے کی وجہ سے تھکاوٹ کے باعث مہمان رشتہ دار دلہن کے ہمراہ گھر نہیں آئے تھے۔ میرج ہال سے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے ورنہ یہاں تو ٹھیک ٹھاک تماشا لگ جاتا۔

”پھپھو! میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔“ طارِق سے وہاں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ حور امین سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا اسی کی وجہ سے تو اس کی ماں بہنیں اس سے دور ہو گئی تھیں۔ شائستہ سے کہہ کر وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

حور امین تمام صورت حال سے بے خبر آنکھوں میں ہزار پسینے سجائے کچی سنوری بیٹھی تھی۔ طارِق سے اس کا بچپن سے رشتہ تھا۔ طارِق کو بچپن سے ہی پسند کرتی تھی۔ اس کی پرستاشی، اس کی

ذہانت اور پھر مسکرا کر دیکھنے کا انداز۔ اسے سب ہی کچھ تو اچھا لگتا تھا۔

وہ طارق کو کتنا چاہتی ہے۔ وہ اس چیز کا اظہار بار بار اپنی دوستوں اور کزنز کے درمیان کرتی رہتی تھی۔ فطرتاً وہ بہت بولند اور خود اعتماد تھی۔

بارہا یادقت بھی آیا جب اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کا اور طارق کا یہ کچے دھاگوں سے جڑا رشتہ ایک دم ختم ہو جائے گا لیکن طارق کو اس کا ہونا تھا اور اسے طارق کا تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکی اور آج۔۔۔ یہ کچا رشتہ مضبوط اور اٹوٹ ساتھ میں بدل ہی گیا۔

”حور العین بیٹا۔۔۔! رات بہت ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے اب تمہیں بھی آرام کرنا چاہیے۔ ملازمین گھر میں سامان رکھ رہے ہیں۔ میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ دیتی ہوں۔“
بالآخر شائستہ پھپھو نے کہا تو حور العین دھیرے سے مسکادی۔ پھر وہ اسے اپنی ہمراہی ہی میں طارق کے کمرے تک لے گئیں۔

”طارق کا کمرہ اوپر کی منزل میں ہے۔“ انہوں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بتایا۔
حور العین اچھی طرح جانتی تھی کہ طارق کا کمرہ کہاں ہے۔ ان سیڑھیوں پہ وہ ہزار بار اترتی چڑھتی تھی۔

میٹرک میں جب میتھس پڑھانے کے لیے کوئی ٹیوٹر نہیں ملا تھا تو طارق نے اسے تین ماہ تک میتھس کی تیاری کرائی تھی اور اس نے میٹرک میں طارق کی ہی وجہ سے شاندار مارکس لیے تھے۔ کالج میں جانے کے بعد وہ تین ماہ جو طارق کے ساتھ گزرے تھے اس کے لیے ایک خوش گوار پسینا تھے۔
وہ دن رات ان ہی لمحوں کے سحر میں گم رہتی۔ کچی عمر کے یہ لمحے کتنے خوب صورت تھے۔

”تمہیں الجبرا سمجھا سمجھا کر میرا دماغ خالی ہو گیا ہے اور تم۔۔۔ تم اتنی کوڑھ مغز ہو کہ بارہا سمجھانے کے باوجود تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“
شرمندگی سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور چہرے پہ سرخی پھلک آئی۔
”اب رونے مت بیٹھ جانا۔ میں بھی کوئی آج کل فارغ نہیں ہوں میرے بھی اے لیول کے ایگزامز سر پر ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ اتنے مصروف ہیں تو نہ آیا کریں۔ میں نے کون سا پڑھ کر نوکری کرنی ہے۔ ہانڈی چولہا ہی کرنا ہے نا۔۔۔ وہ تو میں بغیر پڑھے بھی کر سکتی ہوں۔ مگر اس کا اثر آپ کی ہی زندگی پہ پڑے گا۔ میرا تو کچھ نہیں جاتا۔“

اتنی بڑی بات اس نے کتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔ طارق دنگ رہ گیا۔ وہ لڑکا ہو کر اس کی جرأت نہیں کر سکا۔ جبکہ اس نے لڑکی ہو کر۔۔۔۔۔

”تمہارے نہ پڑھنے سے میری زندگی پہ بھلا کیا اثر پڑنے لگا؟“
وہ کہنا چاہتا تھا لیکن ایک دم چپ ہو گیا۔ وہ اس کی سوچ سے کہیں زیادہ بے وقوفی کی حد تک بولند تھی۔

”تمہیں ایسی بات کہتے ہوئے ڈر نہیں لگا؟“

”ڈر کس بات کا۔۔۔ ایک بات ہے سو ہے۔“ اس کی خود اعتمادی عروج پہ تھی۔ ”جس طرح میں
بچپن سے اس بات سے واقف ہوں۔ اس طرح تم بھی باخبر ہو۔“

”اور اگر میں کہوں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تب۔۔۔؟“
اس کے دل کو کچھ یک دم ہوا۔ اس نے چونک کر طارق کی طرف دیکھا۔ جہاں سنجیدگی نمایاں تھی۔
وہ الجھ گئی۔ وہ اکثر طارق کے ایسے رویے پہ الجھ جاتی تھی۔
اس کے بعد عادل ماموں کی شادی ہوئی تھی اس کی سب لڑکیوں سے منفرد ہوا کرتی تھی
ایمان پھر بھی وہ اسے نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ حالانکہ اپنے چاچو کی شادی میں پیش پیش تھا اور کیوں نہ ہوتا
سب سے بڑا بھتیجا بھی تو وہی تھا۔

”سنو۔۔۔ آج تو تم بلیک سوٹ میں قیامت ڈھا رہی ہو۔ کہیں طارق، عادل ماموں کے ہمراہ
نی دیولہا بننے پہ بضد نہ ہو جائے۔ اس کا سامنا زیادہ نہ کرنا۔ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“ اس کی کزنز چیخڑ
رہی تھیں۔

”ہونہ۔۔۔! موصوف کو فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔“ اس نے جلتے کڑھتے دل میں سوچا۔
شادی کی تمام تقریب گزر گئیں۔ سٹائش تو درکنار اس نے سرسری نظر بھی نہ ڈالی۔ وہ عزت کے پاس سے
اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی اور دھک سے رہ گئی۔ وہ کمرے میں موجود تھا اور الماری میں گھسا کھڑ پڑ کر
رہا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا کمرے سے نکل جائے۔ پھر یک دم ہی ازلی ڈھٹائی کے ساتھ سامنے آ گئی۔
”میری نانوکا گھر ہے۔۔۔ میں جہاں مرضی پھروں، جہاں مرضی بیٹھوں۔“ طارق نے دروازے
کی آہٹ پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس نے الماری بند کی اور تیزی سے کمرے
سے نکلنا چاہا، تب ہی وہ سامنے آ گئی۔

”پوری شادی میں سب نے مجھے آپ کے حوالے سے چھیڑا لیکن آپ نے مجھے نگاہ اٹھا کر بھی
نہیں دیکھا۔ کیا آپ کو یہ رشتہ ناپسند ہے؟ اگر ایسا ہے تو کہہ نہیں سکتے۔“ وہ بگڑ کر بولی۔ اس سے پہلے کہ
طارق کچھ کہتا، اچانک دروازہ کھول کر دلشاد بیگم اندر آ گئیں۔ انہوں نے تیکھی نگاہوں سے طارق اور حور
العین کی جانب دیکھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو طارق؟“
طارق کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ کہیں اس کی ماں نے تو یہ الفاظ نہیں سن لیے تھے۔
”میں تمہیں سارے گھر میں ڈھونڈ رہی تھی۔“

”میں۔۔۔ چاچو کا کچھ سامان لینے آیا تھا۔“ وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ دلشاد بیگم نے چھٹی
ہوئی نگاہوں سے حور کی جانب دیکھا پھر وہ بھی طارق کے پیچھے چل دیں۔
”لگتا ہے مامی کے دماغ میں کوئی گڑبڑ ہے۔ ہر وقت اپنے بیٹے کا چہرہ دیتی رہتی ہیں۔“ حور گہرا
سانس کھینچتے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی۔

”آؤ بیٹی! اندر آ جاؤ۔“ شائستہ نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو حور العین یک دم حال
میں واپس آ گئی۔

ان کے کہنے پر اس نے قدم طارق کے کمرے کی چوکھٹ پر رکھا۔
 ”ارے یہ کیا ساری ہی لائٹس آف ہیں۔“ شائستہ نے یہ کہتے ہوئے لائٹ جلادی۔
 ”طارق تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔“ شائستہ نے اسے ہڈیہ بٹھا دیا پھر قریب ہی بیٹھ گئیں۔
 ”تمہیں عجیب تو لگ رہا ہوگا حور؟“ حور نے گھٹی پلٹیں اٹھا کر تعجب سے شائستہ کو دیکھا۔
 ”خالہ! میں ممائی کے خشک رویے سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ حور نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

شائستہ دنگ رہ گئیں۔ ”تو کیا تم ان سب حالات کا مقابلہ کر لوگی؟“
 ”ظاہر ہے، اب تو کرنا ہی پڑے گا۔“ لاپرواہی اور سرمستی حور کے انگ انگ میں نمایاں تھی۔
 ”میں تو بہت کم پاکستان آئی ہوں اور جب بھی آئی ہوں۔ اماں جی کے ہاں ہی ٹھہرتی ہوں۔
 اماں جی، اور بابا جان کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ میں بھائی ابراہیم کے ہاں رکی ہوں ورنہ تمہارے خالو تو کہہ رہے تھے کہ ہومل میں قیام کر لیں گے۔ مگر اچھا نہیں لگتا۔ بھائیوں کے گھر ہونے کے باوجود ہمیں ہوملوں میں قیام کریں۔ مجھے چودہ پندرہ دن ہو گئے ہیں آئے ہوئے مجھے تو بھادج اور بھتیجیوں کے رویے ہی سمجھ میں نہیں آ رہے۔ مانا کہ دل آویز کے ساتھ بہت برا ہوا ہے مگر۔۔۔“
 وہ ایک دم چپ ہو گئیں۔ حور ٹکڑا کر انہیں دیکھنے لگی۔ شائستہ نے حور کی طرف دیکھا اور اپنائیت سے بولیں۔

”تمہارا سارا بچپن اماں جی کے زیر سایہ گزرا ہے۔ بہت محبت تھی اماں جی کو تم سے۔ آپا کے فوت ہوتے ہی اماں جی نے تمہیں اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تم اپنے ماموں کے گھروں کے ماحول سے بخوبی واقف ہو، اور یہ تمہارے لیے اچھا ہی ہے۔ مگر میں پھر بھی یہی کہوں گی۔ دل آویز کے نہ بسنے کا اثر تمہاری زندگی پر بہت زیادہ پڑے گا۔ تمہیں صبر اور برداشت سے کام لینا ہوگا۔“
 ”مگر۔۔۔ خالہ۔۔۔ دل آویز کی شادی کو تو تین سال ہوئے ہیں۔ ماما کی کارویہ تو شروع سے ہی ایسا ہے۔ وہ تو طارق کو نانوا کی طرف کبھی نہیں بھیجتی تھیں۔ نانو کے فوت ہونے کے بعد جب میں اپنے ابو کے پاس چلی گئی تھی تب طارق ادھر جانے لگے تھے۔“

”کیا حالات اتنے سنگین تھے۔ پھر بھی ابراہیم بھائی نے اماں جی کے وعدے کو نبھایا۔“ شائستہ لمحہ بھر کو سوچ میں پڑ گئیں۔ اٹھتے ہوئے بولیں۔

”رات کافی ہو چکی ہے۔ تم تھک گئی ہو گی تھوڑی سی ٹیک لگالو۔ میں طارق کو دیکھتی ہوں کہاں ہے۔ وہ تو کمرے میں آنے کا کہہ کر اٹھا تھا۔ کہاں چلا گیا۔“ کہتے ہوئے شائستہ کمرے سے نکل گئیں۔
 طارق کے ذکر پر حور کی دھڑکنیں منتشر ہو گئیں۔ طارق اس کا ہو چکا تھا اور کچھ ہی پل میں وہ اس کے نزدیک ہوگا۔ اتنا نزدیک۔۔۔ کہ اس کے سارے شکوے گلے مٹ جائیں گے۔

وہ جو بچپن سے اس سے بے اعتنائی برتا چلا آ رہا تھا۔ سب کچھ جاننے کے باوجود انجان بناتا تھا۔ اس کی بے تکلفی کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ کبھی اس کے فون کا جواب نہیں دیا۔ آج وہ سارے حساب بے باق ہو جائیں گے۔ اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور بیڈ کے سرہانے سے نکا دیا۔



”نانو! میرے پیپر سر پر ہیں اور طارق کو دیکھیں تین دن سے چھٹی کر رہے ہیں جبکہ آپ کہتی ہیں طارق بہت ذمہ دار ہے۔ خاک ذمہ داری ہے یہ۔ نہیں پڑھانا تو بندہ انکار کر دے۔ یوں بیچ میں کیوں انکار لکھا ہے جب دل کرتا ہے چھٹی کر لیتے ہیں۔“

”خوار! تم سے ہزار بار کہا ہے۔ طارق تم سے بڑا ہے۔ اسے بھائی کہا کرو۔“

”نانو۔۔۔ دنیا میں جتنے بھی مرد ہیں، وہ سب میرے بھائی ہیں سوائے ایک طارق کے۔“

”تمہیں شرم نہیں آتی مجھ سے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔“

”نانو، پیاری نانو، فقط آپ سے ہی شرم نہیں آتی۔ آپ ہی تو میری دوست ہیں، سہیلی ہیں، ماں ہیں۔“ وہ نانو سے لپٹ گئی۔

”میں تمہاری کچھ بھی نہیں ہوں۔ صرف نانی ہوں۔“ نانو نے پیار سے جھڑکا۔ تو اُس نے منہ

بنالیا۔

”لڑکیوں کا اتنا منہ پھٹ ہونا اچھا نہیں ہوتا۔“ تمہارے باپ نے تو دوسری شادی کر کے جان

پھڑائی۔ اب تو میری ہی تربیت یہ حرف آئے گا۔“

”یہ میرے باپ کا حق تھا۔ اگر انہوں نے شادی کر لی ہے تو آپ یا کوئی اور مجھے بار بار کیوں بتاتا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ میں چھوٹی سی تھی تو میری ماں مر گئی تھی۔ آپ نے مجھے گودے لیا۔ پاپا کو شادی تو کرنی ہی تھی نا اور انہوں نے اچھا ہی کیا کہ کم از کم اس طرح میرے تین چار بہن بھائی تو ہو گئے۔ ورنہ میں دنیا میں تنہا رہ جاتی۔ ادھ مائی گاڈ۔۔۔ اکلوتا ہونا کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔“

”اب تم نے تقریر ختم کر لی ہو تو میں بھی کچھ بولوں؟“

”میرا خیال ہے آپ نہ ہی بولیں تو بہتر ہے کیونکہ جو آپ نے کہنا ہے وہ میں کہہ دیتی ہوں۔ میری سوتیلی ماں بہت تیز عورت ہے۔ وہ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں سمجھتی۔ تاریخ گواہ ہے۔ کسی بھی سوتیلی ماں نے سوتیلی اولاد کو اچھا نہیں سمجھا۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں میری ماں سچ ہے۔ آپس کی بات ہے۔ میں کون سا اسے اچھا سمجھتی ہوں۔“ وہ کھی کھی کرنے لگی۔ نانو نے سر پکڑ لیا۔

”میرے چار بہن بھائی اعلا اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں نانا کے اخراجات پہ پل رہی ہوں۔ میرا باپ مجھے خرچہ نہیں بھیجتا۔ اب اگر آپ مجھے نہ لے کر آئیں تو میں پاپا کے گھر میں ہی پرورش پاتی نا۔ تب تو پاپا کو ہی سارے خرچے کرنا پڑتے۔ اب اس میں بابا کا تو کوئی قصور نہیں۔ وہ مجھ سے ملنے آ جاتے ہیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ کم از کم مجھے یہ تو احساس ہے کہ میں بالکل لاوارث نہیں ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھیگ گئی تھی اور اس کی ذہین خوب صورت آنکھیں پانی سے چمکنے لگی تھیں۔

”آپ بھی نایونہی مجھے باتوں میں لگالیتی ہیں۔ طارق کو آج پھر چھٹی کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

اور آج میں اسے چھٹی ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔“ اس نے فون اٹھاتے ہوئے کہا تھا فون دلشاد بیگم نے اٹھایا تھا۔ لہذا اسلام کے بعد اس نے طارق کے بارے میں پوچھا۔

دلشاد بیگم کا خشک رویہ اس نے محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ یہاں دلشاد بیگم کو تو پتا ہی نہیں تھا۔ ان کے توپکنے لگ گئے۔

”کب سے آرہا ہے تمہیں پڑھانے؟“

”یہی مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے۔ بس چند دن کی اور بات ہے۔ مگر طارق نے اچانک چھٹیاں شروع کر دیں۔ نانو کہہ رہی فون کرنے کے پوچھوں کہیں طارق کی طبیعت تو خراب نہیں ہے۔“

دلشاد بیگم کے ہونٹوں پہ طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

”تمہاری نانو کو فکر ہو رہی ہے یا تمہیں؟“

”بھئی نانو کو فکر ہوگی اپنے پوتے کی، مجھے تو اپنے پیپرز کی فکر ہے۔ طارق نے کہا تھا وہ مجھے گیس پیپر بھی لا کر دے گا۔ کیا اسے نہیں پتا کہ مجھے ڈیٹ شیٹ مل چکی ہے؟“

”کیوں۔۔۔؟ طارق کیا کسی اسکول میں سچر لگا ہوا ہے جو اسے اتنی معلومات ہوں گی؟ دلشین بھی میٹرک کے امتحان دے رہی ہے۔ اس کی تو اسے فکر نہیں اور تمہیں وہ پڑھانے پہنچ جاتا ہے۔“

حور نے یک دم لب بھینچ لیے۔ مگر شرارت اس کی آنکھوں سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ دو منٹ کے بعد حور نے ریسور کریدل پہ ڈال دیا اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

نانو حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

”آج طارق کی خیر نہیں ہے۔ ممانی جان طارق کا بھر کس نکال دیں گی۔“

نانو نے سر پیٹ لیا۔

”تم سے کہا کس نے تھا وہاں فون کرو۔“

”لو بھلا اور سنو۔۔۔ آپ کے سامنے ہی تو فون کیا تھا۔ تب تو خیال نہیں آیا آپ کو۔ اب ساری بات مجھ پہ ڈال رہی ہیں۔ حالانکہ اگر یہ قصور ہے، تو قصور وار آپ بھی ہیں۔“ اس نے مزے سے چوڑکی مارتے ہوئے کہا تو نانو نے چشمہ اتار کر ماتھا بے بسی سے تھیلی پہ نکال لیا۔

دو دن کے بعد طارق گھر آیا تو بہت غصے میں تھا۔ وہ سلام کر کے دادی کے پاس بیٹھ گیا۔

”ارے بیٹا! کیا بات تھی کئی روز سے آنہیں رہا تھا۔ طبیعت تو ٹھیک تھی تمہاری۔“

”دادو! آپ کو معلوم ہے، ماما مجھے کتنا چاہتی ہیں۔“ غصے اور ضبط کے باعث طارق کا چہرہ سرخ

ہو رہا تھا۔

”وہ مجھے اتنا چاہتی ہیں کہ ان کا بس نہیں چلتا کہ میں سانس بھی لوں تو ان کی مرضی سے۔ میرا دن بھر کا شیڈول ماما کے سامنے ہے۔ میں اپنے دوستوں میں بھی جاتا ہوں تو ماما کو بتا کر۔ میں یہاں حور کو پڑھانے صرف آپ کے اصرار پر آیا کرتا تھا اور یہ سب کچھ ماما سے پوشیدہ تھا اور اب جب انہیں پتا چلا ہے وہ مجھ پہ سخت برہم ہیں۔“

حور نے کچن کی جالی سے دادی پوتے کی باتیں سنیں تو پھدک کر کچن سے باہر آئی۔

”بھئی پلے پلے۔ البتہ الزام ہمارے سر۔ اگر آپ کی ماما یہ سب پسند نہیں کرتی تھیں تو آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔“

”سن رہی ہیں دادو آپ۔ ذرا بھی عقل نہیں ہے اس لڑکی میں۔“

”خبردار مجھے جو کم عقل لگتا تو۔۔۔ جب تک آپ میرے استاد تھے۔ میں نے سن لیا۔ اب معاملہ برابری کا ہے۔ ٹیوٹرز کی دنیا میں کمی نہیں تھی۔ مگر نانو کا دل نہیں ٹھہرتا تھا۔ کہتی تھیں زمانہ خراب ہے۔ گھر کا بچہ ہے۔ چند دن کی ہی تو بات ہے پڑھا دے گا۔ مگر نانو سمجھتی نہیں نا، زمانے سے زیادہ تو اپنے خراب ہوتے ہیں۔“

وہ یہ کہہ کر دھپ دھپ کرتی واپس چلی گئی۔

طارق نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔

”حور بے وقوف ہے بیٹا!“ ان کے چہرے پر واضح شرمندگی تھی۔ ”یہ سب کو اپنے جیسا سمجھتی ہے۔ من کا ستھرا۔۔۔ مگر نہیں جانتی کہ سب ایک سے نہیں ہوتے۔ تو اس سے اپنا دل خراب نہ کرنا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ٹھہراؤ آجائے گا اس میں۔“

یہ الفاظ اس نے جاتے ہوئے سنے تھے اور ایک سکون کی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی تھی۔



رات کی سیاہی دن کے اجالے میں سمٹنے والی تھی۔ سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں افق سے پھوٹ رہ تھیں۔ کہہ نے ہر چیز کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ درتچے کے بائیں جانب ماربل کے ستونوں سے پشت لگائے سردی کی پروا کیے بغیر آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ پورا گھر خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔ اس کی زندگی کا سکون برباد کر کے۔ رات وہ اپنے باپ کے ارمانوں کی بھیمنٹ چڑھا تھا۔ اسی نے باپ کی خواہش پوری کی تو ماں ناراض ہو گئی۔ ماں کی خواہش پوری کرتا تو باپ عاق کر دیتا۔ آخر۔۔۔ آخر۔۔۔ اس کے معاملے میں اتنی شدت پسندی کیوں تھی؟

ولید۔۔۔ اس سے دو سال چھوٹا ہی تو ہے لیکن اس کی بغاوت اور سرکشی۔۔۔ اس کے بعد معیز۔۔۔ پھر دلشین۔۔۔ ان دونوں میں بھی ہٹ دھرمی کچھ کم نہیں تھی۔ اپنی من مانی کرنا۔۔۔ شروع سے ہی ان کا تیرہ تھا۔

ایک۔۔۔ وہی۔۔۔ وہی ایسا کیوں رہ گیا تھا۔

حساس۔۔۔ ذمہ دار۔۔۔ ذرا ذرا سی بات کی پروا کرنے والا۔ کبھی من مانی نہیں کی۔ دوسروں کو یہاں تک کہ ملازمین تک سے بھی بدتمیزی نہیں کی۔ کبھی جان بوجھ کر کسی کا دل نہ دکھایا۔ پھر بھی سکون اس کے حوصے میں نہیں آیا۔

تب ہی اس کے کاںدھے پہ کسی نے ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

سامنے ولید کھڑا اسے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”تم سوئے نہیں ابھی تک؟“ طارق نے گھٹنے سیدھے کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”تم رات بھر یہیں رہے ہو؟“ ولید اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ طارق نے اپنے دونوں بازو سینے پہ لپیٹ لیے اور سر جھکا لیا۔

”میں رات کو بابا کے کمرے میں تھا۔“ طارق کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”کیوں۔۔۔ بابا کی طبیعت خراب تھی کیا۔۔۔؟“ ولید کے لہجے میں کاٹ تھی۔

”ماما اور بابا کے درمیان شدید ناراضی چل رہی ہے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”یہ کون سی نئی بات ہے۔ ان لوگوں کی تو عادت ہے۔ پہلے غلط فیصلے کرتے ہیں پھر آپس میں لڑتے ہیں۔“

”وہ ہمارے ماں باپ ہیں ولید!“

”جانتا ہوں۔۔۔ کوئی نئی بات بتاؤ۔“

”پلیز لیوی الون۔۔۔“ طارق اس وقت بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”اور وہ جو رات بھر تمہارا انتظار کرتی رہی ہوگی، اس کے بارے میں سوچا ہے تم نے؟ اس کا کیا تصور ہے؟“

”میں ذمہ دار نہیں ہوں اس کا۔“

”بہت خوب۔ وہ نکاح میں تو تمہارے ہی آئی ہے نا۔“

”ولید۔۔۔!“ طارق کا لہجہ سخت ہوا۔

”آج میں کہہ رہا ہوں کل زمانہ کہے گا کس کس کا منہ بند کرو گے؟“

”یہ باتیں تم مجھ سے نہیں اپنے ماں باپ سے کہو۔“ طارق نے رکھائی سے کہا۔

”کہہ سکتا تھا۔ بہت پہلے کہہ سکتا تھا لیکن ہر بار تم۔۔۔ طارق تم سامنے آ جاتے تھے۔ اب بھگت رہے ہوتا۔ فرماں برداریوں کا صلہ۔“ ولید نے اس پہ گہری چوٹ کی۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے۔ نقصان میرا ہی ہے نا۔ تم جا کر اپنا کام کرو اور آئندہ میرے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ معاملہ صرف تمہارے یا میرے نہیں ہیں ہم سب کے معاملات ہیں۔ سب ہی کے والدین پالتے پوتے ہیں مگر جوان ہو جانے پہ اس کا معاوضہ نہیں لیتے۔ پہلے ان لوگوں نے دل آویز کی زندگی برباد کی۔ پھر تمہاری اور حور کی۔“

”اوہ تو تمہیں یہ فکر ہو رہی ہے کہ اب تمہارا نمبر آنے والا ہے۔“ طارق کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس سے پہلے ولید کوئی جواب دیتا کہ دائیں جانب سے کھڑ پٹر کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ ملازمین کی گھر میں چھل پہل شروع ہو چکی تھی۔

”کیوں ملازموں کو بھی تماشا دکھا رہے ہو۔ اپنے کمرے میں نہیں جاتے تو میرے ہی کمرے میں آ جاؤ۔“

طارق چپ چاپ اٹھ کر ولید کے پیچھے چل دیا۔



”اب تمہیں اپنے کمرے میں جانا ہے یا میرے کمرے میں؟“ ولید میٹرھیوں کے قریب رک گیا۔ کیونکہ طارق کا کمرہ اوپر تھا اور ولید کا نیچے۔ طارق چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حور بیڈ پہ بے خبر رہ رہی تھی۔ اس کا سنگھار بدستور تھا۔ ظاہر ہے رات بھر اس نے انتظار میں گزاری ہوگی۔ اسے حور سے نفرت محسوس ہونے لگی۔

وہ اتنی نا سمجھ جلد باز اور منہ پھٹ لڑکی تھی کہ وہ اسے اپنا کوئی بھی مسئلہ بتانے کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اس پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کی ماں شروع سے ہی اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ ماں ہی کیا بہنیں بھی اسے اس قابل نہیں سمجھتی تھیں کہ وہ اس گھر میں بہو بن کر آئے۔

ان کے نزدیک وہ نہایت طرار اور چلتی تھی، سوتیلی ماں کو اس نے ناکوں نے چبوار کھے تھے۔ وہ سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ بچپن میں ہی ماں مر گئی تھی۔ اسی لیے دوسرے لوگوں کے بے جالا ڈیپیار نے اسے خود سر اور ضدی بنا دیا تھا۔ اتنا خود سر اور نڈر کہ وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

اور وہ خود بھی اس کی ان ساری خوبیوں سے واقف تھا۔ اس کی ماں چاہتی تھیں کہ وہ اپنی بھتیجی اصباح کو لے کر آئیں لیکن اسے اصباح سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بچپن سے ہی اس کا رجحان دھیل کی طرف زیادہ تھا۔ ظاہر ہے سب سے بڑا پوتا تھا۔ دادا، دادی کی توجہ اور محبتوں کا مرکز بنا رہا۔ البتہ دل آویز ماں کے ہمراہ جایا کرتی تھی۔ پھر اس نے بھی آنا جانا کم کر دیا۔ ان ہی کی دیکھا دیکھی باتی بہن بھائیوں کا رجحان بھی نکھیل کی طرف نہ ہوسکا۔ عید تہوار پہ بھی دلشاد بیگم کو اسے بھائیوں کے گھر اکیلے جانا پڑتا۔

اس چیز پہ بھی گھر میں خاصی لے دے ہوا کرتی تھی دلشاد بیگم ابراہیم صاحب کو ہی اس کے لیے مورد الزام ٹھہراتیں کہ بچے ان کے منع کرنے کی وجہ سے نکھیل نہیں جاتے۔ مگر پتا چل گیا وقت کے ساتھ ساتھ انہیں اس کی وجہ ان کے بھائیوں کے گھر کا ماحول ہے۔

ابراہیم صاحب نے بچوں کی بہت آزاد ماحول میں پرورش کی تھی۔ جبکہ ان کے بھائیوں کے گھروں کا ماحول ابھی بھی روایتی تھا۔ پھر دلشاد بیگم نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ طارق یہ تک نہیں جانتا تھا کہ اس کے تین ماموں کی کتنی اولادیں ہیں اور اصباح کون سے ماموں کی صاحبزادی ہیں۔ ہاں دلشاد بیگم اصباح کے قصیدے پڑھتی رہتیں۔ اکثر جب یہ موضوع زیر بحث ہوتا تو ابراہیم صاحب ہنس پڑتے۔

”تم اصباح کو ولید سے بیاہ کر لے آؤ۔ میں قطعاً اعتراض نہیں کروں گا لیکن طارق کی شادی حور سے ہی ہوگی کیونکہ یہ اماں جی کی خواہش تھی۔“

اس بات پہ دلشاد بیگم تنہا ہو جاتیں۔

”ولید اس قابل نہیں ہے، جو میری معصوم اور بے زبان بھتیجی کا جیون ساتھی بنے۔ اگر تم نے اپنی ماں کا وعدہ نبھانا ہے تو تم ولید سے اپنا ارمان پورا کر لو تمہارے لیے تو دونوں بیٹے برابر ہیں۔“

”میں یہ بھی کرویتا۔ اگر ماں جی طارق کا نام نہ لیتیں۔“ ابراہیم صاحب بے بس ہو جاتے۔
 ”اولاد میری، اور فیصلے تمہاری ماں کریں گی؟ طارق میرا بیٹا ہے۔ میں جو چاہوں گی وہی ہوگا۔ وہ
 پڑیل میرے گھر میں ہرگز نہیں آئے گی۔ میرا ہیرے جیسا بیٹا اس چلتر لڑکی کے لیے ہے۔“
 ”وہ بچی تمہاری بیٹیوں جیسی ہے دلشاد!“

”میری بیٹیوں جیسی مت کہنا اسے۔ سارے خاندان میں اپنے رشتے کی بات اپنے منہ سے پھیلا
 رکھی ہے اس نے۔ اتنی سی تو شرم نہیں اس میں۔ کر رہے ہیں میری بیٹیوں سے مقابلہ۔“
 ”مانتا ہوں وہ لڑکی ذرا بولڈ ہے۔“

”بولڈ نہیں۔ بے حیا، بے غیرت۔۔۔!“ دلشاد نے جی بھر کر بھڑاس نکالی۔
 ”یہاں آ کر اپنی عادتیں بدل لے گی۔ جیسا تم چاہو گی ویسی ہی ہو جائے گی۔“
 ”میں نے یہاں کوئی اسکول نہیں کھولا ہوا کہ اس کی تربیت کروں گی۔ کہاں گئے تمہاری ماں کے
 وہ آدرش، ادب، تہذیب، طور طریقے، سلیقے۔ میں جب بیاہ کر آئی تھی۔ تو کیا کہتی تھیں وہ۔ مجھے اٹھنے
 بیٹھنے کی بھی تمیز نہیں۔ میں ان کے سامنے بولتے ہوئے ڈرتی تھی۔ کہیں وہ کوئی لفظ نہ پڑ لیں۔ کبھی
 میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں کیا تمہاری ماں نے۔ کہتی تھیں میرے ہاتھ میں لذت نہیں۔ بڑے بادشاہی
 کھانے بنتے تھے تمہارے گھر میں، میں تو جیسے کسی گرے پڑے گھر سے آئی تھی۔ کہاں دیکھی تھی میں نے
 ایسی آن بان۔ مگر پھر بھی چپ رہتی تھی۔ تین چار سال تک بچے نہیں ہوئے تو اس کے لیے مجھے دوش دیا
 گیا کہ میں تم سے عمر میں بڑی ہوں۔ اس لیے مجھے اولاد نہیں ہوگی۔ یاد ہے تمہیں وہ وقت کہ تمہاری
 دوسری شادی کا پکا ارادہ کر لیا تھا تمہارے گھر والوں نے اور مجھے اٹھا کر میرے باپ کے گھر پھینک دیا
 تھا۔

”یہ تم غلط تہمت لگاتی ہو۔ میری ماں نے کبھی تمہیں تمہارے میکے نہیں بھجوا یا۔ تم خود ہی یہاں رہنے
 سے ہچکچاتی تھیں۔ آئے دن تمہارے بھائی تمہیں لینے آ جاتے تھے۔ اماں جی نے تمہارے میکے جانے پر
 پابندی بھی نہیں لگائی۔“

”کیوں لگاتیں وہ پابندی؟ وہ تو چاہتی ہی یہی تھیں کہ میں اپنے میکے میں پڑی رہوں۔ اور ان
 کے چہیتے بیٹے سے دور ہوں۔ کب آنے دیتی تھیں وہ کمرے میں۔ نندوں کا الگ پہرہ رہتا تھا مجھ پر اور
 پندرت کا اس کی بیٹی کو اجنبی بہو بناؤں گی میں؟ کیا کیا بیچ نہیں ہوئے اس نے میرے لیے۔ کیسے بائیں
 بناتی تھی مجھ پہ۔۔۔ آخر کیا کی بھی مجھ میں؟“

”یہ سب تمہاری غلط فہمیاں ہیں دلشاد۔۔۔! میں ساری عمر بھی تمہیں یقین دلاتا رہوں تب بھی تم
 میری بات پہ یقین نہیں کرو گی۔“

”ٹھیک ہے میں یقین نہیں کروں لیکن تم بھی مجھے جھٹلا نہیں سکتے۔ ساس کے ساتھ میرا جو وقت
 گزرا ہے بڑا ٹھن وقت تھا۔ ٹھیک ٹھاک نظیر انداز ہو کر رہی ہوں میں۔“

”اس میں تمہاری اپنی بھی کمزوریاں تھیں دلشاد!“ ابراہیم صاحب کہتے کہتے رک گئے۔
 ”ہم اپنے ماضی کو بھولیں گے تو بچوں کے مستقبل کے صحیح فیصلے کر سکیں گے۔“ وہ عاجز ہوئے۔

”یہ بات تمہارے ماں باپ نے تو نہیں سوچی۔ اور خاص طور پر اماں جی نے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنی چیمٹی نواسی کو طارق سے دینا چاہتی ہیں تو اس کی تربیت اچھی کیوں نہیں کی۔ کیوں اسے بے نیاز پڑ دیا۔ میری زندگی کو اجیرن کرنے کے لیے۔ اتنا پیر تھا تمہاری ماں کو مجھ سے کہ جاتے جاتے بھی اس کا مذاق مسلط کر گئی مجھ پر۔۔۔ مگر وہ مرجھ چکی ہے۔۔۔ اور میں زندہ ہوں۔۔۔ دو گا وہی جو میں رہا ہوں لی۔ دل آویز اور دلنشین نے کہہ دیا ہے کہ اگر بابا اپنی ضد پہ قائم رہے تو وہ طارق کی بارات میں نہ نہیں جائیں گی۔“

”آہ۔۔۔!“ طارق کو گہرا جھکا لگا اور اس نے سر صوفے کی پشت سے لگا لیا۔
 ”میں پھنس گیا ہوں اور اس کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ حور میری ماں بہنوں کی عزت کر کے ان کے دل جیتنے کی کوشش کرے لیکن حور۔۔۔ کیا وہ ایسا کر پائے گی؟“
 طارق نے بے یقینی سے حور کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اس کے قریب چلا

”ایہ۔۔۔“
 شاکلنگ پنک کا مدانی لہنگے میں ہم رنگ جیولری اور میک اپ میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ اتنی

”ایہ۔۔۔“ طارق کے دل کو کچھ ہونے لگا۔
 اس نے سمجھتے ہوئے ہاتھ حور کی طرف بڑھایا اور آہستہ سے اس کا آویزہ درست کیا جو مڑ کر اس کی
 ان کو کھل کر رہا تھا۔ تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اس پہ جھکا کھڑا تھا۔
 حور کو یقین ہی نہیں آیا۔ وہ سمجھی کہ شاید خواب ہے۔ وہ طارق کی طرف بے یقینی سے دیکھتی رہی۔
 وہ اس خواب سے جا گنا نہیں چاہتی تھی۔ تب ہی طارق کو بولنا پڑا۔

”صبح ہو گئی ہے۔ تم فرلش ہو جاؤ۔ میں نے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔“
 طارق کی آواز سامعتوں سے ٹکرائی تو وہ یقین و بے یقینی کی حالت میں ذرا سا اٹھ بیٹھی۔

طارق سست روی سے قدم اٹھاتا سامنے صوفے پہ جا بیٹھا۔
 طارق دانستہ اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اچانک جو اس کی نگاہ اٹھی تو دوفرشوق سے اس کی

طرف دیکھ رہی تھی۔
 طارق کو اس کی دیوانگی کا بخوبی اندازہ تھا۔ اسے دل ہی دل میں ندامت سی ہوئی۔ لیکن وہ اپنی

حالت اس پہ واضح نہیں کرنا چاہتا تھا۔
 ”میرا خیال ہے اب تک تمہیں یقین آ جانا چاہیے کہ میں کمرے میں موجود ہوں۔“
 طارق نے اس کی بے یقینی کو نوٹ کر لیا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ رو بوٹ کی طرح شرمندہ ہو کر اٹھ

جائے گی لیکن وہ اپنے آویزے اتارتے ہوئے آہستگی سے بولی۔
 ”میری ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آنکھ لگی تھی۔ نیند کی وجہ سے اب بھی سر میں درد ہو رہا ہے۔“
 ”تو کیا ضرورت تھی اتنے کی؟“ طارق نے نظریں چرا کر کہا۔

حور نے بڑے تحیر سے طارق کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی پل اپنی جیولری اتارتے ہوئے ترش

لہجے میں بولی۔

”اگر کوئی مجھے آکر بتا دیتا کہ تمہاری بیٹی ہے تو میں تمہارا انتظار نہ کرتی اور سو جاتی۔“ اس کی کیٹل بات پہ طارق کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے بمشکل خود کو کنٹرول کیا۔

”تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟“ وہ اٹھ کر بستر کے قریب آ گیا۔

”سردیوں کی راتوں میں سنا بہت ہوتا ہے۔ اس لیے رات کے پچھلے پہر سب کچھ صاف سنائی دے رہا تھا۔“ طارق نے ایک گہرا سانس لیا۔

”اس کا مطلب ہے تم سب کچھ سن چکی ہو۔ تو تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس لیے اب مجھے تمہید باندھنے کی ضرورت تو ہے نہیں۔ تم خود بھی سمجھ دار ہو۔“

”میں۔۔۔ اور سمجھ دار!“ حور نے اچھنبھے سے طارق کی طرف دیکھا۔

”مجھ سے زیادہ تو تم سمجھ دار تھے۔ اگر معاملات اتنے ہی پیچیدہ تھے تو میری زندگی کیوں برباد کی؟“

”تمہاری زندگی۔۔۔ میں نے۔۔۔ یا میرے گھر کے کسی فرد نے برباد نہیں کی۔ یہ فیصلہ پچھو کے مرنے کے بعد دادو نے کیا تھا اور تم جی جان سے اس فیصلے پر رضامند بھی دکھائی دیتی تھیں۔“ طارق کا لہجہ خود بخود طنز بن ہو گیا۔

حور نے سکتی لگا ہوں سے طارق کی طرف دیکھا۔ تو کیا اس کی مرضی شامل نہیں تھی اس فیصلے میں؟

حور اپنی جیولری اتار چکی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو پنوں سے آزاد کیا۔ بھاری دوپٹہ بیڈ پہ پھینکا اور ہلکے پھلکے کپڑوں کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ گویا اس نے طارق کی بات کو اہمیت ہی نہ دی ہو۔

”یہاں میرے کپڑے نہیں ہیں۔ وارڈروب ساری خالی پڑی ہیں۔“

”تمہارا سامان نیچے اسٹور میں پڑا ہوا ہے۔“

”اور تمہارے گھر کے کپڑے یعنی میری بری کے کپڑے، وہ کہاں ہیں؟“ حور، طارق کے سامنے کھڑی تھی۔

”وہ بھی وہیں ہوں گے۔“ طارق اس کے وجود سے پھوٹی خوشبو کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تو میں یہاں کیوں ہوں؟ مجھے بھی اسٹور میں ہی ڈال دیتے۔“ اس نے تنک کر کہا۔

”نخرے تو تم اس طرح دکھا رہی ہو۔ جیسے میں لا کر دوں گا تمہیں سب چیزیں۔ پہلے سامان نہیں بھجوا سکتے تھے تم لوگ۔“ طارق نے جھنجھلاتے ہوئے اسے ڈپٹا۔

”میں جہیز کے کپڑے نہیں مانگ رہی۔ مجھے بری کا سوٹ چاہیے۔ کیونکہ اب میں تمہارے گھر میں آ چکی ہوں اور اب تمہارے ہی کپڑے پہنوں گی۔ میری بلا سے ساری عمر میرا جہیز اسٹور میں پڑا رہے۔“

اس کی ہٹ دھرمی پہ طارق کے پھر سے چوڑے طبقہ روشن ہو گئے۔

”حور! تعین۔۔۔! تم اس طرح اس گھر میں زندگی نہیں گزار سکتیں۔ تمہیں اپنا رویہ بدلنا ہو گا۔“

اپنے اندر صبر و برداشت پیدا کرنا ہوگی۔ ورنہ تم ایک بل بھی یہاں نہیں رہ سکو گی۔“
 ”میں کسی بھی طرح کا لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔ ”مجھے فی الحال اس سے نجات پانی ہے۔“

طارق نے ایک اچھتی سی نگاہ اس کے سر پر پڑائی اور کمرے سے نکل گیا۔
 یہ ظلم نہیں تو کیا تھا۔ اس کے کمرے میں کوئی ضروری چیزیں بھی رکھنے والا نہیں تھا۔ حالانکہ اس نے ہمیشہ ہی بہنوں سے محبت کی تھی۔ اور ان کا مان رکھا تھا۔ دل آویز کم از کم اتنا تو کر سکتی تھی۔ دو چار پڑے، تولیہ، یہ سب چیزیں، اب وہ خود لے کر جا رہا تھا۔ اسٹور میں بمشکل سوٹ کیس ڈھونڈ کر اس میں پڑے نکالے اور کمرے میں لے آیا۔ کمرے میں آیا تو محترمہ، واش روم میں جا چکی تھیں۔
 ”کمال ڈھٹائی ہے۔ اپنے کپڑے تو لے جاتی۔“ طارق نے سارے کپڑے بیڈ پر پٹخ دیے۔
 اسی تک گھر کا کوئی فرد نہیں جا گا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ اسٹور بھی اس کے کمرے کے نزدیک ہی تھا۔ اگر اسے اپنے سے یہ سب کچھ لانا پڑتا تو کتنی سبکی محسوس ہوتی۔

ابھی وہ اپنی سوچوں میں ہی الجھا ہوا تھا کہ وہ واش روم سے نکل آئی۔ طارق اس کا حلیہ دیکھ کر پہل پڑا۔ وہ اس کے قمیص شلوار میں ملبوس تھی۔ قمیص پیروں کو چھو رہی تھی اور شلوار یقیناً اس نے اڑس ملی تھی۔ آستینیں اس نے فولڈ کر لی تھیں۔ وہ ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بال جھٹکنے لگی۔
 پانی کی بوندیں طارق پہ آئیں تو وہ جھنجھلا گیا۔

تولیہ واش روم میں موجود تھا۔ جہاں سے کپڑے پہنے تھے تولیہ بھی لے لیا ہوتا۔“ وہ جھنجھلاتے ہوئے ذرا فاصلے پہ جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بدستور اپنے کام میں مصروف تھی۔

”میں نے یہ کپڑے لا دیے ہیں۔ خواخواہ مولا جٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا حلیہ درست لے اپنے باقی کپڑے خود لا کر وارڈ روب میں سیٹ کر لیتا۔ یہاں سب کچھ تمہیں خود کرنا پڑے گا۔
 لہی تمہاری خدمت نہیں کرے گا۔“

وہ سنی ان سنی کیے بال جھٹکتی رہی۔
 ”کپڑوں کے علاوہ اور بھی دیگر اشیاء، وہاں بکھری پڑی ہیں، جا کر سنبھال لیتا۔“
 وہ بال پشت پر ڈال کر بیڈ کی طرف مڑی اور کپڑے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے ایک سوٹ پسند کر کے اٹھا لیا۔

”یہ تو پریس بھی نہیں ہے۔۔۔ کیا میں اسے ایسے پہنوں گی؟“
 ”تو تمہیں یہاں کون دیکھ رہا ہے۔ اگر بغیر استری کے پہن لو گی کون سی قیامت آجائے گی۔“
 حور نے تکیے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”میں خود کواچھی لگتی ہوں۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ میں بغیر استری کے کپڑے نہیں پہنتی۔ یا تمہیں یہ پریس کر کے لا کر دو۔ یا مجھے استری لا دو۔ میں خود پریس کر لوں گی۔“

”واٹ نان سینس! تم اتنی کم عقل، ضدی اور بے وقوف ہو۔ تمہارے اندر ذرا سی بھی انا ہوتی تو تم یہ سوچتیں کہ جن لوگوں نے رات سے میرے ساتھ یہ سلوک روا رکھا ہے۔ میں بھلا ان سے کیا

مانگوں اور کیوں مانگوں؟ لیکن تمہیں تو جیسے پرواہی نہیں ہے۔ کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ بس خوشی ہے تو اس بات کی کہ تم اس گھر میں دلہن بن کر آگئی ہو۔ اتنی بچکانہ سوچ ہے تمہاری، بھلا کیا ساتھ دے سکو گی تم میرا۔۔۔“

حور خاموشی سے اس کے بگڑتے اکھڑتے انداز دیکھتی رہی۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو وہ سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”مانسڈاٹ۔ یہ سب مسائل تمہارے ہیں۔ میرے نہیں۔ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ یہ سب تمہیں سوچنا چاہیے مجھے نہیں۔ مجھے تو یہ سوچنا ہے کہ میری زندگی سے کیونکر کھلیا جا رہا ہے اور ایک بات اور مجھے اس گھر کی بہو بننے کا کوئی ارمان نہیں تھا۔ میں نے بھی نانو کا وعدہ نبھایا ہے۔“

”واہ۔۔۔!“ طارق نے تسخر سے کہا۔ ”کم از کم میں اس بات کی سچائی پہ اعتبار نہیں لاسکتا۔ تم نے تو کھلم کھلا انظہارِ عشق کیا ہے مجھ سے۔ بارہا۔ مجھ سے پوچھا ہے۔ میں تمہیں پسند ہوں یا نہیں۔“

”تو پھر بتا دیتے۔ کیوں نہیں پھولے تھے۔“ وہ گویا چلا پڑی۔ اور طارق لا جواب سا ہو گیا۔

”میں یہاں بھاگ کر نہیں آئی ہوں جو یہ سب کچھ ہوں گی۔ میں یہاں کسی سے نہیں دیوں گی چاہے وہ تم ہو یا تمہاری ماں۔ اپنی سب خوش فہمیاں دل سے نکال دینا۔“

طارق کو بخوبی اندازہ تھا کہ اس کے پاس سے ایسے ہی فرمان جاری ہو سکتے ہیں۔ نہ صرف فرمان بلکہ وہ عمل بھی کر کے دکھا سکتی تھی۔

”تم اس طرح خود اپنی زندگی کو جہنم بنا لو گی۔“ طارق نے اسے تنبیہ کی۔

حور اس کی طرف دیکھ کر طنز یہ مسکرائی اور کپڑے لے کر دوش روم میں جاتے ہوئے بولی۔

”یہ میری زندگی ہے تم اپنی فکر کرو۔“ اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا۔ طارق سر پکڑ کر بیٹھ چکا تھا۔



گھر کے سارے ملازم ایک ہی جگہ جتے ہوئے تھے۔ وہ جگہ کون سی تھی کسی کو پتا نہیں تھا۔ سوائے حور العین کے۔ دن کے بارہ بجے جب دلشاد بیگم سو کر انھیں تو گھر میں ہلکا ہلکا سا شور سنائی دے رہا تھا۔ انہوں نے ملازموں کو آواز دیں تو باری باری سب ملازم ان کے سامنے جمع ہو گئے۔

”یہ تم سب لوگ صبح صبح کیسا ہنگامہ کر رہے ہو۔ حالانکہ تمہیں پتا بھی ہے کہ ہم لوگ رات دیر سے سوئے تھے۔“

”جی بیگم صاحبہ۔۔۔ لیکن۔۔۔ ہم بھی کام ہی کر رہے تھے۔ دلہن بیگم نے کہا تھا کہ اسٹور سے ضروری سامان ان کے کمرے میں پہنچا دیں۔ رات تو جیسے جہیز آیا ویسے ہی ڈالتے رہے تھے لیکن اب ترتیب سے جمانے میں دقت تو لگتا ہے نا۔“

”جے۔۔۔ ہیز۔۔۔!“ دلشاد بیگم نے جمل کر دہرایا۔

”آخر ایسا بھی کیا جہیز تھا جو ساری رات سے اب تک سیٹ ہی نہیں ہوا اور تم سب لوگ فارغ تھے

ایک ہی کام میں جت گئے۔ جس کا جہیز ہے وہ خود سیٹ کر لے گی۔ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ مجھے ایک کپ کافی بنا کر دو۔“

خانساں کافی بنانے چلا گیا۔ چوکیدار گیٹ پہ چلا گیا اور چوکیدار کی بیوی زرینہ روزمرہ کی صفائی کرنے میں مصروف ہو گئی۔ دلشاد ڈرائنگ روم میں اخبار لے کر بیٹھ گئیں۔ ابھی خانساں کچن میں گیا ہی تھا کہ کچ کچ کا برتن گرنے کی زوردار آواز آئی۔ ”صبح ہی صبح کر دیا نقصان!“ دلشاد اخبار کی ہیڈ لائنز دیکھتے ہوئے ناگواری سے بولیں تو خانساں ہلکاتے ہوئے کچن سے باہر آ گیا۔

”بیگم صاحبہ۔۔۔ یہ میں نہیں۔۔۔ دلہن بیگم ہیں۔“

”دلہن۔۔۔ بیگم۔۔۔!“ دلشاد بیگم کو زبردست جھٹکا لگا۔

”جی بیگم صاحبہ۔۔۔ دلہن بیگم ناشتا بنا رہی ہیں۔ ان ہی سے ٹوٹا ہے یہ گلاس۔“ حور کی اتنی دخل اندازی پہ انہیں تو پتہ لگ گئے۔ وہ اخبار میز پر بیٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور تن تنہا کرتی باتیں میں جا پھنسیں۔ حور اطمینان سے بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ گئی اور کچھ جھکتے ہوئے سلام کیا۔ جس کا انہوں نے جواب نہیں دیا۔

”ممائی جان! آئیے نا۔۔۔ بیٹھیے۔۔۔ ناشتا کیجیے وہ دراصل طارق نے کہا تھا کہ مجھے اپنے مارے کام خود کرنا ہوں گے۔ یہاں کسی کے لیے کچھ کرنے کا رواج نہیں ہے اور جب انہوں نے کہا کہ میں اپنا ناشتا خود بنانا پڑے گا تو مجھے پہلے تو عجیب لگا۔ پھر میں نے سوچا یہ گھر میرے لیے کون سا اجنبی ہے۔ اپنا ہی گھر ہے، ماموں کا گھر اپنا ہی ہوا نا۔ پہلے بھی تو میں یہاں آئی تھی اور ہر چیز سے واقف بھی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے حور نے کاندھے اچکائے۔

”ایک ہی رات میں طارق اتنا بدل گیا کہ اپنے گھر کے متعلق کہنے لگا کہ یہاں کوئی کسی کے لیے نہیں کرتا۔ وہ یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ یہاں اس کے نازخڑے کوئی نہیں اٹھائے گا۔ یہ طارق کا ہی دیا گیا ہوتا ہے جو یہ میرے سامنے اس طرح کھڑی ہے۔“ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے انہوں نے تیر چھتی نکالوں سے سر تاپا اسے گھورا اور کچن سے باہر آ گئیں۔

ان کے کچن سے نکل جانے کے بعد حور نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ ناشتا ہی بنا کر لے جائے۔ جتنے جتنے ہوئے جائے کے سب لینے لگی۔ تب ہی خانساں کچن میں دوبارہ آ گیا۔

”خان بابا! کیا آپ ممائی کے لیے ناشتا بنا رہے ہیں۔ مجھے بتادیں، میں بنا دیتی ہوں۔“ ”بڑی بیگم صاحبہ۔۔۔ صبح صرف کافی پیتی ہیں یا پھر جوس لیتی ہیں۔ فی الحال ان کا آرڈر یہ ہے کہ آپ کچن سے نکل جائیں تو تب میں ان کے لیے کافی بناؤں۔“

خان بابا نے جھکتے ہوئے حور کو بتایا تھا۔

”کیوں۔۔۔؟ میں کیا ان کی کافی کو نظر لگا دوں گی؟“ وہ استہزائیہ مسکرائی۔ ”خیر میں ناشتا کر چکی

ہوں۔ میں نے بھی اخلاقیات چھاتا تھا۔ میں کون سا ان کی خدمتیں کرنے کے لیے بے چین ہو رہی ہوں۔“ اس نے بھی خان بابا کو رازداری سے بتایا اور کچن سے نکل گئی۔

حور کھٹا کھٹ کرتی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دلشاد کو اس کی بھتی ہیل ہتھوڑے کی مانند لگی۔ ایسا ہتھوڑا جوان کے ماضی کے در کھول رہا تھا۔



کتنے دن تک تو اسے یہی نہیں پتا تھا کہ اس گھر میں کتنے کمرے ہیں اور کچن کہاں ہے۔ اماں جی خود ہی ناشتا بناتی تھیں اور اپنے بچوں کو خود کرواتی تھیں۔ ندرت اور مدحت کالج جاتی تھیں اور شائستہ کی شادی ہو چکی تھی۔ ابراہیم ماں کے پاس ہی ناشتا کرتا تھا۔ عادل اور عزت اسکول جاتے تھے۔ شروع کے چند ماہ تو ایسے ہی گزر گئے تھے۔ ندرت اور مدحت کالج سے آ جاتیں تو پھر اماں جی کے ساتھ کاموں میں لگ جایا کرتیں۔

ایک روز ابراہیم صاحب نے اسے لولا۔
 ”میں تو کام کرنا چاہتی ہوں۔ پر اماں جی اور آپ کی بہنیں ہر بار یہ کہہ کر انکار کر دیتی ہیں کہ پہلے میٹھے کو ہاتھ لگوائیں گے پھر کچھ اور کرنے دیا جائے گا۔“
 ”آخر سال ہونے کو ہے۔ کب تم میٹھے میں ہاتھ لگاؤ گی۔ میں آج ہی اماں جی سے بات کرتا ہوں۔“

پھر ابراہیم نے اماں جی سے بات کی اور یوں اس نے بھی جی جان سے کھیر پکائی۔ لیکن جب وہ کھیر گھوٹ رہی تھی تو اماں جی کے چہرے پر عجیب سی ناگواری تھی۔ پھر کھیر پکنے کے بعد سب ہی نے کھائی۔ نہیں کچھ سی تو فقط اماں جی نے۔۔۔ انہوں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا تھا۔
 دلشاد کو وہ خود پسند کر کے لائی تھیں۔ خاندانی لوگ تھے۔ مگر انہیں کیا پتا تھا کہ لڑکی الٹے ہاتھ سے کھانا بناتی ہے اور الٹے ہاتھ سے ہی کھاتی ہے۔ اماں جی کو تو سوچ سوچ کر کراہیت آرہی تھی۔ ان کی پاکیزہ اور نفیس طبیعت نئی نوبلی بیوی کی طرف سے مکدر ہو چکی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ دلشاد کام بھی سستی سے کرتی تھی۔ جس کام میں لگ جانی پورا دن وہیں لگا دیتی۔

ایک روز دلشاد کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ اس کی سرالی رشتے دار خواتین اماں جی کے پاس بیٹھی تھیں۔ دہن سے ملنے کے لیے کچن میں آئیں تو دیکھ کر چھی چھی کرنے لگیں۔
 ”اے بیٹی! تمہارے سیدھے ہاتھ میں کوئی تکلیف ہے کیا جو تم الٹے ہاتھ سے روٹیاں ڈال رہی ہو۔۔۔؟“

وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کے الٹے ہاتھ کے استعمال پر اعتراض بھی ہو سکتا ہے۔

بقول اس کی ماں کے بہت سے لوگ الٹے ہاتھ کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان خواتین کی موجودگی میں زورس ہونے لگی اور فی الفور اس نے سیدھے ہاتھ سے روٹی ڈالی چاہی لیکن روٹی کیسے پکتی اس کا اپنا ہاتھ ہی جل گیا۔ گھبراہٹ میں اس نے چوہا بند کر دیا۔ پھر دسترخوان لگا بھی مہمان خواتین کے ہمراہ وہ بھی کھانا کھانے بیٹھی اور جب اس نے الٹے ہاتھ سے کھانا شروع کیا تو اس پر بھی اعتراض ہوا۔

”زیب النساء۔۔۔ پہلی بھولینے چلی تھیں۔ کم از کم یہ تو دیکھ لیتیں کہ وہ بایاں ہاتھ کیوں استعمال کرتی ہے۔ یہ ہاتھ تو نجاست کے لیے ہے اور یہ اس سے کھانا کھا رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے نماز میں شہ بھی یہ ایسی انگشت سے پڑھتی ہوگی۔ انگشت شہادت کو تو اس نے ناپاک کیا ہوا ہے۔ چھی چھی چھی اس کی تو نماز بھی نہیں ہوتی ہوگی۔ اے بیٹی۔۔۔ تمہاری ماں نے کبھی روکا نہیں تمہیں۔ کل کلاں کو بچے ہوں تو وہ بھی ماں سے یہ عادتیں لیں گے۔ ہمیں تو ذہن تمہاری یہ عادت اچھی نہیں لگی۔“

مارے شرم کے دلشاد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اب اسے سمجھ میں آیا تھا کہ اماں جی اس کے ہاتھ کا کھانا اسے نہیں کھاتی تھیں۔ عورتوں کے ہاتھ تو ایک اچھا موضوع آگیا تھا۔ زیب النساء البتہ خاموش تھیں۔ وہ اس معاملے میں کسے مورد الزام ٹھہراتیں۔ کیونکہ بہو تو وہ خود پسند کر کے لائی تھیں۔ دلشاد کی رنے کی کسرباتی تھی جب وہ ان لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بعد تو یہ بات سب کو پتا چل گئی کہ اس وجہ سے اماں جی اس کا کسی چیز میں ہاتھ لگوانا پسند نہیں کرتیں۔

اماں جی نے کبھی دلشاد کو اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک اب اسے کچھ بھی لہنا بے کار تھا۔ اس کی عادت پختہ ہو چکی تھی۔ لہذا وہ اپنی بیٹیوں سے ہی سارے کام کروا لیتیں۔ ندرت کام کاج میں بہت طاق اور پھرتیلی تھی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے گھرداری بھی سناں لٹی تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ اس کی موجودگی میں، ماں جی کچن میں نہ جائیں۔ کیونکہ ماں جی شوگر اور بلڈ پریشر کی مریض تھیں اور کام کرتے ہوئے ان کے ہاتھ کا پتے تھے۔

ندرت کا یہ پھر تیل اپن دلشاد کو بہت کھٹکتا تھا اس کی وجہ سے دلشاد کٹی کٹی رہتی تھی۔ ان ہی حالات کی وجہ سے اس کا زیادہ وقت میسے میں گزرنے لگا اس دوران ندرت اور مدحت کی شادیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور سال بھر میں وہ اپنے گھریار کی ہو گئیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ دلشاد اپنی جگہ بنانی لیکن اپنی جگہ نہ بنا سکی۔ کیونکہ وہ سسرال میں رہتی تھی اور نہ ہی ان کے طور طریقوں سے واقف ہوئی تھی۔ مگر اب مجبوری یہ تھی کہ دلشاد کو ہی کام کرنا تھا اور یہ مجبوری اماں جی کو وار انہیں کھاتی تھی۔ عزت اسکول جاتی تھی۔ اماں جی نے اسی پہ انحصار کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنا کھانا خود بناتیں۔ ایک دن ان کا ہاتھ جل گیا۔ ندرت سسرال سے آئی تو بہت ناراض ہوئی۔

”گھر میں کام ہی کتنا ہوتا ہے۔ کتنی کے چار افراد ہیں۔ پھر بھی اماں جی کو کام کرنا پڑتا ہے۔“

”تو کس نے کہا ہے اماں جی کام کریں۔ دلشاد تو کرنا چاہتی ہے مگر۔۔۔ اماں جی اس کے ہاتھ کا کام پسند نہیں کرتیں۔“ ابراہیم نے دے دے انداز میں صورت حال واضح کی۔ حالانکہ اصل بات سے ندرت اور ماں جی دونوں ہی واقف تھیں۔ اماں جی بیٹے کو حمایت کرتا دیکھ کر ہڑک گئیں۔

”عمر کے آخری حصے میں، میں نجاست نہیں کھاؤں گی۔ وہ باورچی خانے میں جاتی ہے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہر چیز پلید کر دی ہے اس نے۔“

ابراہیم نے حمایت طلب نگاہوں سے بہن کی طرف دیکھا۔

”سوال پاکی ناپاکی کا نہیں ہے۔ سوال ان عادتوں کا ہے جو بھابھی بیگم میں پائی جاتی ہیں۔ دن

حور کھنا کھٹ کرتی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دلشاد کو اس کی بھتی بہیل، تھوڑے کی بامند گئی۔ ایسا تھوڑا جوان کے ماضی کے درگھول رہا تھا۔



کتنے دن تک تو اسے یہی نہیں پتا تھا کہ اس گھر میں کتنے کمرے ہیں اور کچن کہاں ہے۔ اماں جی خود ہی ناشتا بناتی تھیں اور اپنے بچوں کو خود کروانی تھیں۔ ندرت اور مدحت کا لُج جاتی تھیں اور شائستہ کی شادی ہو چکی تھی۔ ابراہیم ماں کے پاس ہی ناشتا کرتا تھا۔ عادل اور عزت اسکول جاتے تھے۔ شروع کے چند ماہ تو ایسے ہی گزر گئے تھے۔ ندرت اور مدحت کا لُج سے آجائیں تو پھر اماں جی کے ساتھ کاموں میں لگ جایا کرتیں۔ ایک روز ابراہیم صاحب نے اسے ٹوکا۔

”میں تو کام کرنا چاہتی ہوں۔ پر اماں جی اور آپ کی بہنیں ہر بار یہ کہہ کر انکار کر دیتی ہیں کہ پہلے میٹھے کو ہاتھ لگوائیں گے پھر کچھ اور کرنے دیا جائے گا۔“

”آخر سال ہونے کو ہے۔ کب تم میٹھے میں ہاتھ لگاؤ گی۔ میں آج ہی اماں جی سے بات کرتا ہوں۔“

پھر ابراہیم نے اماں جی سے بات کی اور یوں اس نے بھی جی جان سے کھیر پکائی۔ لیکن جب وہ کھیر گھوٹ رہی تھی تو اماں جی کے چہرے پہ عجیب سی ناگواری تھی۔ پھر کھیر پکنے کے بعد سب ہی نے کھائی۔ نہیں چھٹی تو فقط اماں جی نے۔۔۔ انہوں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا تھا۔

دلشاد کو وہ خود پسند کر کے لائی تھیں۔ خاندانی لوگ تھے۔ مگر انہیں کیا پتا تھا کہ لڑکی الٹے ہاتھ سے کھانا بناتی ہے اور الٹے ہاتھ سے ہی کھاتی ہے۔ اماں جی کو تو سوچ سوچ کر کراہیت آرہی تھی۔ ان کی پاکیزہ اور نفیس طبیعت نئی نویلی بہو کی طرف سے مکر رہو چکی تھی۔ اس پہ طرہ یہ کہ دلشاد کام بھی سستی سے کرتی تھی۔ جس کام میں لگ جاتی پورا دن وہیں لگا دیتی۔

ایک روز دلشاد کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ اس کی سسرالی رشتے دار خواتین اماں جی کے پاس بیٹھی تھیں۔ دہن سے ملنے کے لیے کچن میں آئیں تو دیکھ کر چھی چھی کرنے لگیں۔

”اے بیٹی! تمہارے سیدھے ہاتھ میں کوئی تکلیف ہے کیا جو تم الٹے ہاتھ سے روٹیاں ڈال رہی ہو۔۔۔؟“

وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کے الٹے ہاتھ کے استعمال پر اعتراض بھی ہو سکتا ہے۔

بقول اس کی ماں کے بہت سے لوگ الٹے ہاتھ کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان خواتین کی موجودگی میں نروس ہونے لگی اور فی الفور اس نے سیدھے ہاتھ سے روٹی ڈالی جا ہی لیکن روٹی کیسے پکتی اس کا اپنا ہاتھ ہی جل گیا۔ گھبراہٹ میں اس نے چولہا بند کر دیا۔ پھر دسترو خان لگا بھی مہمان خواتین کے ہمراہ وہ بھی کھانا کھانے بیٹھی اور جب اس نے الٹے ہاتھ سے کھانا شروع کیا تو اس پہ بھی اعتراض ہوا۔

”زیب النساء۔۔۔ پہلی بہو لینے چلی تھیں۔ کم از کم یہ تو دیکھ لیتیں کہ وہ بایاں ہاتھ کیوں استعمال کرتی ہے۔ یہ ہاتھ تو نجاست کے لیے ہے اور یہ اس سے کھانا کھا رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے نماز میں کھانا کھا رہی ہے۔ ایسی انگشت سے پڑھتی ہوگی۔ انگشت شہادت کو تو اس نے ناپاک کیا ہوا ہے۔ چھی چھی چھی اس کی تو نماز بھی نہیں ہوتی ہوگی۔ اے بیٹی۔۔۔ تمہاری ماں نے کبھی روکا نہیں تمہیں۔ کل کلاں کو بچے ہوں تو وہ بھی ماں سے یہ عادتیں لیں گے۔ ہمیں تو دلہن تمہاری یہ عادت اچھی نہیں لگی۔“

مارے شرم کے دلشاد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اب اسے سمجھ میں آیا تھا کہ اماں جی اس کے ہاتھ کا کھانا کھا رہی ہیں۔ عورتوں کے ہاتھ تو ایک اچھا موضوع آگیا تھا۔ زیب النساء البتہ خاموش تھیں۔ وہ اس معاملے میں کسے مورد الزام ٹھہرائیں۔ کیونکہ بہو تو وہ خود پسند کر کے لائی تھیں۔ دلشاد کی ماں نے کی کسر باقی تھی جب وہ ان لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بعد تو یہ بات سب کو پتا چل گئی کہ اس وجہ سے اماں جی اس کا کسی چیز میں ہاتھ لگوانا پسند نہیں کرتیں۔

اماں جی نے کبھی دلشاد کو اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک اب اسے کچھ بھی لہنا بے کار تھا۔ اس کی عادت چننے ہو چکی تھی۔ لہذا وہ اپنی بیٹیوں سے ہی سارے کام کروا لیتیں۔ ندرت کام کاج میں بہت طاق اور پھر تلی تھی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے گھرداری بھی سنبھال رکھی تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ اس کی موجودگی میں، ماں جی کچن میں نہ جائیں۔ کیونکہ ماں جی شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اور کام کرتے ہوئے ان کے ہاتھ کا پتہ نہ تھے۔

ندرت کا یہ پھر تلاپن دلشاد کو بہت کھٹکتا تھا اس کی وجہ سے دلشاد کئی کئی راتیں تھی۔ ان ہی حالات کی وجہ سے اس کا زیادہ وقت میکے میں گزرنے لگا اس دوران ندرت اور مدحت کی شادیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور سال بھر میں وہ اپنے گھریار کی ہو گئیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ دلشاد اپنی جگہ بنانی لیکن اپنی جگہ نہ بنا سکی۔ کیونکہ نہ وہ سسرال میں رہتی تھی اور نہ ہی ان کے طور طریقوں سے واقف ہوئی تھی۔ مگر اب مجبوری یہ تھی کہ دلشاد کو یہ کام کرنا تھا اور یہ مجبوری اماں جی کو وارنا نہیں کھاتی تھی۔ عزت اسکو مل جاتی تھی۔ اماں جی نے اسی پہ انحصار کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنا کھانا خود بناتیں۔ ایک دن ان کا ہاتھ جل گیا۔ ندرت سسرال سے آئی تو بہت ناراض ہوئی۔

”گھر میں کام ہی کتنا ہوتا ہے۔ کتنی کے چار افراد ہیں۔ پھر بھی اماں جی کو کام کرنا پڑتا ہے۔“
 ”تو کس نے کہا ہے اماں جی کام کریں۔ دلشاد تو کرنا چاہتی ہے مگر۔۔۔ اماں جی اس کے ہاتھ کا کام پسند نہیں کرتیں۔“ ابراہیم نے دے دے انداز میں صورت حال واضح کی۔ حالانکہ اصل بات سے ندرت اور ماں جی دونوں ہی واقف تھیں۔ اماں جی بیٹے کو حمایت کرتا دیکھ کر بھڑک گئیں۔
 ”عمر کے آخری حصے میں، میں نجاست نہیں کھاؤں گی۔ وہ باورچی خانے میں جاتی ہے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہر چیز پلید کر دی ہے اس نے۔“

ابراہیم نے حمایت طلب نگاہوں سے بہن کی طرف دیکھا۔

”سوال پاکی ناپاکی کا نہیں ہے۔ سوال ان عادتوں کا ہے جو بھابھی بیگم میں پائی جاتی ہیں۔ دن

بھروہ اپنے کمرے میں رہتی ہیں۔ حالانکہ اماں جی اکیلی ہی ہوتی ہیں۔ دن بھر آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ آنے جانے والوں کو دیکھنا کیا ملازموں کی ذمہ داری ہے۔ گھر کی بھوکا کوئی فرض نہیں ہوتا؟“

ندرت کے الفاظ دلشاد کو تیر کی طرح لگ رہے تھے۔ مگر اس میں اتنا اعتماد نہیں تھا کہ نند کے سامنے کوئی ٹھوس بات کر سکے۔

پیسے کی کمی اس کے ماں باپ کے گھر میں بھی نہیں تھی۔ لیکن یا سچیت، اپنے بیٹھے، پہننے اوڑھنے میں تہذیب و سلیقہ برائے نام بھی نہیں تھا۔ جبکہ سہرا ل میں یہی سب کچھ نمایاں تھا۔ وہ ان چیزوں میں کامیاب تو تب ہوئی، جب اسے کوشش کرنے کا موقع ملتا۔

لیکن۔۔۔ ایسا کچھ نہ ہوا۔۔۔ الٹا وہ ان حالات کی وجہ سے نفرتاتی دباؤ میں آتی چلی گئی اور سب سے الگ تھگ سی ہو گئی۔ کیونکہ اماں جی نے اس کا رسوئی میں جانا تو کراہ کر اس کے کانے پینے کے برتن بھی الگ کر دیے تھے۔

ایک دم کچھ کرنے کی آواز پہ دلشاد کو جھٹکا سا لگا اور وہ ماضی سے سال میں آ گئی۔
”ایک وہ وقت تھا اور ایک یہ وقت ہے۔“ وہ جلتی کڑھتی بڑی بڑی آہیں کرتی تھیں۔
”کب تک یوں لیٹ کر اپنی برباد زندگی کا ماتم کرو گی۔ دیکھو اس گھر کی بیاتاپورے گھر

میں کیسے دندناتی پھر رہی ہے۔ اپنا شانت تک خود بنا کر کھا کر گئی ہے اور ایک رات میں سال میں تم اپنے لیے ایک کپ چائے کا بھی وہاں نہیں بنا سکیں۔ میں تو اس ایک تم ہو۔۔۔ تین۔۔۔ تین سال ہوں۔ وہ کس دھڑلے سے اس گھر پہ اپنا حق جما رہی ہے۔“
”کون۔۔۔ ماما؟“ دل آویز نسل مندی سے اٹھ بیٹھی۔

”وہی۔۔۔ جسے ہم رات بیاہ کر لائے ہیں۔“ دلشاد بیگم نے دائیں سر پر کچا پائے
”اچھا۔۔۔ مگر۔۔۔ اس میں عجیب بھی کیا ہے ماما۔۔۔ آپ کا بڑا پہلے سے ہی چاہتا تھا اسے اب تو وہ اسے سر پر بٹھا کر رکھے گا۔“

”اپنے سر پر بٹھا کر رکھے ہمارے سر پر کیوں بٹھا رہا ہے اسکر۔“ وہ بے بس دکھائی دے رہی تھیں۔

”اونہ۔۔۔ ہمارے سر پر تو وہ بیٹھ چکی ہے۔۔۔ کیا حیثیت ہے ہماری۔ مرضی نہ ہونے کے باوجود بھی ہم اسے بیاہ لائے۔“

”آپ لوگ کپڑا مائز کر لیں اس چڑیل سے۔۔۔ میں تو ہرگز نہیں کروں گی اور اس سے کہہ دینا میری نظروں کے سامنے مت آئے۔“ دلنشین سخت جزبہ ہو رہی تھی۔

”ارے بھئی۔۔۔ تم لوگ ابھی تک بستروں میں ہی پڑی ہو۔ شام کو ولیم ہاں جانے کی تیاری نہیں کرنا؟“

ابراہیم صاحب نے بیوی اور بیٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے مصححانہ انداز میں پوچھا تھا۔ تینوں

کسی راستے کی تلاش میں

پہنچیں۔
 ”میرا خیال ہے یہ لوگ ولیمہ میں جانا پسند نہیں کریں گی۔“ ولید نے کمرے میں داخل ہوتے
 دیکھا تو دلنشین طیش میں آگئی۔

”تم کون ہوتے ہو۔ ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرنے والے۔ ہیں۔“
 ”میں اس گھر کا فرزند ہوں مائی ڈیئر سسٹر۔۔۔!“ ولید نے گویا اس کا مذاق اڑایا۔
 ”ایسے ہوتے ہیں بھائی۔۔۔ اتنا بھی ہوش نہیں تھارت تمہیں کہ کتنے معزز لوگ آئے ہوئے
 تھے اور تم تھے کہ جو کر بنے ہوئے تھے۔ میری فرینڈز نے اتنا مذاق اڑایا ہے میرا۔“
 سونے کی بات ہے۔ اتنی گید رنگ میں وہ صرف مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔ میرے علاوہ کچھ تھا ہی
 نہیں دیکھنے کو؟“

”اتنی گید رنگ میں اول جلول حرکتیں کرتا ہوا ایک ہی جو کر جو نظر آ رہا تھا۔“
 ”جو کر نہیں۔ ہیر و کہو۔ چار منگ پر سٹائی جو دیکھتا ہے دیکھتا رہ جاتا ہے۔“ ولید اتر آیا۔
 ”ہونہ۔۔۔ آئینہ دیکھا ہے کبھی؟“ دلنشین کب باز آنے والی تھی۔
 ”اچھا اب بس کرو۔ میں تم لوگوں سے یہ کہنے آیا تھا کل رات کی طرح لیٹ ہونے کی ضرورت
 نہیں ہے۔ یہ فٹنشن تم لوگوں کا ہے اور میزبان پہلے پہنچتے ہیں۔ ہو سکے تو حورالعین کو بھی جلد تیار کروالینا۔“
 ولیمہ کر ابراہیم صاحب جلدی سے باہر نکل گئے۔

”ماما! اگر یہ فٹنشن میں جائے گا تو پھر میں نہیں جاؤں گی۔ جتنا تماشا اس نے کل رات لگنا تھا
 اٹالیا۔“ دلنشین تنک کر بولی تو ولید زوردار تہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔
 ”کل سے پہلے تم لوگوں کی یہ ضد تھی کہ حورالعین اگر طارق کی دلہن بنی تو تم بارات میں ہی شامل
 نہیں ہوگی۔ کل رات وہ گھر میں آگئی اور باقاعدہ باعزت طریقے سے تم لوگ خود لے کر آئے۔ طارق
 میرا بھائی ہے میں اس کا ولیمہ ضرور اٹینڈ کروں گا۔ اب تم سوچو کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ بائی داوے میں اس
 لیے آیا تھا کہ بھابھی کو ولیمہ کے لیے کون تیار کروانے لے جائے گا۔“ دلشاد نے حیرت سے بیٹے کی
 طرف دیکھا۔

”تمہیں اس بات کی فکر کیوں ہے؟“
 ”لو بھلا۔۔۔ اس بات کی فکر میں نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔ رات وہ گھر میں آئی۔ کوئی اس
 کے استقبال کے لیے موجود نہیں تھا۔ اب بھی کچھ ایسا ہی ڈرامہ ہونے والا ہے کیا؟“
 ”تو تم لے جاؤ۔ تم ہونا۔ اس کے بڑے ہمدرد۔“ دل آویز نے جل کر کہا۔
 ”ٹھیک ہے، شام چار بجے میں بھابھی کو خود لے جاؤں گا۔ ہاں اگر کسی اور نے چلنا ہو تو تیار
 رہنا۔ میری گاڑی میں بہت جگہ ہے۔“

”دیکھا ماما آپ نے۔ ایک نہ شد و شد۔ اکٹھے دو بیٹوں کو پھنسیا ہے اس چڑیل نے۔“ دلنشین
 نے ولید کے جانے کے بعد ماں کو بھر کایا۔
 ”ہونہ۔۔۔ ابھی تو دیکھنا کیسے کیسے چاند چڑھتے ہیں اس گھر میں اور یہ سب آپ کی ڈھیل کا نتیجہ

ہوگا۔“

دل آویز بھی ماں کو کچھ کہنے پہ اکسار ہی تھی۔ جودل ہی دل میں چچ و تاب کھا رہی تھیں۔



”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے دلچسپ انسان ہو گے۔ میں حیران ہوں۔ اس سے پہلے میں نے تم سے بات کیوں نہیں کی۔ حالانکہ بچپن سے میرا ماموں کے ہاں آنا جانا تھا۔ تم کہیں نظر ہی نہیں آتے تھے مجھے۔“

”اصل میں بھابھی جان! بات یہ ہے کہ آپ کو طارق سے ہی فرصت نہیں ہوتی تھی تو آپ ہمیں کیا دیکھتیں۔“

”ابن بنی حور جھینپ گئی۔“ نہیں اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میں باقی لوگوں سے بھی بات کرتی تھی، اور اکثر ممانی جان کے رویے کو بہت محسوس کرتی تھی۔ کچھ کچھ پراوڈ سی لگتی تھیں وہ مجھے۔“

”لگتی تھیں نہیں، ہیں۔“ صحیح تجزیہ کیا آپ نے ان کے بارے میں۔ بانی داوے طارق کے بارے میں کیا ریمارکس ہیں آپ کے؟“

حور کے چہرے پہ کئی رنگ آ کر گزر گئے اور اس نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا۔ ولید قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ارد گرد کھڑی خواتین نے مز کرستائی انداز میں اسے دیکھا تھا۔ بلیک سوٹ میں ملبوس وہ واقعی پرنس لگ رہا تھا۔ گرین کلر کے کامدانی لہنگا اور بھاری دوپٹے میں حور کی حور سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

”جوڑی تو بہت شان دار ہے۔“ یہ ابراہیم صاحب کے کاروباری حلقے کے لوگوں کی بیویاں تھیں۔ جو آپس میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔

”چلیے آپ جواب نہ دیں لیکن میں آپ کو بتا دوں میرا بھائی نہایت بزدل انسان ہے۔“

”بزدل۔۔!“ حور کو جھکا لگا۔

”بھئی مصلحت اندیش، دور اندیش، مصلحت کا مفہوم میرے نزدیک سراسر بزدلی ہے اور یہ بزدلی موصوف میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔“

”اچھا!“ وہ مسکرا دی۔

”بانی داوے معزز نظر نہیں آ رہا۔ وہ مزاج کیا ہے؟“ حور نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ماما کا چچہ ہے۔ ہر وقت ماما کے پلو سے بندھا رہتا ہے۔ لگتا ہے طارق کے بعد چہیتے بیٹے کی سیٹ اسے ہی ملے گی۔ جب تک ماما گھر سے نہیں نکلیں گی وہ کیسے یہاں آ سکتا ہے۔ اس کے بستر نہیں کٹ جائیں گے۔ نمبر بنانے کے چکر میں اپنی شخصیت ہی زبانی کر لی ہے اس نے۔“

”اچھا۔۔!“ وہ ذرا کی ذرا حیران ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ آنے والا ہے دیکھ لینا۔ ماما کی تیسری بیٹی ہی لگتا ہے۔“ حور بے ساختہ ہنس پڑی۔

”سارے مہمان آپکے ہیں۔ ماما سے فون کر کے پتا تو کروں آ بھی رہی ہیں۔۔۔ یا۔۔۔ خود

لانی لرتے ہوئے ولید نے موبائل جیب سے نکالا۔
تب ہی سامنے سے ماں اور بہنیں آتی نظر آئی تھیں۔
”لو بھئی۔ آپ کی ساس نندیں آگئی ہیں۔ اب ان کے ساتھ انجوائے کرنا۔ میں ذرا اپنی گرل
فرائیڈ کے گپ شپ لگا لوں۔“

یہ کہتے ہی دوسرے پل وہ فون پہ مصروف ہو گیا۔
”تم اسے لے کر یہاں آ گئے۔“ ہمیں اتنا پتا نہیں تھا کہ ہم لوگ تمہارا انتظار گھر پر کر رہے تھے۔“
دلشاد بیگم اسٹیج پر پہنچ چکی تھیں اور سخت برہم دکھائی دے رہی تھیں۔
”گھر پہ ولیدہ ہو رہا تھا کیا؟“ ولید نے ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑائی۔
”زیورات دینے تھے اسے اور یہ۔۔۔ یہ پہن کر بیٹھی ہے یہاں۔ اسے تمیز نہیں تھی کہ اتنے مہنگے
ایمان پہ۔۔۔ تو لے ماشے کی چیزیں نہیں جچتیں۔“ دلشاد بیگم نے اس کے منیسے کے زیورات پہ طنز کیا۔
اور بدل کر رہ گئی۔

”اتنے بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ کیا کہیں گے سیٹھ ابراہیم کی بہو نے فقط دو چار تو لے
لیا ہیں رکھا تھا۔ ناک کٹوا کر رکھ دی ہے ہماری۔“

”اس میں اتنا دواؤ لیا کرنے والی کون سی بات ہے۔ اپنے ساتھ لے آئیں۔ اب پہن لیتی۔“ ولید
بے حد ابرو اٹھاتا رہا تھا۔

جبکہ حور سوچ رہی تھی ”کل تو آپ کی ناک نہیں کٹی۔ کل بھی تو میں یہی پہن کر رخصت ہو کر آئی
تھی۔“

”ہم اس کے ملازم نہیں تھے۔ جو یہاں لے کر آتے اور اسے پہناتے۔ جب اس میں خود ہی
ایئر مشین تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اس کی فکر کرتے پھریں۔“
”چھوڑیں نا ماما۔۔۔! چھوٹے گھر کی لڑکی ہے۔ اسے ہمارے اسٹیشن کا کیوں خیال آنے
لگا۔“ ولید آویز بھی۔

”سنا تھا اس کے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے اور یہ مجھے چھوٹے گھر کا کہہ گئی۔“ حور دل ہی دل
میں بیچ و تاب کھا رہی تھی۔

”ارے مسز ابراہیم! اتنی دیر سے آپ لوگوں کو تلاش کر رہے تھے۔ اب آئے ہیں آپ
لوں۔۔۔؟“

دلشاد شرمندہ ہو گئیں۔

”در اصل رات جاگنے کی وجہ سے بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا تھا دوائی لی ہوئی تھی۔ پھر بھی طبیعت
خوب نہیں ہو رہی تھی۔ اب بھی پچپاں ہی کھانچ کھانچ کر لائی ہیں۔ ورنہ میں تو بستر پہ پڑی تھی۔“

”ویسے بہو بہت پیاری لانی ہیں آپ۔“ مسز وقاص نے کہا۔

”انہوں نے شیشا کر ادھر ادھر دیکھا پھر کہنے لگیں۔

”اللہ کرے سیرت کی بھی پیاری ہی ہو۔“

”مسز ابراہیم! بہو اپنوں سے لائی ہیں یا۔۔۔ غیروں سے۔۔۔؟“

”ابراہیم کے رشتہ داروں میں سے آئی ہے۔ میرے اپنوں میں سے تو ہے نہیں۔ یہ تو برتنے کے بعد ہی پتا لگے گا کہ کیسی ہے۔“ انہوں نے ناک چڑھا کر کہا پھر فوراً ہی موڑ بدلتے ہوئے بولیں۔

”میری بیٹیوں سے نہیں ملیں آپ لوگ۔ ارے دل آویز! دلنشین! آنٹی سے ملو نا۔“ دونوں نے باری باری سلام کیا۔ خواتین کی آنکھوں میں پسندیدگی تھی۔

”بہت پیاری ہیں آپ کی بیٹیاں۔۔۔ ان میں سے کون سی بڑی ہے اور کون سی چھوٹی؟“

”بس یوں سمجھ لیں۔ دونوں ہی اوپر تلے کی ہیں۔“ دلشاد بیگم نے سفید جھوٹ بولا۔

”اس کا مطلب ہے پھر تو شادیاں بھی ان کی ساتھ ہی کریں گی۔“ ایک خاتون نے شرارت سے کہا تو دلشاد بیگم خوش دلی سے بولیں۔

”کیوں نہیں۔ بس اچھے رشتے مل جائیں۔“

اتنے بڑے جھوٹ پہ حور کے روکنے کھڑے ہو گئے۔

”ارے مسز ابراہیم! ہم نے تو سنا تھا کہ آپ نے ایک بیٹی کی شادی کر دی ہے۔ جاوید بتا رہے تھے جب سے شادی کی ہے۔ آپ کی بیٹی آپ کے ہاں ہی رہ رہی ہے۔ نہایت ہی نکما اور بد مزاج داماد ملا ہے آپ کو۔ وہ بیٹی ان سے بڑی ہے کیا؟ اسے نہیں لائیں آپ ساتھ۔۔۔؟“

ان کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بوکھلا گئیں۔

”بس یہی ایک داستان ہے مسز جاوید! پھر کبھی سناؤں گی۔ آئیں نا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

دلشاد بیگم ساڑھی کا پلو سمیٹتی خواتین کو لے کر اسٹیج سے اتریں اچانک ہی ان کی نگاہ فرخ شاہ پر پڑی۔ ٹاپ اور جینز میں ملبوس وہ باب کٹ بالوں کو لا پرواہی سے جھٹکی بے چین نگاہوں سے کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ ایک لمحے کو ان کے قدم ڈنگا گئے۔

”ولید اتنا حد سے تجاوز کر چکا ہے کہ اسے یہاں تک بلا لیا۔“

”مسز جاوید! آپ لوگ چلیں میں ابھی آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ واپس اسٹیج کی طرف مڑ گئیں۔

”دیکھو، فرخ یہاں آئی ہوئی ہے۔ کسی کو جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے اس طرح ملنا ہے جیسے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور دلنشین! تم خاص طور پہ یہیں بیٹھی رہو۔ اگر وہ تم سے آکر خود بولے تو اسے نظر انداز کر دینا۔“

”میں نے کہا تھا نا ما۔۔۔ یہ ولید ضرور آج بھی کوئی چاند چڑھائے گا۔ ذرہ برابر بھی غیرت نہیں ہے اس میں۔ دیکھ لینا کل سے زیادہ تماشا لگے گا یہاں۔ میں تو ابھی اور اسی وقت گھر جا رہی ہوں۔“

”فضول جذباتی مت بنو دلنشین! اس طرح کر کے تم ایک بچ لڑکی کو اہمیت دے رہی ہو۔ بہت سے اٹھائی گیرے گھس آتے ہیں بنا اجازت۔ اس کا مطلب یہ ہے اپنا فتنش خراب کر دیا جائے۔“

دل آویز نے بہن کو تنبیہ کی تو دلشاد بیگم خوش ہو گئیں۔ ”شاباش۔۔۔! میں ادھر جا رہی ہوں دل آویز۔۔۔! اسے کنٹرول میں رکھنا۔“ یہ سب باتیں سر جھکائے بیٹھی حور العین، با آسانی سن رہی تھی۔

حورالعین کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ گھر میں فقط ولید ہے جس کے سامنے یہ لوگ بہت بے بس تھیں۔

”دیکھیں دل آویز آپا! وہ ادھر ہی آرہی ہے۔“
 دلنشین نے بے چینی سے دل آویز سے سرگوشی کی تو دل آویز تلملا گئی اور اسے گھورتے ہوئے بولی۔
 ”ہزار بار کہا ہے تم سے یہ آپا کی دم مت لگایا کرو میرے ساتھ۔ ماما کو کتنی چڑ ہے اس بات سے۔“
 اچھی طرح جانتی ہوں۔“

ان کی گفتگو پہ حورالعین نے اپنی ہنسی کو بمشکل کنٹرول کیا۔ دونوں حورالعین کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔

دل آویز نے تنقیدی نگاہوں سے اس کے حسین سراپے کو دیکھا اور سلگتے ہوئے بولی۔
 ”بڑی خاموش پتیچی ہوں۔ حالانکہ سنا ہے تم تو ایک بل بھی چپ نہیں رہ سکتیں۔“ دل آویز کے طنز پہ حور بیٹھا گئی۔

دلنشین سے چپ نہ رہا گیا۔
 ”کمال ہے دل! آپ نے دیکھا نہیں جس وقت ہم ہال میں داخل ہوئے ہیں۔ یہ ولید کے ساتھ کیسے ٹھسے لگا رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی ولید بھی بھاگ گیا اور اس کی سٹی بھی گم ہو گئی۔“ دلنشین نے کڑی نگاہوں سے حور کو دیکھا تھا۔

”ولید تمہارا دیور ہے اور وہ کوئی ننھا مناجچہ نہیں ہے۔ طارق سے بس ڈیڑھ برس ہی چھوٹا ہے۔ تمہیں ولید سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ دل آویز نے سخت لہجے میں تنبیہ کی۔ ”ٹھیک ہے۔ وہ تمہاری طرح تیز طرار ضرور ہے مگر رشتوں کی کچھ حدود ہوا کرتی ہیں۔ نہ جانے آج کل کیسا ٹریڈ چل گیا ہے۔ کسی رشتے کا کوئی لحاظ ہی نہیں رہا۔“ نہ جانے اس کا ابھی مزید کتنا لیکچر باقی تھا کہ فرح شاہ ان کے سر پر پہنچ گئی۔

”ہائے۔۔۔ واؤ فنا سٹک برانڈ ازوری سوٹ، اینڈ پریٹی۔“ اس نے خوش دلی سے کہتے ہوئے دور کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

”آئی ایم فرح شاہ۔۔۔!“ حور نے جھجکتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا پھر ہاتھ بڑھایا۔
 پھر اس نے اس طرح دل آویز اور دلنشین سے بھی ہاتھ ملانا چاہا مگر دونوں نے لفٹ نہیں کرائی۔
 ”ولید نظر نہیں آ رہا۔ کدھر ہے وہ۔۔۔؟“

دل آویز نے نظریں پھیر لیں۔ دلنشین موبائل میں مصروف ہو گئی۔ فرح شاہ کندھے اچکاتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی۔ پھر یک دم پلٹی اور حور کی طرف چھوٹا سا گفٹ پیک بڑھاتے ہوئے بولی۔
 ”آپ کے لیے۔“

حور نے لاشعوری طور پر وہ گفٹ لے لیا۔ دونوں نندوں کی بھنویں تن گئیں۔
 ”بائی داوے! آپ کے نصف بہتر کدھر ہیں؟ حالانکہ انہیں اس وقت آپ کے پہلو میں ہونا پابھی تھا۔“ حور خاموش رہی تو فرح خود ہی بولی۔

”آپ کے ہاں مکس گید رنگ نہیں ہے۔ کتنا آکورد لگتا ہے۔ آج کے دور میں ایسا۔ میرا تو دم گھٹنے لگا ہے۔ ایسا کچھ سوچ کر کہ میں ولیمہ کے روز تہا بیٹھوں گی۔ مائی گاڈ کتنا بیک ورڈ فیوچر ہے۔“ یہ کہہ کر فرح نے خود ہی ایک بے باک سا قبضہ لگایا۔ دل نشین سلگ گئی۔ تنک کر بولی۔

”اس کے باوجود بھی تم ولید کا چچا نہیں چھوڑ تیں۔“
فرح، دل نشین کی بات یہ ایسے کھلکھلائی جیسے کسی بچے کی بات کوہنی میں اڑایا جائے۔
”مائی سویٹ ہارٹ۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ میں ولید سے ہی شادی کروں گی۔“
”تو پھر کیوں ہر وقت ولید کے ساتھ چلی پھرتی ہو۔“

”مائی گاڈ۔۔۔!“ وہ پھر ہنس پڑی۔ ”ویری سیمپل، وہ میرا دوست ہے۔“
فرح نے جلانے والے انداز میں کہا اور ہنستے ہوئے وہاں سے چل پڑی۔ سامنے ہی اسے ولید نظر آ گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔

”دیکھو اس مجنوں کو۔ یہ بھی شرم نہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔“ دل آویز بکس رہی تھی۔
یہ منظر نہ صرف دل آویز اور دل نشین نے بلکہ حور نے بھی دیکھا تھا اور حور یہ بھی دیکھ کر حیران رہ گئی تھی بظاہر مکس گید رنگ نہیں تھی۔ مردانہ ہال علیحدہ تھا اور زنانہ علیحدہ اس کے باوجود بہت سے حضرات، خواتین کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ پھر بھی طارق کو یہاں آنے میں ہچکچاہٹ تھی۔ حور الجھنے لگی تھی۔



گھر آنے کے بعد اس کا ابراہیم صاحب سے پہلی بار سامنا ہوا تھا۔ اس نے سلام کیا تو لاؤنج سے گزرتے ہوئے ابراہیم صاحب کے قدم رک گئے۔
ناچار انہیں سلام کا بھی جواب دینا پڑا اور سر پہ ہاتھ رکھ کر دعائیں بھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار کا ایک نوٹ نکال کر اس کی پھیلی پر رکھ دیا۔
حور نے پہلے وہ نوٹ دیکھا پھر ابراہیم کی طرف اور معصومیت سے بولی۔
”ماموں! یہ کیوں؟“

وہ شرمندہ سے ہو گئے اور نظریں چراتے ہوئے بولے۔
”کل ہے اب تک فرصت ہی نہیں ملی کہ تمہیں سلامی دے سکوں۔ یہ تمہاری سلامی ہے۔“
”یہ آپ رکھیں۔ میری سلامی تو ادھا رہا ہے۔“ حور بے تکلفی سے بولی۔ ابراہیم صاحب تو چونکے ہی تھے۔ دلشاد اور ان کی بیٹیوں کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ دوسرے ہی پل وہ ہنس پڑے اور آہستگی سے بولے۔

”سلامی اس طرح واپس نہیں کرتے سمجھیں۔ میں تمہارا سر ہوں۔“ ان کا انداز گو کہ شفیق تھا مگر اس میں شرارت کی آمیزش بھی تھی
”سسر یوں راہ چلتے سلامی نہیں دیتے۔ میں بھی آپ کی بھانجی ہوں۔“

ابراہیم صاحب کا قبہ بے ساختہ تھا۔ ”آج بھی تم ویسی ہی ہو۔ جیسی اماں جی کی زندگی میں ہوا لرتی تھیں۔ کبھی منی سیٹ کھٹ سی۔“ حور سکر کر رہ گئی۔

”اچھا بتاؤ کیا لوگی سلامی میں۔۔۔؟“

حور نے اشارہ کیا کہ کان ادھر لائیں۔ ابراہیم صاحب اس کی طرف جھک گئے۔ اس نے کان میں کچھ کہا۔ تو وہ۔۔۔ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے سیدھے ہو گئے۔

حور نے کان دھے اچکا دیے۔ ابراہیم صاحب کی سنجیدگی نے سب کو متحس کر دیا۔

”اچھا۔۔۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔ پھر ملاقات ہونے پہ بات ہوگی۔“

انہوں نے نرمی سے کہا تو وہ خوش ہو گئی اور اپنا بھاری لباس سنبھالتی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

ابراہیم صاحب بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ تو دل آویز نے ٹھٹھک کر ماں کی طرف دیکھا۔ ”یہ تماشے میری برداشت سے تو باہر ہیں۔ ایک معمولی لڑکی کو اتنا سیر پہ چڑھایا جا رہا ہے۔ آپ تو کہتی تھیں کہ وہ اس گھر میں نہیں آئے گی۔ آج بھی گئی تو معمولی ملازمہ بنا کر رکھیں گی اسے لیکن مجھے تو لگ رہا ہے چند ہی روز میں وہ ہماری چھٹی کروادے گی۔“

”ایسی سوچ کیوں ہے آپ کی دل آویز! ایسا بالکل نہیں ہوگا۔“ طارق نے محبت و اپنائیت سے بہن کا خدشہ دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن دل آویز بکھر گئی۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

”جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی ہے وہ ہمیں۔ اور تم کہہ رہے ہو یہ فقط میری سوچ ہے۔ ماما نے زندگی بھر داد و کی زلت و تحقیر سنی اور وہ تحقیر میرے لیے محرومیوں کا سبب بن گئی۔ ایسا عذاب جس سے میں جاہلوں بھی تو چھٹکارا نہیں پاسکتی۔“ یہ کہہ کر دل آویز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ طارق کی جان پہ بن گئی۔

”مگر ان سب باتوں کا حور سے کیا تعلق ہے۔۔۔؟“

وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا اور بس یہی اس کا سب سے بڑا گناہ تھا۔

”دیکھیں ماما! کیسے فیور کر رہا ہے یہ اپنی وائف کو۔ وہ کل آئی ہے اس کی زندگی میں اور ایک ہی رات میں یہ سب کچھ بھول بھال گیا۔“

اس الزام پہ وہ تمل گیا۔

”میں نے بھی تو پوچھا ہے۔ ہمارے جو مسائل ہیں ان سے حور کا تعلق کیا ہے؟“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ تم تو اب یہی کہو گے۔ تین سال سے میں اجڑی بیٹی ہوں۔ کب ہمدردی ہوئی کسی کو مجھ سے؟ میرے لیے ہی دیکھنا تھا ایسا بر۔ کیا میں لاڈلی نہیں تھی۔ ناز و نعم میں نہیں پلی تھی۔ دو کوڑی کی حیثیت ہو گئی میری سسرال میں کوئی سپورٹ کرنے والا نہیں تھا۔ مسائل کا انبار پہلے دن ہی سر پر آن پڑا اور۔۔۔ تم۔۔۔ تم لوگ۔۔۔ اپنی اپنی زندگی کی خوشیوں میں مست ہو۔“ یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

”تو۔۔۔ آپ کا مطلب ہے حور کے ساتھ وہی کیا جائے جو آپ کے ساتھ ہوا ہے۔ تب آپ

کے نم کا دوا ہوگا۔“ ولید کے الفاظ آہنی ہتھوڑے کی طرح آویز کے سر پر بڑے تو وہ بلبل گئی۔
 ”میرا مذاق اڑا رہے ہو تم۔ میں کیوں کسی کا گھر اجاڑنے لگی۔ پہلے بھی میں تو الگ تھلگ ہی رہتی تھی۔ خود کو اور قید کر لوں گی۔“ وہ پھر سسکنے لگی تو دلشاد بیگم کا کیجہ بل گیا۔
 ”یہ نہیں سمجھیں گے تیرے دکھ کو۔ مجھ سے پوچھ تجھے بیاہ کر کتنا بچھتاؤں ہوں۔“ وہ بیٹی کو گلے لگا کر دلا سے دے رہی تھیں۔

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں جب طارق کمرے میں آیا۔ حورا بھی تک جاگ رہی تھی۔ وہ سونا چاہتی تھی لیکن ایک انجانی سی بے چینی اسے سونے نہیں دے رہی تھی اور وہ بے چینی کیوں نہ ہوتی۔ آخر اس گھر میں اسے دوسرا دن تھا لیکن جس کے توسط سے اس گھر میں آئی تھی اس کی طرف سے محبت و اپنائیت کا کوئی احساس نہیں ملا تھا۔ لاکھ بولڈ تھی لیکن جذبات تو وہ بھی رکھتی تھی۔ جس شخص کو وہ بچپن سے چاہتی تھی اس کی ہو کر بھی ادھوری تھی۔

طارق نے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ پھر صوفے پہ بیٹھ کر اپنے جوتے اتارنے لگا۔ حور چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

”تم سوئیں نہیں ابھی تک؟“

حور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

طارق نے جوتے اتارے پھر موزے۔ اس کے بعد کوٹ اتار کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی اور آنکھیں موند لیں۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔

”میرے مسائل بہت گکمبیر ہیں حورا!“ وہ تھکے تھکے سے انداز میں بولا۔

”میں تمہیں وہ خوشیاں نہیں دے سکوں گا جو تمہارا حق ہے۔“ اس کے بعد بہت دیر تک خاموشی رہی۔

شاید اس کی سماعتیں حور کی طرف سے کسی دلا سے کی منتی تھیں۔

لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو خود ہی کہنے لگا۔

”دل آپا ایک نفسیاتی کیس بن چکی ہیں۔ پتا نہیں اس کا ذمہ دار کون ہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں وہ بچپن سے ہی نفسیاتی مریضہ تھیں۔ میں جانتا ہوں بچپن سے انہیں وہم کا مرض تھا۔ وہ بار بار ہاتھ دھوتی تھیں۔ نہانے جاتی تھیں تو گھٹنوں ہاتھ روم میں بند رہتیں۔ ماما بھی اس چیز کا نوٹس نہیں لیتی تھیں۔ لیکن۔۔۔ بابا دل آپا کی حرکتوں کا نوٹس لیا کرتے تھے۔ وہ الگ تھلگ کیوں رہتی ہے۔ اسے صفائی کا اتنا کر بڑ کیوں ہے۔ وہ عام بچوں کے ساتھ کیوں نہیں ہلکتی۔ دل آپا، بہت ہی کم گو تھیں وہ بابا سے کبھی فرمائش نہیں کرتی تھیں لیکن بابا انہیں ہمیشہ سب پہ فوقیت دیتے تھے۔ اور دل آپا کو اس چیز کی عادت پڑ گئی۔ یعنی سہاروں کی عادت۔ بابا ہر دم انہیں سپورٹ کرتے تھے۔ جائز و ناجائز۔۔۔ اگر میں یہ کہوں کہ بابا سب سے زیادہ دل آویز کو چاہتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس محبت اور توجہ کو اب شیر نہیں کر پاتیں۔ سو نہیں۔۔۔“

طارق نے یہ کہہ کر آنکھیں کھولیں اور سیدھا ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ حور سر اپا سماعت بنی اسے سن

والی اور اسے سننا بھی چاہیے تھا۔ یہ باتیں کوئی معمولی اور عام نہیں تھیں۔ لیکن طارق یہ دیکھ کر دنگ لایا۔ وہ تو مزے سے سو رہی تھی۔



دل آویز بستر پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ آج اگر اس میں بھی حور جتنا اعتماد ہوتا تو وہ یہاں نہ بڑی۔ تین سال میں دو بچے تو اس کے بھی ہو ہی جاتے۔ تب زندگی کیسی مختلف ہوتی۔ بچوں کے تصور میں اسے ایک دم کراہیت کا احساس ہوا۔ وہ جھکتے بے اٹھ بیٹھی اور نادیدہ اشیاء کو خود پر سے جھاڑنے لگی۔

بچے۔ کلثوم کے بچے بھی تو بچے ہی تھے۔۔۔ وہ ایک پل بھی برداشت نہیں کرتی تھی انہیں۔ وہ تین پکھلتے پکھلتے اس کے پیڈ پے چڑھ جاتے۔ کسی کی ناک بہہ رہی ہوتی تو کسی کی پیٹی گیلی ہوتی۔ کلثوم ابا باتوں کی پرواہ ہی نہیں کرتی تھی۔ اس نے تو بس پیدا کر کے انہیں چھوڑ دیا تھا۔

”دیکھو۔ تم لوگوں نے بستر کی ساری چادر خراب کر دی ہے۔“

اس نے اپنی بیڈ شیٹ کا حشر نشر ہوتے دیکھا تو برداشت نہ کر سکی۔

”آپ کو تو ہمارا کمرے میں آنا ہی برا لگتا ہے۔“ دس سالہ تنزیل بدتمیزی سے بولا۔

”میں ہمتی ہوں، نیچے اترتے ہو یا تمہاری امی کو بلاؤں؟“

”امی نے ہی تو ہمیں یہاں بھیجا ہے۔ وہ بازار گئی ہوئی ہیں شاپنگ کرنے۔ جب تک وہ نہیں آتیں، ہم یہیں رہیں گے۔“

نیل اور تنزیل نے نیکی اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے پہ پھینکا شروع کر دیے تھے۔

اس دھینگا شستی میں جو جو نے سو سو کر دی۔ حالانکہ جو جو تین برس کی ہونے والی تھی پھر بھی اسے اپنی تیز نہیں تھی۔

”جو جو نے سو سو کر دی۔ جو جو نے سو سو کر دی۔“ اس کے بڑے بہن بھائی چھلانگیں لگاتے ہوئے بیڈ سے اتر گئے۔

دل آویز کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔

”تیز نہیں ہے تمہیں۔ یہ تمہیں لوائٹ نظر آ رہا تھا۔ اب کون صاف کرے گا اسے۔ میرا دس ہزار کا میگزین ضائع کر دیا۔ جسے میں نے دس دن بھی استعمال نہیں کیا تھا۔“

مائی گاڈ! کن جنگلی لوگوں میں پھنس گئی ہوں۔“ تب ہی فون کی بیل پر اس نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف والدہ شاد بیگم تھیں۔

”کیا کر رہی ہو دل؟“

”کچھ نہیں ماما! بس اپنی قسمت پر رو رہی تھی۔“

”کیا ہوا؟ بتاؤ تو سہی؟“ دل آویز نے ساری روداد کہہ ڈالی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں کچھ بھی دھونے یا صاف کرنے کی۔ ایسا ہی پڑا رہنے دو۔ اس کی

ماں آجائے تو اس سے دھلوانا۔“
 ”مگر ماما! رمیض۔۔۔ وہ کبھی نہیں مانے گا۔ وہ مجھے ہی وہی کہہ کر بات ختم کر دے گا۔“
 ”اور تم اس کی باتیں سن لو گی۔ جیسا کہ ایک ماہ سے سختی آرہی ہو۔ کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ ان آفت کے پرکالہ بچوں نے تمہاری۔ نرا گندگی کا ڈھیر۔ اب تمہارے کمرے کو ٹوائلٹ بنالیں گے تب بھی برداشت کر لو گی تم۔“
 ”ہرگز نہیں ماما! آپ کو پتا ہے مجھے گندگی سے کتنی الرجی ہے۔ میں ایک کام کرنے سے پہلے دس بار ہاتھ دھوتی ہوں اور یہ کلثوم یہ گندے ہاتھوں سے کھانا بناتی ہے۔ مجھ سے تو دیکھ کر ہی برداشت نہیں ہوتا کھانا تو درکنار۔“

”تو تم خود بنالیا کرو اپنے لیے۔ کیوں تم کسی کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہو۔ یہ بات ہزار دفعہ تمہارے بابا اور میں بتا چکے ہیں تمہیں کہ اس گھر کی مالکین کلثوم نہیں تم ہو۔ یہ گھر تمہارے میاں کی کمائی پہ چل رہا ہے۔ کلثوم کی نہیں۔ وہ طلاق لے کر یہاں آئی بیٹھی ہے۔ کلثوم تو بوجھ ہے اس گھر پر۔ میں تو کتنی ہوں کوئی ایسا طریقہ اختیار کرو کہ اس کی یہاں سے چھٹی ہی ہو جائے۔ کب تک اس گندگی کے ڈھیر کو برداشت کرو گی تم۔“
 ”میرا خیال ہے ماما! کوئی آ رہا ہے۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔ پھر بات کر دوں گی۔“
 اس کے ساتھ ہی دل آویز نے فون بند کر دیا۔



کلثوم ہانپتی کانپتی شاپنگ بیگ اٹھائے دل آویز کے کمرے میں چلی آئی۔ اپنی چادر اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور شاپنگ بیگ بیڈ پر اچھال دیے۔
 ”ذرا ایک گلاس پانی تو پلانا۔ بہت تھک گئی ہوں صرف بچوں کے یونیفارم لینے گئی تھی۔ اسی میں دو گھنٹے لگ گئے۔“

دل آویز پانی پلانے کے بجائے کراہیت سے شاپنگ بیگز کو دیکھ رہی تھی۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ کھول کر دیکھ لو۔ یونیفارم لائی ہوں بچوں کے۔“ کلثوم استہزائیہ بولی۔
 ”میں تو یہ دیکھ رہی ہوں نیا کپڑا جو جو کے پیشاب میں کیسے بھیگ رہا ہے۔“
 ”اف خدا یا! جو جو یہاں پیشاب کر گئی۔ چلو خیر کوئی بات نہیں اس گدے کو الٹ دو۔“
 ”الٹ دوں؟“ دل آویز نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
 ”ہاں، ہاں پلٹ کر بچھالو۔“ کلثوم نے لاپرواہی سے کہا۔ پھر وہ اپنے شاپنگ بیگز اٹھاتے ہوئے بولی۔

”بچے تو ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ آج نہیں تو کل تمہارے بچوں نے بھی تو یہی کچھ کرنا ہے۔“
 ”میں اب اس پرسو جاؤں، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا آپ اسے دھو میں تب ہی یہ استعمال میں آسکتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ اتنے بھاری گدے کو میں اٹھا بھی نہیں سکتی، صوؤں گی تو بھلا کیا۔“ کلثوم کی حیرانی
 سن چکی تھی۔ ”مجھے لگتا ہے تمہیں ضرورت سے زیادہ ہی وہم کامرض لاحق ہے۔ سچ سچ بتاؤ میاں کے
 ساتھ تمہارا رویہ کیسا ہے؟“ یہ کہہ کر کلثوم ہنسنے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

”میاں کے ساتھ رویہ؟“ دل آویز کو بہت کچھ یاد آنے لگا۔
 پہلی بار رمیض اس کے نزدیک آیا تو اسے عجیب گراہیت سی محسوس ہوئی تھی اور اس کا دم گھٹنے لگا۔
 اس نے بہت چاہا کہ وہ اپنی اس کیفیت پر قابو پالے۔ لیکن اس کی ناپسندیدگی رمیض سے چھپی نہ رہ سکی۔
 ”کیا بات ہے تم اس طرح کیوں کر رہی ہو؟“ بالآخر رمیض پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔
 ”وہ، وہ بداصل میری۔۔۔ میری طبیعت شاید ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ اٹکتے جھکتے بتانے لگی تو رمیض

اس کی بات چٹ گئی۔
 ”یعنی تمہیں خود بھی اندازہ نہیں کہ تمہاری طبیعت صحیح ہے یا غلط۔ امیر باپ کی بیٹی ہونا۔ اس لیے
 بے دکھا رہی ہو۔ اگر آج تمہارے ان خروں میں آگیا تو سمجھو ساری عمر بس خروے اٹھاتے گزر جائے
 گی۔“

رمیض کی باتیں دل آویز کو بری لگ رہی تھیں۔
 لیکن وہ اسے کیسے بتاتی اس کی بے زاری سے رمیض بد دل ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے واش روم چلی
 گئی اور خود کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگی۔ اور پھر وہ تین گھنٹے کے بعد واش روم سے نکلی تھی۔
 تیسرے دن ہی رمیض کی برداشت نے جواب دے دیا۔
 ”آخر کیا وجہ ہے۔ جب میں تمہارے نزدیک آتا ہوں۔ جب ہی تمہاری طبیعت خراب ہونے
 لگتی ہے۔“

”ٹھیک طرح سے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟“ اس نے ڈپٹ کر پوچھا تو دل آویز مراسیمہ ہو گئی۔
 ”کہاں گم ہو جواب کیوں نہیں دیتیں؟“ رمیض نے اسے گم سم یا کر جھنجھوڑ ڈالا۔
 دل آویز رو پڑی پھر رمیض نے لاکھ چپ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ روٹی ہی رہی۔ رمیض
 نے یہ جا کر لیٹ گیا اور نہ جانے کب سو گیا۔
 اور پھر۔۔۔ دل آویز، ماں کے پہلو سے لگ کر بہت روئی وہ ماں کو بتانے پر مجبور ہو گئی کہ اس کے
 ساتھ مسئلہ کیا ہے۔

دل شاد معاملہ فہم خاتون نہیں تھیں۔ جو بیٹی کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتیں۔ انہوں نے یہی سمجھا
 کہ رمیض اس کے ساتھ نامناسب رویہ رکھتا ہے۔
 ”تم کو اب سسرال جانے کی ضرورت نہیں۔ یہیں رہو، رمیض آئے گا تو میں اسے سمجھاؤں گی،
 اسے اندازہ نہیں ہے کہ ہم نے تمہیں کس قدر ناز و نعم میں پالا ہے۔“

لیکن جب دلشاد نے بیٹی کو اپنے گھر میں رکھ لیا تو رمیض نے پھر ان کے گھر جھانکا تک نہیں۔
 انہوں نے رمیض کو روزانہ ڈنر پر انوائٹ کیا۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ وہ اور ہی مزاج کا مرد تھا۔ وہ شادی کے
 بندھن کو جی بھر کے انجوائے کرنا چاہتا تھا وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ انڈرا شیڈنگ کس چیز یا کا نام ہے۔

رمیض نے اپنے دوستوں سے سن رکھا تھا کہ امیر گھرانوں کی لڑکیاں اپنی ناز برداریوں کے لیے ایسے نازخراے کرتی ہیں۔

فطرتاً رمیض برا نہیں تھا۔ وہ اس بندھن کو نبھانا چاہتا تھا۔ لیکن جب اس نے دل آویز کا ایسا ہتک آمیز رویہ دیکھا تو سخت بددل ہو گیا۔

تب رمیض نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی یہ کہہ کر کہ اب وہ خود اس سے اپنے رویے کی معافی مانگے گی۔ تب یہ رشتہ استوار ہوگا۔

بھلا دل آویز ایسا کیونکر کرتی۔ اس کی تو ایک طرح سے جان ہی چھوٹ گئی تھی۔ لیکن بات رمیض کی حد تک نہیں تھی۔

دن بھر کلثوم کے بچے اس کے کمرے میں ہوتے۔ کوئی پردے سے ناک صاف کر رہا ہے تو کوئی اس کی بیڈ شیٹ کو گیلا کر رہا ہے کارپٹ کا تو حشر ہی ہو جاتا۔

ٹولکٹ بھی اسی کا استعمال ہوتا تھا اور وہ دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی۔

پھر ماں کو بتاتی۔۔۔ تو ماں اگلے سیدھے سبق پڑھاتیں۔

”انہیں کمرے سے بھگایا کرو۔ کلثوم سے دبنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رمیض سے کہو کہ وہ اپنی بہن کا علیحدہ بندوبست کرے۔“

اب وہ ماں کو کیا بتاتی کہ رمیض تو رات کو اس وقت آتا ہے جب وہ سوچکی ہوتی ہے اور صبح بھی اس کے اٹھنے سے پہلے گھر سے نکل جاتا ہے۔ اس نے آج تک رمیض سے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ وہ رات کو دیر سے کیوں آتا ہے۔ اسے رمیض سے ابھی تک کوئی لگاؤ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھی اس کا کوئی ذاتی کام بھی نہیں کرتی تھی۔

ابھی تک یہ سب کام کلثوم ہی کر رہی تھی۔

”رمیض اتنا غیر ذمہ دار نہیں تھا جتنا شادی کے بعد ہو گیا ہے۔ تمہاری موجودگی کے باوجود رمیض گھر سے باہر کیوں رہنے لگا ہے؟“ ایک دن کلثوم، دل آویز سے پوچھ رہی تھی۔

دل آویز چونک گئی۔ اسے اندازہ تھا کلثوم یہ سوال ضرور کرے گی۔

”مجھے کیا معلوم میں دو دن امی ابو کی طرف ہوتی ہوں تو دو دن یہاں۔ مجھے کیا معلوم کہ ان کی مصروفیت کیا ہے؟“ اس نے نظریں چرا کر کہا۔

کلثوم ہنس پڑی اور دل آویز کی طرف دیکھ کر بولی۔

”مجھے بتاؤ معاملہ کیا ہے؟“

”میری طرف سے تو کوئی معاملہ نہیں ہے۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا تو کلثوم حیران رہ گئی۔

اب کلثوم کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ تمام معاملات کا سنجیدگی سے جائزہ لے اور جب اس نے نوٹس لینا شروع کیا تو اچھے لگی۔ دل آویز میں عام لڑکیوں جیسی بات نہیں تھی۔ وہ اول تو ان لوگوں کے ساتھ کھانا نہیں کھاتی تھی۔ کھاتی بھی تو اپنی الماری سے اپنی ذاتی ڈزنیٹ کی پلیٹیں گلاس وغیرہ نکال کر لاتی پھر کھانا کھاتی۔ پھر انہیں خود دھو کر واپس رکھ دیتی۔ کلثوم سوچتی کہ وہ اپنی امارت کا رعب جھاڑ رہی

ہے۔ تو اگلے ہی پل کلثوم کو اس سوچ سے بھی دستبردار ہونا پڑتا جب دل آویز اپنے کمرے کی خود صفائی کرتی اور ملازمہ کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتی۔ وہ نہانے جاتی ہے تو تین گھنٹے سے پہلے ہاتھ روم سے نہیں نکلتی۔ کلثوم صرف میٹرک پاس تھی۔ اس کے باوجود اسے کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا کہ ضرور یہ کوئی نفسیاتی ایس ہے۔

”مگر نہیں اتنے دولت مند ماں باپ کی بیٹی اور ایسی حرکتیں کیا اس کے ماں باپ اس بات سے ناواقف تھے؟“

ایک روز کلثوم نے رمیض کو پکڑ لیا۔

”جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے۔ تمہارے اندر کوئی خوشی، کوئی امنگ نظر ہی نہیں آتی۔ اور تو اور تم نے گھر سے بھی باہر رہنا شروع کر دیا ہے۔ آخر معاملہ کیا ہے؟“ رمیض چپ رہا۔

”مجھے بتاؤ رمیض! آخر کیا گڑبڑ ہے۔ کیا دل آویز تمہیں پسند نہیں آتی؟ بظاہر اس میں ناپسندیدگی الی تو کوئی بات نہیں۔“

رمیض اب بھی خاموش رہا۔

”کیا وہ تمہیں ناپسند کرتی ہے؟“ کلثوم نے آخر وہ بات پوچھ ہی لی جو اس کے دل میں کھٹک رہی تھی۔

رمیض کے دل کا نسا چبھا۔

”ہاں۔۔۔!“ سنائے میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اس نے بہن کے سامنے اعتراف کر لیا۔

”کیا مطلب ہے اور تم دست بردار ہو گئے؟“ کلثوم نے اسے جھنجھوڑا لیا۔

”مت کریں مجھ سے یہ سوال۔“ رمیض پھٹ پڑا۔ کلثوم بھائی کا چہرہ دیکھ کر حق دق رہ گئی۔

”گویا میری زندگی کی طرح تمہاری زندگی بھی برباد ہو گئی۔“

اور یہ الفاظ دل آویز نے اپنے کانوں سے سنے تھے۔

”رمیض! تم بولتے کیوں نہیں۔ تم ایسے تو نہیں تھے۔ کیوں گونگے بہرے ہو گئے ہو اگر تم اس سے شش نہیں ہو تو۔۔۔“ کلثوم چیخ پڑی۔

رمیض نے ہاتھ اٹھا کر کلثوم کو چپ کرادیا۔ سامنے سے دل آویز آرہی تھی۔

”کلثوم آپا! میں نہیں چاہتا کہ کوئی اپنی غلطی چھپانے کے لیے تمہیں نشانہ بنائے۔“ یہ کہہ کر رمیض

اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پھر کیا تھا۔ دل آویز، کلثوم کو پھانس کی طرح چبھنے لگی۔ اٹھتے بیٹھتے اس پہ طنز کرنے سے وہ باز نہ

آتی۔

دوسری طرف رمیض کے دوست رمیض کی جان کو آ رہے تھے۔ کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ۔ رمیض

اندر ہی اندر الجھنے لگا۔ دل آویز ماں کو سارے حالات بتاتی رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کے دل کا بوجھ

ماکانیں ہوتا تھا۔

زندگی کی کہانی سلجھتی ہی نہیں تھی۔

اور پھر رخصت اپنی انا کو بالائے طاق رکھ کر خود ہی دل آویز کی طرف بڑھا تھا لیکن دل آویز کا وہی
 ملک اور دنیا ملنا رو یہ تھا۔

اور بالآخر وہ ہو گیا جو رخصت نہیں چاہتا تھا ایک دن۔

پیش میں آ کر رخصت نے اس کو پھڑ مار دیا۔ یہ بات معمولی نہیں تھی۔ دل آویز ایک لمحے کو اب
 یہاں رکے کو تیار نہیں تھی۔ اور اس نے ماں کو فون بھی کر دیا تھا۔
 دلشاد بیگم کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا وہ اپنی بیٹی کو لینے گئیں تو رخصت نے دل آویز کو
 بھیجنے سے انکار کر دیا۔

دلشاد بیگم کو اس صاف جواب کی امید ہی نہ تھی۔ دلشاد بیگم گھر تو آ گئیں مگر رو کر گھر سر پہ اٹھالیا۔
 ابراہیم صاحب کے لیے بھی یہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا کہ ان کی لاڈلی جہتی بیٹی کے ساتھ سسرال
 میں ایسی بدسلوکی ہو رہی تھی اور شوہر مارنے بھی لگا تھا ان سے رہا نہ گیا۔ وہ بیٹی کو لینے کے لیے خود آ گئے۔
 اور وہاں آ کر ابراہیم صاحب نے داماد کے منہ سے جو لفظ سنے تو ان کی گردن جھک گئی۔ انہیں لگا
 جیسے ان کی سماعتیں سن ہو گئی ہوں۔ جب رخصت نے کہا۔

”آپ کی بیٹی دودھ پیتی بچی نہیں تھی جو اسے شادی شدہ زندگی کے معاملات کا پتا نہ ہو۔ اگر وہ اتنی
 ہی کم عقل تھی تو اسے اپنے پاس سنبھال کر رکھنا تھا۔ کیوں میری زندگی برباد کی۔ جب اسے اس بات کا
 شعور آ جائے اسے میرے پاس بھیج دیجیے گا ورنہ میری بہن میری دوسری شادی کا بندوبست کر رہی
 ہے۔“

ابراہیم صاحب کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی بیٹی میں تو جو نقص ہے وہ ہے۔ داماد بھی
 باشعور اور سلیکھا ہوا نہیں ہے۔ جو اپنی بیوی کی کمزوری کو اس طرح اچھال رہا ہے۔ سب سے زیادہ ابراہیم
 صاحب کو اپنی بیوی پر افسوس تھا۔ چھ ماہ سے وہ تو ان حالات سے واقف تھیں۔ پھر کیوں نہ وہ ان حالات
 کو کنٹرول کر سکیں۔

دل آویز گھر کو آ چکی تھی۔ گھر میں خاموشی طاری تھی۔ ہر ایک دوسرے سے بدظن تھا۔ دلشاد بیگم،
 ابراہیم صاحب سے بدظن تھیں کہ شادی کا فیصلہ ان کا تھا۔

اور ابراہیم ان سے بدظن تھے انہوں نے انہیں آگاہ کیوں نہیں کیا۔

دل آویز اپنی کمزوری کے باوجود ماں اور باپ دونوں سے ہی بدظن تھی۔

کئی دن بعد یہ خاموشی جب ٹوٹی جب ابراہیم صاحب نے بیٹی کو ساریکا ٹرسٹ کو دکھانے کا ارادہ
 ظاہر کیا تھا۔

اس فیصلے سے دلشاد بیگم کو سخت تکلیف ہوئی۔

”ایک وقت تھا جب تم نے مجھے بھی نفسیاتی مریضہ قرار دے دیا تھا حالانکہ مجھے ان حالات تک
 پہنچانے والی تمہاری ماں بھی جنہوں نے مجھے اچھوت بنا دیا تھا۔ جو اپنے پانی کے گھرے کو بھی ہاتھ لگانے
 نہیں دیتی تھیں آج تمہیں بنی پاگل نظر آرہی ہے۔“

اور جب ڈاکٹر سمجھوتہ نے دل آویز کی مکمل ہسٹری سنی۔ اس سے چند سوالات کیے تو انہوں نے

بی ال اٹھایا۔

”دیکھیں، بچے کی جو غیر معمولی حرکات ہوتی ہیں۔ ان سے سب سے پہلے ماں آگاہ ہوتی ہے اور ماتیں مسلسل ایک ہی عمل کو دہرانے کا نام ہیں جو رفتہ رفتہ ہمارے شخصیت کا حصہ بنتی جاتی ہیں۔ اگر بچی بچپن سے ہی بہت سی چیزوں سے الگ رہے تو یہ بات آپ لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔“

ابراہیم صاحب نے بیوی کی طرف دیکھا مجبوراً دیکھ کر ہی بولنا پڑا۔

”میں نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ یہ کن چیزوں سے الگ رہے۔ ہاں البتہ یہ بچپن سے ہی الگ رہنے کی عادی تھی۔ کم گو ہونے کی وجہ سے اس کی کسی سے دوستی بھی نہیں تھی۔ یہ اپنے بہن بھائیوں سے چونکہ بڑی بھی تھی۔ اس لیے ان کے ساتھ بھی زیادہ کھیل کود پسند نہیں کرتی تھی۔ اور سچ پوچھیں تو مجھے اس کی یہ سب عادتیں اچھی لگتی تھیں کہ اس نے مجھے بچپن سے لے کر اب تک بالکل نہیں ستایا اور اسی وجہ سے ہمارے دل میں اس کی خاص جگہ ہے۔“

ڈاکٹر مسیح ان کی بات کو بغور سن رہے تھے آخر میں ٹھوڑا سا مسکرائے۔

”کیا آپ کے باقی سب بچوں میں بھی ایسی ہی عادتیں ہیں؟“

”نہیں، ہمارے دوسرے بچے ویسے ہی ہیں جیسے نارٹل بچے ہوتے ہیں۔ لیکن دل آویز بچپن سے ہی محتاط رہا کرتی تھی۔ یہ اپنی صفائی کا کبھی بہت دھیان رکھتی تھی اور۔۔۔“ یہ کہتے کہتے ابراہیم صاحب خاموش ہو گئے۔

”جی ہاں بتائے اور کیا؟“

”ڈاکٹر صاحب! مجھے ایک بات کھٹکتی تھی۔ جب دل آویز نہانے جاتی تھی تو بہت وقت لگاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ یہ بار بار ہاتھ بھی دھویا کرتی تھی اور یہ بات میں اپنی مسز سے بھی کہا کرتا تھا۔ پھر دیگر بچوں میں الجھ کر ہم نے اس بات پر دھیان دینا چھوڑ دیا۔“

”کیا آپ کی اب بھی یہی عادت ہے؟“ ڈاکٹر مسیح نے دل آویز کی طرف دیکھا۔

دل آویز نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”کیا آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ صاف نہیں ہوئیں اور اسی وجہ سے آپ ہاتھ دھونے کا عمل

بھی دہراتی رہتی ہیں۔“

”پتا نہیں ڈاکٹر صاحب! لیکن اب یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ نہ کروں تو بے چینی سی محسوس

ہوتی رہتی۔“

دل آویز کے اعتراف پہ ڈاکٹر مسیح نے ابراہیم اور دلشاد بیگم کی طرف دیکھا۔

”بظاہر آپ خوش حال خاتون لگتی ہیں۔ لیکن پھر بھی ہویگنسنسی میں کسی دباؤ، کسی ذہنی ٹینشن میں تو مبتلا نہیں تھیں آپ؟“

ڈاکٹر مسیح کا یہ سوال کرنا تھا اور دلشاد بیگم کی نظروں میں اپنے ماضی کی فلم چل پڑی۔



کیسا وقت تھا وہ جب انہیں محض بائیس ہاتھ سے کام کرنے کی سزا میں علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ ان کے برتن ان کا سب کچھ، بالکل الگ تھلگ ہو کر رہ گئی تھیں وہ۔

حالانکہ یہ کوئی بڑی خرابی نہیں تھی۔ اماں جی چاہتی تو اس بات کو نظر انداز بھی کر سکتی تھیں۔ ابراہیم صاحب، ماں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے کہ اماں جی گوارہ نہیں کرتی تھیں کہ وہ اپنی بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائیں اور ابراہیم صاحب نے کبھی اس بات پر احتجاج نہیں کیا۔

اس دوران ابراہیم صاحب کا کاروبار زوال پذیر ہونے لگا تو اماں جی نے برملا کہنا شروع کر دیا۔ ”بھوکا پاؤں اچھا ثابت نہیں ہوا۔“ دلشاد بیگم گھٹ کر رہ گئیں۔

یا تو تنہائی میں وقت گزرتا یا والدین کے گھر۔ اس دوران دل آویز پیدا ہوئی۔

دلشاد بیگم کے ساتھ سسرال میں بدسلوکی کی وجہ سے ان کے گھر والوں کا رویہ ان کی بچی کے ساتھ کھنچا کھنچا سا رہتا۔ خصوصاً ان کی ماں، دل آویز کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ بیٹی کو وہ دل جان سے اپنے ہاں رکھتیں لیکن نواسی انہیں کانٹے کی طرح چبھتی وہ برملا کہتیں یہ اپنی دادی جیسی ہے اپنی بچی کے ساتھ میکے والوں کے رویہ پر دلشاد بیگم زیادہ تر سسرال میں ہی رہنے لگیں۔ دل آویز، ابراہیم صاحب کی پہلی اولاد تھی۔ اس لیے دادی اسے اپنے پاس رکھا کرتیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتیں اور دلشاد کو بار بار ٹوکتی رہتیں کہ اسے کبھی اٹنے ہاتھ سے کھانا نہ کھلائے۔

پھر جلد ہی دلشاد دوبارہ امید سے ہو گئیں۔ دل آویز مستقل دادی کے پاس رہنے لگی۔ بار بار کی روک ٹوک کی وجہ سے دل آویز ڈری سہمی سی رہا کرتی تھی۔

کیونکہ اماں جی بھی وقت کے ساتھ ساتھ ذرا چڑچڑی ہو گئی تھیں۔ ان ہی دنوں دلشاد بیگم کا پانچ ماہ کا حمل ضائع ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ چار پائی سے لگ کر رہ گئیں۔ تب ابراہیم صاحب نے دلشاد کی طرف توجہ دینا شروع کی تھی۔

وقت گزر رہا تھا۔ دل آویز نے چلنا، بولنا، کھانا پینا سیکھ لیا تھا۔ اب دلشاد کے بیٹی کی وجہ سے اماں جی سے تعلقات استوار ہو رہے تھے۔ دل آویز کے بعد جلد ہی طارق بھی آ گیا۔ پوتے کی ولادت پہ اماں جی کی خوشی دوچند ہو گئی تھی۔

طارق کے بعد دلشاد کی صحت گری گری رہتی تھی جس کی وجہ سے ان کی توجہ بیٹی پہ نہ تھی۔

اسی دوران اسماعیل کی بھی شادی ہو گئی۔ گھر میں دوسری بہو آ گئی۔ شازیہ نے گھر میں آتے ہی اپنی جگہ بنالی۔ وہ اماں جی کے دل سے لے کر گھر بھر میں چھا گئی۔ دلشاد بڑی بہو ہوتے ہوئے بھی وہ حیثیت نہ پاسکیں جو شازیہ کے حصے میں آئی۔ اس وجہ سے سب سے زیادہ جلن اور کھنچاؤ کا شکار دلشاد رہا کرتیں ان حالات کو دیکھتے ہوئے ابراہیم صاحب نے خاموشی سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ دلشاد کے ساتھ اماں جی کا رویہ ٹھیک نہیں تھا اور اسی وجہ سے دلشاد کی صحت بھی متاثر ہوئی تھی۔ انہوں نے علیحدہ رہائش اختیار کر لی۔

اپنا گھر اپنی راج دھانی پا کر دلشاد بہت خوش تھیں۔ لیکن اس خوشی کو پاتے پاتے انہوں نے کیا کچھ کھویا تھا انہیں آج وقت گزر جانے کے بعد احساس ہو رہا تھا۔



ابراہیم صاحب بیوی اور بیٹی کے ہمراہ ڈاکٹر کے ہاں سے واپسی پر سوچوں میں ڈوبے تھے انہیں اس ہور با تھا ان سے منتی کوتاہیاں ہوئی ہیں اپنے مسائل میں الجھ کر ان کو یہ بھی ہوش نہیں رہتا کہ بچے کی مائتوں کو پناہ ہے ہیں۔ وہ عادتیں درست بھی ہیں یا نہیں۔

”کیا سوچ رہی ہوں دل آویز؟“ تادیر خاموشی کے بعد دلشاد بیگم نے بیٹی سے کہا۔
”کچھ نہیں ماما۔۔۔ سوچ رہی ہوں کیا مجھے سائیکل ٹرسٹ کے پاس بہت پہلے چلا جانا چاہیے تھا اگر

اے جاتا تو کیا میری زندگی میں مسائل نہ آتے۔“
دلشاد نے تڑپ کر بیٹی کا سراپے سینے سے لگا لیا۔
”تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو کہ تم بیمار ہو اور تمہیں واقعی کسی نفسیاتی معالج کی ضرورت تھی۔ یہ تو ہم

اب اس یونیورسٹی میں یہاں لے آئے تھے۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔ ہے نا ابراہیم! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟“

دلشاد نے ابراہیم کو خاموش پا کر متوجہ کیا۔
”ہوں!“ ابراہیم صاحب کی ہوں توقف کے بعد ابھری جو سوچوں سے بوجھل ہو رہی تھی۔
”اچھا بات سنیں۔۔۔ یہیں کسی اچھے سے ہوٹل میں چلتے ہیں۔ آج ذرا اور کافی باہر ہی پیٹے ہیں کیوں

اے آویز؟“ دلشاد نے مسکراتے ہوئے بیٹی کی طرف دیکھا تو دل آویز نے برا سامنہ بنالیا۔
”نہیں ماما۔۔۔ آپ کو پتا ہے۔ میں ابھی بھی ہوٹلنگ پسند نہیں کرتی۔ میں نے تو ابھی گھر میں آئے
وے ہوٹل کا کھانا نہیں کھایا۔ نہ جانے کیسے کیسے گندے ہاتھ یہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔“

دلشاد بیگم اور ابراہیم کو یک دم دھچکا سا لگا تھا۔
یہ کچھ نہ تو نہیں تھا طارق یا ولید بھی سوپ، فرائی فش، رائس یا کچھ اور لے آتے سوائے اس کے
بہی چکھ لیتے تھے۔ صرف وہی ناک منہ چڑھاتی اور کہہ بھی دیتی تھی۔
”معلوم نہیں تم لوگ اسے کیسے کھاتے ہو۔۔۔ مجھے تو دیکھ کر ہی کراہیت آتی ہے۔“ تب ہی اگر

ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا نوٹس لیا جاتا تو آج یہ مسئلہ اتنا بڑا نہ ہوتا۔
ابراہیم صاحب اور دلشاد بیگم دل ہی دل میں یکساں سوچ میں گھرے ہوئے تھے۔
”اگر آپ لوگوں نے ذکر کرنا ہے تو آپ لوگ چلے جائیں۔ اتنے میں، میں تھوڑا سا میوزک سن

اے لی۔ ویسے بھی مجھے بھوک تو ہے نہیں۔ گھر جا کر دودھ کا ایک گلاس ہی پیوں گی۔“
دل آویز نے ماں باپ کو گم غم پا کر ٹوکا تو ابراہیم صاحب کو بولنا ہی پڑا۔
”تم چڑیا جتنا کھانا کھاتی ہو۔ جب ہی تمہاری صحت اتنی کمزور ہے اور دلشین تم سے بڑی لگنے لگی

۔۔۔“
”فارگا ڈسک بابا! آپ کو اچانک میری صحت کی فکر کیوں ہو گئی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں ایک دم
نہیں دل آویز! تم ٹھیک نہیں ہو۔ اچھی صحت اچھی سوچ کے باعث ہوتی ہے۔ دراصل ہم نے

تہااری سخت پہ ہی توجہ نہیں دی۔ ورنہ آج تم ایسی نہ ہوتیں۔“
 ”کیا مطلب ہے بابا! میں کیسی نہ ہوتی؟ کیا کی ہے مجھ میں؟ کیا میں اینارٹل میں۔ کم شکل ہوں؟ کم تعلیم یافتہ ہوں؟ ذہنی مریضہ ہوں کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“ دل آویز یک دم چڑ گئی۔
 ”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ ابراہیم صاحب نے رمان سے سمجھانا چاہا۔
 ”آپ کا مطلب یہی تھا جب ہی تو آپ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔“
 ”لیکن، ڈاکٹر نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی۔“ ابراہیم صاحب نے بیٹی کو بکھرتا دیکھ کر بہانا چاہا۔
 ”ڈاکٹر نے ایسی بات نہیں کی تو وہ مریض کیوں کرتا تھا۔ کیوں مجھے وہی کہتا تھا۔ کیوں مجھے زچ کرتا تھا ان باتوں سے جن سے مجھے نفرت تھی۔ یہ میری زندگی ہے میں جیسے مرضی چاہوں جیوں۔ کسی کو کوئی اختیار نہیں میری زندگی ہے جبر کرنے کا اور اس جبر کی ابتدا آپ نے کی۔ مجھے اس جاہل کے پلے باندھ دیا جو عورت کی عزت کرنا نہیں جانتا۔ میری زندگی برباد کر دی ہے آپ لوگوں نے۔“ یہ کہتے کہتے دل آویز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



دروازے پہ ٹھک ٹھک ہو رہی تھی۔ جب دل آویز کو آنسو اپنے گالوں پہ بہتے محسوس ہوئے۔ نہ جانے کب سے دروازہ بج رہا تھا اور وہ خیالات کی یورش میں اتنی بہہ گئی تھی کہ اسے وقت کا بھی پتا نہ چلا۔
 دل آویز نے آنسو صاف کیے اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ملازمہ کھڑی تھی۔
 ”دل آویز بی بی! آپ کو بڑی نیگم صاحب بلا رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کھالیں آکر۔“

دل آویز نے اچھٹی سی نگاہ ملازمہ پہ ڈالی۔ پھر واپس اپنے بستر میں آ گئی۔
 ”ان سے کہو مجھے بھوک نہیں ہے اور ہاں ذرا ہیٹر جلاتی جانا۔ ٹھنڈ بہت ہو رہی ہے اور یہ جگ میں پانی بھی گدلا ہو رہا ہے۔ ہاتھ دھو کر اس جگ کو بھی اچھی طرح صاف کر کے پانی رکھ جانا۔“
 یہ کہہ کر دل آویز نے لحاف منہ پہ ڈال لیا۔ ملازمہ کمرے میں آ گئی پہلے اس نے ہیٹر آن کیا۔ پھر ہلکے دھوکے پانی بھر لائی۔ پھر شش و پنج میں کھڑی رہی پھر ہمت کر کے بول پڑی۔
 ”دل آویز بی بی!“

دل آویز نے منہ پہ سے لحاف ہٹایا۔
 ”ایک بات کہوں آپ سے۔ آپ اس طرح کب تک بھوکی پیاسی رہ کر زندگی گزاریں گی۔ اس کمبخت نے آپ کی قدر نہیں کی تو اس کا مطلب ہے آپ اپنی جان کو یوں ہلکان کریں گی؟“
 ”تم سے کس نے کہا ہے کہ میں اس کے تم میں ایسا کر رہی ہوں؟“ دل آویز کا لہجہ ترش تھا۔
 ملازمہ گڑ بڑا گئی۔

”نہ جی، مجھے کون کہے گا۔ مجھے تو آپ کی حالت پہ خود ہی ترس آتا ہے۔“ دل آویز نے چبھتی ہوئی نگاہیں ملازمہ پہ جمادیں۔

”تم کون ہوتی ہو مجھ پہ ترس کھانے والی؟“
 ”نہ بی بی جی! تو یہ تو یہ میں بھلا کی کہیں آپ پہ ترس کی باتیں کروں۔ وہ تو جی مجھے آپ سے اور
 لاشیں بی بی سے دلی لگاؤ ہو گیا ہے۔ اس لیے بول بھی پڑتی ہوں۔ گناہ گار زبان ہے ناجی اس لیے پھسل
 جی جاتی ہے۔ ویسے ایک بات کہوں۔ اپنی نئی ٹوبلی بھادج کو دیکھیں دودن ہوئے ہیں اس گھر میں
 رہتے ہوئے اور کیسے دندنائی پھر رہی ہے۔ جیسے برسوں سے اسی گھر میں رہ رہی ہو۔“
 ”ہو گئی تمہاری بکواس ختم؟“
 ”جی، جی!“ ملازمہ کے لب سل گئے۔
 ”اب تم جاسکتی ہو۔“ ملازمہ کے جانے کے بعد دل آویز نے اپنا سر تھام لیا۔



طارق لاؤنج سے گزر رہا تھا کہ دلنشین کو فون پہ مچو پا کر اس کے قدم رک گئے۔
 آج کلیا وہ دلنشین میں بہت سی تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا۔ خصوصاً فون پہ مصروفیت تو اس کی کچھ
 زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ بحس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ پردے کے پیچھے کھڑا رہا۔
 دلنشین اتنی منہمک تھی کہ اس نے کسی کی آہٹ محسوس ہی نہیں کی۔
 ”دیکھو بات یہ ہے۔ اس روز جو کچھ بھی ہو اس میں سراسر عامر کا قصور تھا۔ اسے تو اپنے رویے پہ
 ذرا بھی ندامت نہیں ہوئی اور تم تھے کہ ندا سے معافیاں مانگتے چلے گئے۔“
 ”ہاں مجھے برا لگا۔ تمہیں اچھی طرح پتا ہے ندا کتنی پراؤڈ لڑکی ہے۔ اس نے صرف مجھے زچ
 کرنے کے لیے تمہیں بچا دکھایا ہے۔“
 ”راجیل تم نہیں سمجھ سکتے اس بات کو۔ لیکن میں تمہیں وارن کر رہی ہوں۔ آئندہ تم ندا سے دوستی
 نہیں رکھو گے۔“
 ”فارگاڈ سبک، تمہیں پتا ہے اپنے گروپ میں کسی طرح اترا اتر کر تمہیں ذلیل کیا ہے اس نے؟“
 ”اس بات کی تکلیف سب سے زیادہ مجھے ہو رہی تھی۔ اچھی طرح جانتی ہے وہ۔“
 ”ہاں سب جانتے ہیں کہ میں تمہارے لیے حساس ہو جاتی ہوں۔“ دلنشین کا لہجہ دھیمّا اور معنی خیز
 تھا۔ پھر وہ ہلکلا کر ہنس پڑی۔

”یعنی میرے منہ سے مننا چاہتے ہو تم۔۔۔؟ بانی داوے اتنے نادان تو تم بھی نہیں ہو۔“ یہ کہہ
 کر دلنشین پھر ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں شرارت تھی۔
 طارق پردے کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دوسرے صوفے پر جا
 کر بیٹھ گیا۔

دلنشین نے طارق کو دیکھ کر بات مختصر کرتے ہوئے فون بند کر دیا اور چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے
 میں چلی گئی۔ طارق تذبذب میں بیٹھا رہا کہ کیا کرے۔
 ماں اور باپ کی توجہ دلنشین اور ممیز پہ بالکل بھی نہیں تھی۔ ولید کو وہ ایک طرح سے اپنے ہاتھوں

سے کھو چکے تھے۔ معیز بظاہر ماں باپ کے سامنے جی حضوری کرتا رہتا لیکن درپردہ وہ اس کے حالات بھی ٹھیک نہیں تھے۔

طارق اس کے دوستوں سے مل چکا تھا اور معیز کو برا بھلا بھی کہہ چکا تھا جس کا اثر یہ ہوا تھا کہ اس نے طارق کے سامنے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

طارق کچھ سوچتے ہوئے دلنشین کے کمرے میں آ گیا۔ دلنشین یونیورسٹی جانے کے لیے اپنے کپڑے پر لیس کر رہی تھی۔

”آج کوئی خاص فنکشن ہے یونیورسٹی میں، جو خاص تیاری ہو رہی ہے؟“ اس کے لباس کی طرف دیکھتے ہوئے طارق نے ملائمت سے پوچھا تھا۔

دلنشین نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا کر ہنستے ہوئے بولی۔

”آج صبح میرے کمرے میں آنے کی کوئی خاص وجہ ہے کیا؟“

وہ پہلے ہی یہ بات محسوس کر چکا تھا جب سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ دلنشین اس کی پہلے کی طرح عزت نہیں گرتی تھی۔

”کیوں کیا میں پہلے تمہارے کمرے میں کسی خاص وجہ کے تحت آتا تھا؟“ طارق مسکراتے ہوئے بیٹھ گیا۔

اس کے بیٹھنے پر دلنشین کو سنجیدہ ہونا پڑا۔

”طارق بھائی! کوئی کام تھا مجھ سے؟“

”کام تو میں تم سے پہلے بھی نہیں کرواتا تھا۔ ہاں البتہ ضروری بات ضرور کرنی ہے۔ میں نے ابھی تمہاری فون پر گفتگو کی تھی۔“ یہ کہہ کر طارق نے ذرا توقف کیا پھر دلنشین کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ بات شاید میں نظر انداز کر بھی دیتا۔ لیکن کچھ دن سے میں تمہارے اندر غیر معمولی تبدیلیاں محسوس کر رہا ہوں۔ جب گھر کی گاڑی اور ڈرائیور تمہیں پک اینڈ ڈراپ کرتے ہیں تو اس کے باوجود تم اپنی دوستوں کے ساتھ کیوں آتی ہو؟“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ دلنشین انجان بن کر بولی۔

”کبھی کبھار میرے پریذرفری ہوتے ہیں۔ تب میں اپنی دوستوں کے ساتھ آ جاتی ہوں۔“

”جانتا ہوں، لیکن فی میل دوستوں کے ساتھ آنا جانا اور بات ہے اور میل دوستوں کے ساتھ آنا جانا اور بات۔“

”فارگا ڈسک۔“ دلنشین نے گویا مذاق اڑایا۔

”جب میں کو ایجوکیشن میں تعلیم حاصل کر رہی ہوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے میرے دوست

میل ہوں یا فی میل۔“

”فرق پڑتا ہے۔ کیوں فرق نہیں پڑتا؟ ہم لوگ کتنا بھی ترقی پسند بن جائیں لیکن اپنی روایات سے انحراف نہیں کر سکتے۔“

”میں جانتی ہوں ان سب باتوں کو۔“ دلنشین کو جیسے اکتاہٹ محسوس ہوئی تھی۔

”اور ماما، بابا بھی جانتے ہیں سب کچھ انہوں نے مجھ پہ اعتماد کیا ہے میرے لیے یہی بہت ہے۔“
 ”ان کا اعتماد کرنا سب کچھ نہیں ہے۔ تمہارا اعتماد برقرار رکھنا سب کچھ ہے۔ لڑکوں سے اس طرح
 باتیں کرنا اور مراسم بڑھانا ہمارے خاندان کا شیوہ نہیں ہے۔ اگر تم نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو سمجھ لینا
 کہ پہلے ہی سال یونیورسٹی کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ کیونکہ ماما، بابا نے میری ہی سفارش پہ تمہیں یونیورسٹی
 ان کرنے کی اجازت دی تھی۔“
 یہ کہہ کر طارق کمرے سے نکل گیا اور دلنشین حق دق رہ گئی۔



”اضل میں بات یہ ہے کہ آپ سے بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“
 ”اچھا!“ حور العین، ولید کی بات پہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
 ”حالانکہ آج تک مجھے تو ایسا نہیں لگا کہ تم نے مجھ سے اپنے دکھ کھ شیر کیے ہوں۔“
 ”ارے بابا! دکھ تو دور کی بات ہے یہاں تو نازل بات چیت کے لیے بھی انسان نہیں ملتے۔“
 ”حالانکہ تم لوگ یعنی تم بہن بھائیوں کی عمروں میں بھی زیادہ فرق نہیں ہے۔“ حور العین نے تعجب
 سے کہا۔ ”اس کے باوجود بھی ہم لوگوں میں بے لطفی نہیں ہے۔ مل بیٹھ کر ایک دوسرے سے ہنسی مذاق
 کرنا، دکھ درد شیر کرنا یا کچھ اور۔۔۔ ایسا ماحول ہمارے گھر میں کبھی بنا ہی نہیں۔“
 ”اس کی کوئی خاص وجہ۔۔۔؟“ حور العین، ولید کے مقابل بیٹھ گئی۔
 ”دل آویز آپا شروع سے ہی الگ تھلگ رہنے کی عادی تھیں۔ رہی سہی کسر ان کی شادی نے پوری
 کر دی۔ ان کی شادی ناکام ثابت ہوئی۔ ایک تو کر لیا اور پر سے نیم چڑھا۔ طارق کو شروع سے ماما، بابا
 کی نظروں میں اچھا بننے کا شوق تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ ان کی چچہ گیری میں لگا رہتا تھا۔ مجھے اپنے دوست
 لہر سے باہر بنانا پڑے۔“
 ”یہ اور بات ہے کہ تمہیں سب ہی دوست لڑکیاں ملیں لڑکے نہیں۔“ حور نے گویا اس کا مذاق اڑایا
 تھا۔

ولید اس بات پہ دل کھول کر ہنسا۔
 ”لڑکے بھی دوست ہیں لیکن لڑکیوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں نا وجود زن سے ہے
 تسویر کائنات میں رنگ، بس انہی میں وقت گزر جاتا ہے۔“
 ”خیر سے کتنی ہیں؟“ حور نے چھیڑا۔
 ”یوں تو بہت ساری ہیں۔ مگر خاص دو تین ہی ہیں۔“
 ”دو تین یعنی ایک بھی خاص نہیں ہے۔“ اس نے جتایا تو ولید ہنسنے لگا۔ ”کیا تمہاری اس ہابی پہ لے
 نے نہیں ہوئی؟“ وہ یک دم سنجیدہ ہوئی۔
 ”روز مجھے گھر سے نکل جانے کا حکم ملتا تھا۔ لیکن اب یہ چھوڑ بھی کلوز ہو گیا۔ وہ اب کچھ نہیں کہتے۔
 وہ کہتے ہیں وہ میرے گرنے کی حد دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”اور تم گر کر دکھا رہے ہو؟“ حور نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”میں صرف اپنی من پسند زندگی گزار رہا ہوں۔ میں کسی دوسرے کی زندگی نہیں جی سکتا۔ زندگی کے چار دن ہیں اور بقیہ ولید کی بات پہ حور کے چہرے پہ ادا سی چھا گئی۔
 ”میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ زندگی کے چار دن ہیں اور بقیہ۔“
 ”لیکن شادی کے بعد آپ کا سارا جوش ختم ہو گیا۔ ہے نا؟ یہاں کی آب و ہوا ہی ایسی ہے۔ زندہ انسانوں کا سانس رکنے لگتا ہے۔“ ولید نے حور کی بات مکمل کی۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟ سچ بتائیں گی؟“ حور نے استفہامیہ نگاہ ڈالی۔
 ”طارق کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟“

حور ہنس پڑی۔ اس کے لیے یہ سوال غیر متوقع ہی نہیں دلچسپ بھی تھا۔
 ”تمہیں زیادہ اندازہ ہونا چاہیے۔ آخر آل وہ تمہارا بھائی ہے۔“

”ایک بات کہوں۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دن وہ خود پچھتائے گا۔ خیر چھوڑیں اس بوسیدہ موضوع کو چلیں میں آپ کو کہیں گھا پھرا کر لاتا ہوں۔ جو آپ کی من پسند جگہ ہو وہاں سے اُنس کریم کھا کر آتے ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھا تو حور نے چپکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر گھڑی کی طرف۔ شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

”میرا خیال ہے پھر بھی چلیں گے۔“ فی الحال اسے یہی جواب بن پڑا۔
 ”کیا مطلب؟ آپ کو میرے ساتھ جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے؟ برا سہی لیکن رشتوں کا احترام کرنا جانتا ہوں۔“

”ارے بھی تم میری بات کا غلط مطلب سمجھ۔ میرا مطلب تو صرف اتنا تھا کہ۔۔۔ کم از کم ماما سے تو پوچھنا پڑے گا اور وہ گھر پر نہیں ہیں۔“

”کم آن۔۔۔ اتنی سی بات تھی۔ آپ ایسا کریں۔ طارق سے فون پہ پوچھ لیں۔ پوچھنا بھی کیا ہے۔ بس اسے بتادیں کہ آپ میرے ساتھ ذرا باہر تک جا رہی ہیں۔ کتنے دن ہو گئے ہیں۔ اس کو خود تو اس بات کا خیال نہیں آیا شاید میرا اس کے خیال آجائے۔“

ولید کے کہنے پہ حور منہ کھولے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کیسے طارق سے پوچھ سکتی تھی۔ طارق اور اس کے درمیان ایسا رشتہ ہی کب بنا تھا۔ ابھی تک تو ڈھنگ سے بات چیت بھی نہیں ہوئی تھی۔ حقوق و فرائض تو درکنار۔

”کہاں کھو گئیں؟“ اسے متذبذب پا کر ولید نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ تو وہ کچھ کھسیانی سی ہو گئی۔

”بتائیں، یہ سب ٹھیک بھی ہے یا نہیں؟“
 ”گوا اندر سے آپ بھی وہی بودی، بے وقوف اور بزدل ہیں۔“ پھر یک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔
 ”میں تو آپ کو بہت مختلف لڑکی سمجھتا تھا۔ آئی مین، بولڈ اینڈ بریوٹ ہی تو آپ نے سلامی میں بابا سے

بے والا موبائل فون مانگا تھا۔ اگر آپ معمولی لڑکی ہوتیں تو سر سے ایک دم ایسی فرمائش نہ کرتیں۔“

نہ جانے ولید اس پر طنز کر رہا تھا یا اسے سراہ رہا تھا۔
”وہ میرے سر ہی نہیں ماموں بھی ہیں۔“ حور چیخی گئی تھی۔ نہ جانے ولید طنز کر رہا تھا یا اسے سراہ رہا تھا۔

حور کو بہر حال دھچکا لگا تھا۔
”گویا اس بات کو گھر میں سب نے برا سمجھا ہے۔“ شاید اسی لیے موبائل فون دیتے ہوئے طارق نے اس میں تھپتھپائی۔

”تم نے بابا سے موبائل فون کی فرمائش کی تھی؟“ وہ غصے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے قبل وہ کچھ بولتی وہ خود ہی بھڑک کر بول پڑا۔

”اپنی ضرورت کی اشیاء کی مجھے لسٹ بنا دینا۔ اپنی ضرورتوں کے لیے میں نے کبھی ماں باپ کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا ہے اور تمہاری لیے بھیک نہیں مانگوں گا۔“ اس کے الفاظ تھے کہ تیر۔ حور کی روح ابدلہاں ہو گئی۔

”میں نے کسی سے بھیک نہیں مانگی۔ ماموں ہیں وہ میرے۔“ وہ پھٹ پڑی تھی۔
”آواز کو نیچا رکھو۔ اگر تم بابا سے بیس لاکھ کی گاڑی مانگیں تو بھی وہ تمہیں انکار نہ کرتے۔ یہ تو صرف بیس ہزار کا موبائل سیٹ تھا۔“
طارق کی کنپٹیاں غصے سے سلگ رہی تھیں۔

”مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنی ضرورتوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر تم مجھ سے کیا جتانا چاہتی ہو؟“
”بس کریں پلیز بس کریں طارق!“ حور رو پڑی تھی۔ ”یہ سلامی کا تحفہ تھا۔ جو انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ فرمائش کر کے لوں۔“
”سلامی۔۔۔ ہا۔!“ طارق طنز یہ مسکرایا۔

”اگر ایسا کچھ معاملہ تھا تو انہوں نے خود زحمت کیوں نہیں کی، مجھے درمیان میں کیوں گھسیٹا۔ یہ تحفہ تھا تو وہ تمہیں اپنے ہاتھ سے دیتے۔ میرے ہاتھ کیوں بھجوا یا۔ صرف تمہاری نیچر مجھ سے ثابت کرنے کے لیے فارگ ڈسک۔“

طارق نے عالم طیش میں سر تھا مایا۔
”کیا تم اتنی نادان ہو۔ جس گھر میں تمہیں کسی نے خوش آمدید نہیں کہا۔ وہ لوگ تمہیں سلامی دینے کی جاہ میں بیٹھے ہوں گے؟ تم نے خود مانگ کر تحفہ لیا، کتنی گھٹیا ہو تم، یہی مسئلہ ہے تمہارا کہ تم معاملات کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتیں۔“

ولید نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ تو وہ چونک پڑی۔

”کہاں کھو گئیں بھابھی جان۔۔۔؟“
”کہیں نہیں۔ میرا خیال ہے۔ پھر کبھی چلیں گے۔“

”پھر کبھی نہیں۔ آج اور ابھی۔۔۔“

ولید نے ضد کرتے ہوئے حور کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ سامنے ہی دلنشین کھڑی تھی۔

وہ ولید کو حور کے کمرے میں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

”دلنشین! آؤ ٹنگ کے لیے جارہے ہیں ہم لوگ۔ تم چلو گی ہمارے ساتھ؟“ ولید لاپرواہ انداز

میں بولا۔

”آج کل کیا باہر کی دوستیاں ختم کر دیں۔ جو گھر میں نظر آنے لگے ہو۔“

دلنشین کی آنکھیں چھپتی ہوئی اور لہجہ معنی خیز تھا۔

”سب کچھ چلتا ہے۔“ ولید لاپرواہی سے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

دلنشین طنز یہ مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ حور تو پہلے ہی جانا نہیں چاہتی تھیں دلنشین کے تاثرات سے مزید ٹھنک گئی۔

”اگر تم جانا چاہ رہی ہو تو چلی جاؤ۔ میں تو یہ بتانے آئی تھی کہ تمہارے گھر سے فون آیا تھا۔ غالباً تمہاری اسٹیپ مدر تھیں۔“ دلنشین نے چباتے ہوئے کہا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔ حور اس کے پیچھے پیچھے نیچے آگئی۔

”فون ہولڈ رکھا ہوا ہے یا۔۔۔؟“ اس نے پوچھا۔

دلنشین نے کوئی جواب نہیں دیا اور صوفے پہ بیٹھ کر نی وی آن کر لیا۔

حور نے فون اٹھایا۔ لائن کٹ چکی تھی۔

”شاید لائن کٹ گئی۔“ حور نے زیر لب کہا۔

دل آویز اور دلنشین دونوں ہی صوفے پہ ایستادہ تھیں۔

”تم فون ملا لو۔ کیا تمہیں اپنے میکے کا فون نمبر یاد نہیں؟“ دلنشین طنز یہ مسکراہٹ سے بولی۔

”ویسے اتنی آسائش میں آنے کے بعد تو تم اپنے پچھلوں کو بھی بھول گئی ہو گی۔ فون نمبر تو بہت معمولی سی چیز ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنس پڑی۔

حور کا جودل چاہتا کہ ان کے پاس بیٹھے اور ان سے باتیں کرے یک دم ٹوٹ سا گیا تھا۔

وہ اسے جواب دے سکتی تھی مگر چپ چاپ مڑنے لگی۔ تب ہی دلنشین بولی۔ ”بائی داوے تم لوگ

جا کہاں رہے تھے؟“ دل آویز نے نی وی ٹی آواز کم کر دی اور بہن کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔

”یہ ولید کے ساتھ آؤ ٹنگ پہ جارہی تھی۔“

”میں۔۔۔ نہیں جارہی تھی۔ ولید خواجواہ کی ضد کر رہا تھا۔“ حور نے دلنشین کی بات کا ٹی۔

”ایسی ضد اس نے کبھی ہمارے ساتھ تو نہیں کی۔“ دل آویز کا لہجہ تیکھا تھا۔

”یہ تو آپ ولید سے ہی پوچھیں۔“ حور کو یوں کٹہرے میں ٹھہرے ہونا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ یہ

کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

”ماما اور بابا کی بریفنگ دل آویز کے مسئلے کا حل نہیں ہے۔ آپ جیسی لڑکی سے دوستی اس کے مسئلے

ہاں ہے۔ اگر آپ کی تھوڑی سی بولڈنئس دل آپ میں منتقل ہو جائے تو اس گھر کے بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں۔“

”ہونہہ!“ اس نے ولید کی گزشتہ گفتگو کو ذہن سے جھٹکا تھا۔
 ”دیکھا اس کا مطراق۔“ حور کے جانے کے بعد دلنشین نے دل آویز کو اکسایا۔
 ”کیسے قابو کر رہی ہے یہ ایک ایک فرد کو، جبکہ ماما کہتی تھیں۔ اول تو وہ اس گھر میں آئے گی نہیں اور
 اسی کی تو صرف ملازمہ بن کر رہے گی اور اب ماما کو پروا ہی نہیں ہے۔“
 ”تو تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے ایسے لوگوں کی پروا کرنے کی۔“ دل آویز نے بظاہر بے نیازی
 ملا لی تھی۔ جبکہ اندر ہی اندر وہ بھی حور کے وجود سے چڑنی تھی۔
 ”آپ کی تو ایسی ہی عادت ہے۔ ہر چیز سے یک دم قطع تعلق ہو جانا۔ آپ بھی تو سسرال میں
 رہتی تھیں۔ اتنی آزادی کون دیتا ہے جس طرح یہ دندناتی پھرتی ہے۔“
 ”دلنشین! ہزار بار کہا ہے تم سے، میری ذات کو درمیان میں مت گھسیٹا کر د۔ اب ان گئے گئے گزرے
 لوگوں کے لیے کیا میں ہی مثال بنوں گی۔“
 دلنشین۔۔۔ دل آویز کے رویے پہ اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گئی۔



طارق کمرے میں داخل ہوا تو حور بیڈ پر بیٹھی کپڑے تہ کرنے میں مصروف تھی۔ یہ پہلا موقع تھا
 اس نے طارق کے کپڑے خود دھوئے تھے۔ اب تہ کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ دوسوٹ پر لیس کر
 لے بیٹکر کر دے گی۔ اسی خیال کے تحت اس نے دوسوٹ دوسری جانب رکھ لیے۔ وہ طارق کا ہر کام خود
 لانا چاہتی تھی۔ مگر حالات کو دیکھتے ہوئے خاموش تھی۔
 صبح جب وہ آفس جانے کے لیے تیار ہوتا تھا۔ تو وہ اسے کن آنکھوں سے دیکھتی رہتی اور من ہی من
 میں سوچا کرتی کہ وہ اسے کوٹ پہنائے، اپنے پسند کے رنگ کی ٹائی باندھے، اپنے ہاتھوں سے کلون
 بیٹر کے، اپنے ہاتھ سے بنانا شتا کھلائے۔ اس دوران طارق کی والہانہ نظروں کی دم چھم پھوڑا اس پہ برستی
 رہے۔ وہ جو پچپن سے ہی من ہی من میں طارق کو چاہتی آئی تھی۔ آج اس کے قریب ہو کر بھی کتنا دور
 تھی۔

وہ طارق کی قمیص ہاتھ میں لیے سوچوں میں گم تھی۔
 ”یہ میرے کپڑے یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ طارق صوفے پہ بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے بولا۔
 حور چونک گئی۔ پھر ہنستے ہوئے بولی۔
 ”دھوئے تھے میں نے۔ تہ کر رہی ہوں۔“
 ”تم نے۔۔۔؟ تم نے دھوئے تھے کپڑے؟“ طارق کو خاصا اچنبھا ہوا تھا۔ حور نے کوئی جواب
 نہیں دیا۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں کہ تم نے میرے کپڑے کیوں دھوئے؟“ طارق اس کے جواب نہ دینے

پرچڑ گیا تھا۔

”ماما نے ماسی سے کہلوا یا تھا کہ میں آپ کے کپڑے نیچے نہ بھیجوں اور پر ہی دھولیا کروں۔“
وہ کپڑے الماری میں رکھنے لگی تھی۔

طارق کو دھچکا لگا لیکن غصہ حور پہ ہی آیا۔

”تم نے غور کرنے کی کوشش کی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“

”میں کیا سوچتی اس بارے میں۔ انہوں نے کہہ دیا۔ سو میں نے کر لیا۔“

اس کی بے نیازی پہ طارق کے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”ہونہہ۔۔۔ اپنا وقار و عزت قائم رکھنا ہر ایک کا مزاج نہیں ہوتا۔ حقیقت تو یہی ہے کہ تم ان ہی معمولی کاموں کے لائق ہو۔“ یہ کہتے ہوئے طارق نے موزے اتارے اور پاؤں سیدھے کرتے ہوئے صوفے سے ٹیک لگالی۔

حور کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ جو الماری میں کپڑے رکھ رہی تھی۔ پلٹ کر طارق کے سامنے آ گئی۔

”میرے ساتھ اتنا ہی کرو طارق! جتنا میں برداشت کر سکوں۔ اچھی طرح جانتے ہو تم مجھے۔ میں کیا ہوں اور کیا کر سکتی ہوں۔“

وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہی تھی۔ اُس کے سرخ ہوتے چہرے کو طارق نے بغور دیکھا۔

”کیا ہو تم۔۔۔ اور کیا کر سکتی ہو۔ بتاؤ؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ حور نے منہ

پھیر لیا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ بالکل اس کے مقابل۔

”بتاؤ۔ کیا کچھ کر سکتی ہو تم۔۔۔؟“

حور کی آنکھیں چھلک پڑی اس نے اپنا چہرہ جھکا لیا۔

”کیا میرا تمہاری زندگی میں آنا تمہارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا؟“ اس کا لہجہ بھگا ہوا تھا۔

”اُجڑا جانا جانی باتوں سے تم مجھے متاثر کرنا چاہتی ہو تو سنو۔ میں اس طرح متاثر نہیں ہو سکتا۔ انڈر

اسٹینڈ۔“

وہ دلچسپی سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

”میں کیوں متاثر کرنے کی کوشش کروں گی تمہیں۔“ وہ بھڑک کر بولی۔ ”میں اس طرح یہاں نہیں

رہ سکتی۔“

”ٹھیک ہے تو پھر چلی جاؤ یہاں سے۔ یہاں تو سب کچھ ایسا ہی رہے گا۔ حتیٰ کہ میں بھی۔۔۔“

اپنی ہنک پہ وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

وہ اسے ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”میں۔۔۔ میں چلی جاؤں گی یہاں سے، ایک دن ضرور چلی جاؤں گی، لیکن تمہیں اس چیز کا

احساس دلا کر جاؤں گی طارق۔۔۔! کہ محبت کس کو کہتے ہیں۔ آج میں تڑپ رہی ہوں کل تم تڑپو گے۔

بس تمہارے خول کو توڑنا ہے۔ جسے تم نے خود پہ۔۔۔ حورالعین سے بچنے کے لیے چڑھا رکھا ہے۔“

انہوں سے بھری آنکھیں اس نے بے دردی سے ہتھیلی سے رگڑ ڈالی تھی۔
 ”یہ رومال لے لو۔ آنسو اس میں چھپ جاتے ہیں۔“ وہ گویا اس کی بے بسی سے محفوظ ہو رہا تھا۔
 ”اس میں آنسو ہی نہیں۔۔۔ اکثر چہرے بھی چھپ جاتے ہیں اس لیے اس کی ضرورت آپ کو
 ”اے ہے۔“

وہ پلٹنے لگی تو طارق نے اسے بازوؤں میں لے لیا اور اس کی نم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
 ”کیوں آنسو بہا رہی ہو کون سے مظالم ڈھار کھے ہیں میں نے تم پر۔۔۔“
 حور حق دق رہ گئی اور بلبل کر اس کے بازوؤں کا گھیرا توڑنے کی کوشش کی۔ تو وہ طنز یہ مسکرا کر بولا۔
 ”یہی تو منافقت ہے تمہاری۔ بات کرو تو تمہیں نیند آ جاتی ہے۔ قریب آؤں تو تم بھاگنے کی کوشش
 کرتی ہو۔ پھر کس بات کی شکایت ہے تمہیں مجھ سے؟“

حور ابھی تک خود کو سنبھال نہیں پائی تھی۔ اس کی سانسیں اٹھل پٹھل ہو رہی تھیں۔
 ”یہ اکڑ لکھوں میں ختم ہو جائے گی اور میرے اوپر تمہارا کچھ قرض بھی باقی نہیں رہے گا۔ تھوڑا سا اپنی
 سچے سے نیچے اتارنا تو پڑ رہا ہے لیکن۔۔۔۔۔ مجبوری اور بس۔۔۔۔۔“ وہ بے چارگی سے ڈرامائی انداز سے ہنسا
 تھا۔

حور جل کر خاک ہو گئی۔ ”مجھے تمہارے کسی احسان کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”اچھا۔۔۔!“ وہ اس کی طرف دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ کہاں اس کا لمبا چوڑا سراپا اور کہاں اس کا
 سامان پان سا وجود۔۔۔ اتنی سختی بھی اس کے حصار میں کہ وہ اس کے سینے سے جا لگتی تھی۔
 اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ تب ہی اس نے طارق کے بازو میں دانت گاڑ دیے۔ طارق اس حملے کے
 لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔ یک دم اس کے بازو ڈھیلے پڑے اور وہ آزاد ہو گئی۔ وہ درد سے بلبل اٹھا تھا۔
 ”حور العین۔۔۔ اتنی معمولی نہیں ہے۔ وہ پورے وقار کے ساتھ تمہارے گھر میں آئی ہے۔ اور
 ان وقار کے ساتھ تمہاری زندگی میں بھی شامل ہوگی اور اس کے لیے تمہیں اپنی سطح سے نیچے نہیں سوجھنا پڑے۔
 اس کا استقبال کرو، ہوگا۔ بصورت دیگر وہ ساری عمر یونہی بھی گزار سکتی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں ٹھہلا
 ”نہ تھا۔“

طارق ہنس پڑا۔ جیسے کسی بچے کی بات پہ ہنس پڑتے ہیں۔ پھر مزے سے بیڈ پہ نیم دراز ہوتے
 ”نئے بولا۔“

”ایک بات کہوں تم سے۔۔۔ شاید تمہیں میری نرمی نے خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ تم بہت
 ہار ہو اور ایسے معمولی ہتھکنڈوں سے پناہ کا راستہ اختیار کر لو گی۔“ وہ اپنے بازوؤں کی طرف اشارہ
 کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”لیکن مزہ طارق! بات سنو۔۔۔ یہ صرف تب تک ہے جب تک میں
 باتوں۔ جب میں ہی ہٹ دھرمی پہ اتر آؤں گا تو تم کیا کرو گی۔“
 اس کی ہنسی حور العین کو نہایت ہی گھٹیا لگی تھی۔

”میں مجھتی تھی تم بڑھے لکھے، سنبھے ہوئے انسان ہو لیکن ہی میری غلط فہمی تھی۔ تم بھی عام سے گھٹیا
 ہو جو عورت کی عزت کرنا نہیں جانتا۔ اسے صرف ایک ”چیڑ“ سمجھتا ہے۔ لیکن حور العین تمہاری کسی

ضرورت کا سامان نہیں بنے گی۔“

وہ ہنس پڑا۔ ”تم لوں کرو ماما کی تنظیم جو اُن کر لو۔ اچھی خاصی تقریر کرنا آتی ہے تمہیں۔“
اس کے طنز پر جو طعنے کر رہ گئی اور دروازہ بٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔

طارق اب بھی مسکرا رہا تھا۔ ”بہت بے وقوف ہو جو راعین! تمہاری یہی بے وقوفیاں مجھے نقصان پہنچا رہی ہیں۔ لیکن تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔“ اس نے اپنے بازو پہ ہاتھ رکھا۔ جہاں اب بھی میٹھا میٹھا درد محسوس ہو رہا تھا۔



”بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ سے بات کر دوں لیکن آپ کی مصروفیت شاید ایسی ہے کہ گھر کے لیے آپ کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔“

وہ ابراہیم صاحب کے اسٹڈی روم میں ان کے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔
”آج سب لوگ باہر گئے ہوئے تھے۔ تو میں نے سوچا۔۔۔“

وہ جھجکتے ہوئے بول رہی تھی۔ جو اس کی فطرت کو جانتے ہوئے ابراہیم صاحب کو بہت مختلف لگا

تھا۔

”ہاں، ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔ دراصل میری مصروفیت کچھ ایسی ہی ہے۔ رات دیر سے گھر آنا۔ صبح جلدی چلے جانا۔ اکثر میرے بچوں کو بھی مجھ سے یہی شکایت ہوتی تھی لیکن اب سب نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ تم سناؤ۔ تمہارا دل لگ گیا ہے یہاں۔۔۔؟“

”دل۔۔۔!“ حور کو یہ لفظ عجیب سا لگا تھا۔

”کیا بات ہے تم بہت چپ چپ سی رہنے لگی ہو یا میں ہی محسوس کر رہا ہوں۔“

حور نے سر جھکا لیا۔

یہ وہی ماموں تھے۔ جو سب سے زیادہ نانو کے پاس آتے تھے اور سب سے زیادہ اسے پیار کرتے تھے اور اس کے منہ سے نکلا ہر لفظ پورا کرتے تھے وہ کبھی ان کے کاندھوں پہ چھوڑ رہی ہوتی تھی۔ تو کبھی ان کی گود میں بیٹھی نانو کی اور ان کی باتیں محویت سے سن رہی ہوتی تھی۔ نانو کے بعد سب ہی بدل گئے تھے۔ حتیٰ کہ ماموں بھی۔

”میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو؟“ ابراہیم صاحب نے کتاب بند کر کے ساری توجہ اس کی طرف کر لی۔ حور نے چہرہ اٹھایا اور سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”یہی کہ میں نے تمہاری سلامی کا تحفہ تمہیں خود کیوں نہیں دیا۔ حور بیٹا! بات یہ ہے بہت سی مجبوریاں انسان کو بری طرح بے بس کر دیتی ہے۔ میں خدا نا خواستہ کسی کے زیر اثر نہیں ہوں لیکن میں اپنی دونوں بچیوں کے معاملے میں بہت حساس ہوں۔ دل آویز کو سسرال میں وہ خوشیاں نہیں ملیں جو اس کا حق تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے کسی عمل سے دل آویز کا دل دکھے اور وہ خود کو تنہا محسوس کرے۔ وہ بہت حساس ہے اور دن بہ دن اکیلی ہوتی جا رہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ابراہیم کے چہرے پہ دھک کی

بیاہیاں گہری ہو گئیں۔

”فی الحال میں نے طارق کا ہنی مون کا پروگرام بھی کنسل کر دیا ہے۔ صرف اسی وجہ سے۔ میرا مال ہے تم سمجھ دار ہو۔ سمجھ سکتی ہو۔“

حور نے حیرت سے ابراہیم صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ آنسو گویا دل پہ گرا تھا۔
ایسا حس دل آویز ہی ہے؟ کیا دل آویز کے ہی سینے میں دل دھڑکتا ہے؟ کیا صرف وہی انسان ہے؟
ایسا صرف اسی کا استحصال ہوا ہے؟ میرے ساتھ جو ہو رہا ہے۔ وہ کیا ہے؟
وہ صبح کے واقعہ کو یاد کرتے ہوئے انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے بیٹھی تھی۔

طارق نے صبح اسے یہ حکم دیا تھا کہ وہ کچن کی ذمہ داری سنبھالے کہ وہ یہاں صرف روٹیاں تازہ نہیں آئی ہے۔

وہ کام جو رکھی بھی نہیں تھی اور اسے تو ڈل لگانا تھا، وقت گزارنا تھا۔ خواہ کاموں میں ہی لگ کر۔
جب وہ کچن میں آئی تو دل آویز اپنے لیے ناشتا بنا رہی تھی۔

”لائیں آئی! میں بنا دیتی ہوں آپ کا ناشتا۔“

”آ۔۔۔ پی۔۔۔!“ دل آویز نے حیرت سے حور کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ آپ۔۔۔! میں آپ کا ناشتا بنا دیتی ہوں۔“

”واٹ ڈو یو مین۔ تم مجھ سے بڑی ہو۔ ماما بتاتی ہیں۔ ماما کی تو شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ تب سے تم دادو کے پاس ہوا کرتی تھیں۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ نا تو بتاتی تھیں۔ میں تو ولید سے بھی چھوٹی ہوں۔“
”ضرورت سے زیادہ اسماٹ بننے کی کوشش نہ کرو۔“

”میں نے ایسی کون سی بات کی ہے جس سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا؟“

حور کا اتنا کہنا تھا کہ دل آویز نے چلا نا شروع کر دیا۔

”ماما۔۔۔ ماما۔۔۔ ماما! کہاں ہیں سب لوگ؟“

دلشاد فوراً کچن میں آ گئیں۔

”کیا مسئلہ ہے دل۔۔۔! صبح صبح کیوں چلا رہی ہو؟“ پھر یک دم وہ حور کو دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

”ماما کیا اب میں کچن میں بھی نہیں آ سکتی؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ دلشاد نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیٹی کی طرف دیکھا پھر اس کی جانب

کڑوی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”تم نے کیا کہا ہے دل کو۔۔۔؟“

”میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“

”تم نے کچھ نہیں کہا تو یہ ناشتا ایسے ہی چھوڑ کر چلی گئی۔“ حور نے دیکھا، دل آویز کچن سے نکل

چکی تھی۔

”تم ہماری کچھ نہیں لگتیں۔ صرف اس کی لگتی ہو جو تمہیں خدا ترسی میں بیاہ کر لایا ہے۔ یتیم و مسکین

”سجھ کر۔“

ان کا اشارہ ابراہیم صاحب کی طرف تھا۔
 ”مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم میری بیٹیوں سے بیرباندہ بیٹھو۔“
 ”مامی! آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔“ حور نے وضاحت کی کوشش کی۔
 ”میں تمہیں اچھی طرح سمجھتی ہوں تم کو جو تربیت ملی ہے اسے اپنے تک ہی محدود رکھنا۔ تو تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔“

پھر باہر جاتے جاتے مڑیں۔
 ”دل آویز۔۔۔ بارہ سے ایک کے درمیان ناشتا کرتی ہے اور دن بھر میں وہ صرف ناشتا ہی لیتی ہے۔ اس کے سر پر سوار ہو کر اس کی واحد غذا بھی ختم کر دیتا۔“
 ان کے جانے کے بعد حور کو اپنا آپ نہایت کمتر لگا تھا۔
 اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں اور سے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ قطرے اس کی جھولی میں گر کر اس کا دامن تر کرنے لگے۔

ابراہیم صاحب کی نگاہ پڑی تو وہ یک دم خاموش ہو گئے۔
 ”تم رورہی ہو بیٹا؟“ چند ساعتیں خاموشی سے سرک گئیں۔ ”تم خوش نہیں ہو بیٹا؟“
 ان کی نگاہیں حور کے چہرے پہ لگی تھیں۔
 وہ چاہتے ہوئے بھی نظریں نہ چرا سکی۔



”معزز رات ہی آیا ہے۔ اس کے لیے خصوصی ڈشز تیار کروالینا۔ شام کو ماما کے چند گیسٹ بھی آئیں گے۔ کھانا اچھا بننا چاہیے۔ لاؤنج کی صفائی تمہیں خود کھڑے ہو کر کرنا پڑے گی۔ کیونکہ ماما کے خصوصی گیسٹ آرہے ہیں۔ میرے کپڑے بھی شام کو تیار ہونا چاہئیں اور ہاں اپنا حلیہ بھی درست کر لینا۔ کام کاج کے لیے اتنے ملازمین موجود ہیں۔ اس کے باوجود تم ماسی بنی پھر رہی ہو۔ تمہیں شاید پتا نہیں ماما کو ایسے بکھرے اور گندے حلیے سے کتنی پڑ ہے۔ کسی دن انہوں نے غور کر لیا تو تمہاری اچھی خاصی کلاس ہو جائے گی۔“

وہ آئینے میں ٹائی باندھتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ جو بستر کی چادر درست کر رہی تھی۔
 لمبی سی بالوں کی چوٹی ایسے ہی بکھری الجھی پڑی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کا پرنڈ سوٹ جو وہ تین دن سے دیکھ رہا تھا۔

”گھر کے ملازمین بھی کیا سوچتے ہوں گے۔“ کڑھتے ہوئے وہ جوتے پہننے لگا تھا۔
 ”تو گویا میں اپنا حلیہ اس لیے درست رکھوں کہ ملازمین آپ کے بارے میں کیا سوچیں گے اور ماما۔۔۔ انہیں گندگی سے نفرت ہے۔ اس لیے مجھے جج سنو کر رہنا چاہیے۔ ہے نا۔۔۔؟“ وہ جھٹکے سے سیدھی ہو چکی تھی۔ ”تو میری بات سنیں۔ ماما کے جیتے فرزند! میں ماما کے نکاح میں نہیں آئی ہوں۔ میں

اس کے نکاح میں آئی ہوں۔ جب اسے ہی پروا نہیں تو مجھے دوسروں کے لیے سجنے سنورنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”تمہاری یہ ہٹ دھرمی مجھے ہمیشہ سے زہر لگتی ہے اور تم یہ اچھی طرح سے جانتی ہو۔“
 ”اور آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ہٹ دھرمی نہیں ہے۔ بانی داوے یہ گھریلو کاموں کی ذمہ داری آپ نے اٹھا رکھی ہے۔ جو بھی کام ہوتا ہے آپ ہی آرڈر جاری کرتے ہیں۔ یہ آپ سے آپ کی ماما کہلوانی ہیں یا بچپن سے یہ آپ کی ذمہ داریوں میں شامل تھا؟“
 وہ حور کی بات پہ چکر اساکیا۔ ظاہر ہے دل میں شرمندگی بھی محسوس ہوئی تھی۔ مگر اس شرمندگی کو ظاہر کر کے وہ چھوٹا نہیں ہونا چاہتا تھا۔

”جب گھر میں خواتین کی کارکردگی صفر ہوگی تو ظاہر ہے مردوں کو تو انوالو ہونا ہی پڑے گا۔“
 اسے کہنے کے بعد احساس ہوا کہ وہ یہ جملہ کہہ کر خود پھنس گیا ہے۔
 ”اوہ۔۔۔ ہو۔۔۔ اچھا۔۔۔ اب سچی۔ اس گھر کی خواتین اتنی پھوہڑا اور غیر ذمے دار ہیں کہ آپ کو یہ کام سنبھالنا پڑتا ہے۔ تو پہلے بتاتے نا۔ اب آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آگئی ہوں نا۔ ملازموں کے سارے عیش ختم۔“ وہ چٹکی بجا کر بولی تو وہ بھٹتا گیا۔
 ”ضرورت سے زیادہ ہوشیار بن رہی ہو حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم کتنی قابل ہو۔“
 ”ظاہر ہے۔ آپ تو میرے بچپن کے استاد رہ چکے ہیں۔ یہ جو میں تھوڑی بہت آپ کی عزت کرتی ہوں صرف اسی بنیاد پر کرتی ہوں۔ ورنہ آپ کو آتا ہی کیا ہے۔ سوائے غزانے چلانے اور۔۔۔“
 اس کے ساتھ ہی حور کی زبان بند ہوگئی۔ طارق نے سختی سے اس کی کلائی دبوچ لی تھی۔
 ”اور۔۔۔؟“ وہ غراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
 تب ہی طارق کا موبائل فون بج اٹھا۔ حور جو یک دم شٹا گئی تھی۔ فوراً متحرک ہوگئی اور چپک کر بولی۔

”فون انینڈ کر لیں۔ ہو سکتا ہے ماما کا ہی ہو۔۔۔ کہیں انہیں مزید کام نہ یاد آ گیا ہو۔“
 اور یک دم اس کو یاد آیا کہ ماما نے پارلر جانا تھا اور وہ اس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔
 اس نے جھٹکے سے حور کی کلائی چھوڑ دی اور اپنے سیل فون پہ نمبر دیکھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔
 حور تا ساف سے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔



”پورے لان کا استیانتا کر رکھا ہے۔ کم از کم بے مومی پودوں کو تو ایک طرف کر دیا کریں۔ تاکہ یہاں جنگلی گھاس نہ نکلے۔“

وہ مالی سے لکھتے ہوئے مٹی کی گوڑی کر رہی تھی۔ پھر تھک گئی تو کھربانی مالی کو تھما دیا۔
 ”مجھے تو اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ آپ کیا یہاں میری شکل دیکھنے کو کھڑے ہیں۔ جلدی جلدی کام نمٹائیں۔ میں نے ابھی لاؤنج کی صفائی بھی کرائی ہے۔“ وہ ہاتھوں سے مٹی جھاڑ رہی تھی۔

دل آویز کسی کام سے باہر نکلی تھی۔ وہ حور کو لان کی صفائی کرتا دیکھ کر بھڑک گئی۔

”مالی بابا! کیا ڈرامہ ہو رہا ہے یہاں۔۔۔؟“

مالی حور کی شکل دیکھنے لگا۔

”انہیں بتاؤ کہ ہم لان کی صفائی کر رہے ہیں اور بلکہ تقریباً کر چکے ہیں۔“ حور نے مالی سے کہا تو

وہ پریشان ہو گیا۔

”یہ جواب آپ خود دے دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔“

”یہ سارے لان کا کیا ستیاناس کر ڈالا ہے اور یہ کیا کیا، ساری ہی بلیں کاٹ دیں۔“ دل آویز چیخ

پڑی۔

”میں اندر جا رہی ہوں۔ فارغ ہو جاؤ تو مجھ سے مل لینا۔ میں نے نئے پودے منگائے ہیں۔“

حور یہ کہہ کر اندر چلی گئی۔

مالی اپنی شامت کے لیے منتظر کھڑا تھا۔

”کس نے کہا تھا تم سے یہ سب کرنے کے لیے؟“ دل آویز بری طرح بھڑک چکی تھی۔

”کسی نے نہیں جی۔ میری ہی مت ماری گئی تھی۔ اس لیے میں نے سارا لان چنیل کر دیا۔ یہ لیس

جوتی اور یہ میرا سر۔۔۔“ مالی سر پکڑ کر دل آویز کے سامنے بے چارگی سے بیٹھ گیا تھا۔ دل آویز غصے سے اسے گھورتی رہی پھر جزیر ہوئی اندر چلی گئی۔

مالی نے سر اٹھایا تو بلائ چکی تھی۔۔۔ تشکر سے آسمان کی طرف دیکھا۔ لاؤنج کی سیننگ کرانے کے بعد حور بے حد مطمئن تھی۔

اب اسے دل جمعی سے کھانا پکانا تھا اور اس کے بعد پھر اپنی تیاری۔



مکمل تیاری کے بعد اس نے تنقیدی نگاہ خود پہ ڈالی۔ نمایاں قد، چھریا جسم جس پہ بلیک ساڑھی غضب ڈھا رہی تھی۔ بالوں کو کھلا چھوڑنا اچھا نہیں لگا تو اس نے انہیں جوڑے کی شکل دے دی تھی۔ ہلکے سے میک اپ نے اس کو ایک منفرد شکل دے دی تھی۔ پاؤں میں نفیس سی چھوٹی سی ہیل والی چپل تھی جسے پہن کر چلنے پھرنے میں اسے کسی قسم کی کوئی دشواری نہیں تھی۔ کانوں میں چھوٹے چھوٹے آویزے اور چھوٹا سا ٹیکس۔ کانچ کی چوڑیاں البتہ اس نے کلائیاں بھر کر پہنی تھیں۔

وہ کمرے سے نکل رہی تھی۔ تب ہی طارق سے ٹکراؤ ہو گیا۔

وہ تو اس کا روپ دیکھ کر ساکت ہی رہ گیا تھا۔ وہ اسی بے نیازی سے آگے بڑھنے لگی تو طارق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تم۔۔۔ اتنی جلدی تیار ہو گئی تمہیں پتا ہے ابھی صرف آٹھ بجے ہیں۔ جبکہ گیسٹ دس بجے تک آئیں گے۔“ وہ شاید اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

”تو مجھے ایسا کون سا کام کرنا ہے جو میری تیاری خراب ہو جائے گی اور گیسٹ دس کے بجائے نو

”کی تو آسکتے ہیں۔“
 ”تمہیں نہیں معلوم۔ ماما کے سارے فنکشن لیٹ ہوتے ہیں۔ اس لیے اس حلیے میں باہر چلنے
 نے سے بہتر ہے یہیں بیٹھی رہو۔“
 کسی نہ کسی بہانے سے اسے باہر جانے سے روکنا تو تھا نا۔
 ”کچن میں بہت سا کام پڑا ہے۔ اودن میں روسٹ رکھا ہے، کھیر پہ ابھی بادام کاٹ کر ڈالنا ہیں
 اور ہاں گرپن بی بھی بنانا ہے۔“
 ”افوہ۔۔۔! سارے کام کیا تمہارے ہی ذمہ ہیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولا تو حیرت سے اس کی
 طرف دیکھتی رہ گئی۔

طارق کو فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔
 ”اچھا۔۔۔ جاؤ۔۔۔ مجھے بھی تیار ہونا ہے۔“ حور کھڑی رہی۔ پھر توقف سے بولی۔
 ”کیا مرد بھی ہوں گے اس پارٹی میں۔۔۔؟“
 ”پتا نہیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔
 حور نے پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا وہ اسی طرح جھنجھلا تاواش ردم کی طرف بڑھ گیا تھا۔



حور العین پوری محفل میں ہر لحاظ سے نمایاں تھی۔ جہاں کھانے کی تعریف ہوتی تھی۔ وہاں حور
 العین کے حصے میں داؤ آتی تھی۔
 ”آخر مہمانوں کو یہ بات کس نے بتائی ہے کہ کھانا ان محترمہ نے بنایا ہے۔“ دلشین کھستے ہوئے
 دل آویز سے پوچھ رہی تھی۔

جبکہ دل آویز جواب دینے کے بجائے سوچ رہی تھی کہ آئے دن ماما کی ایسی تقریبات ہوتی ہیں۔
 کبھی اتنی گہما گہمی نہیں ہوتی جتنی آج ہے۔ اگر وہ بھی ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں دلچسپی لے تو حور سے
 بھی زیادہ داد حاصل کر سکتی ہے اور اگر آج یہی سب کچھ اس نے کیا ہوتا تو آج پوری محفل کی جان وہ
 ہوتی۔ ہر ایک اس میں دلچسپی لے رہا ہوتا۔ اس کا لباس، اس کا انداز کچھ بھی تو ایسا نہیں تھا کہ پہلی بار
 تعارف کے بعد کوئی اس سے بات بھی کرتا۔ آخر اس نے ایسی بات پہلے کیوں نہیں سوچی۔

حور اب سب کو تہوہ پیش کر رہی تھی۔ اس کا لباس، اس کا انداز، وہ ہر ایک سے اس طرح مل رہی
 تھی جیسے برسوں سے انہیں جانتی ہو۔ وہ پورے ماحول پہ چھا گئی تھی۔

دل آویز کا دل چاہا اٹھ کر جائے اور اسے ابھی کہیں غائب کر دے۔ منظر سے ہٹا ڈالے۔
 ”دل! تہوہ لوگی؟“ حور کی آواز پہ وہ چونک پڑی۔ دل آویز کو اس کے سامنے اپنا آپ بہت چھوٹا
 اور معمولی لگا۔

”بہو بہت ہی خوب صورت ہے تمہاری۔ ایسی بہو اگر میرے بیٹے کے لیے مل جائے نا تو میرا
 بڑھاپا سنور جائے۔“ کوئی خاتون کہہ رہی تھیں۔

دلشاد بیگم مسکرا مسکرا کر مبارک باد وصول کر رہی تھیں اور دل ہی دل میں اپنی بیٹیوں پہ کڑھ رہی تھیں۔ جو خوش شکل اور پڑھی لکھی ہونے کے باوجود اس صلاحیت سے محروم تھیں۔



”جودھو کا میں نے دل آویز کے معاملے میں کھایا ہے۔ اب میں اس سے بچنا چاہتی ہوں۔ میں پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا گھرانہ تلاش کر رہی ہوں اور تم لوگ ہو کہ بالکل بھی آگے نہیں آئیں۔ پیچھے پیچھے رہتی ہو۔“

”آپ کا کیا مطلب ہے۔ ہم ملازموں کی طرح جھک جھک کر لوگوں کی خدمتیں کریں گے۔ تب ہی انہیں نظر آئیں گے۔ کم از کم میں نے اتنا کر کر نظر نہیں آنا۔ میں سینٹھ ابراہیم کی بیٹی ہوں۔۔۔ میرے لیے یہ تعارف ہی بہت ہے۔“

یہ دلنشین بھی۔ جسے ماں کا لیکچر صرف اس لیے برا لگا تھا کہ ماں نے ان کا موازنہ حورالعین سے کیا تھا۔ دلشاد بیگم بیٹی کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

”وہ مہمانوں کے درمیان ایسے چمک رہی تھی، جیسے وہی گھر کی مالکہ اور اصل میزبان ہے اور یہ بات سب کو کس نے بتائی تھی کہ کھانا اس نے پکایا ہے۔ ظاہر ہے اس نے خود ہی بتائی تھی۔“

انہوں نے کہا تو دلنشین ڈر گئی۔

”ماما! آپ نے بھی تو حد کر دی۔ سارا گھر اسے سوئپ دیا۔“

”اصل میں بات یہ ہے کہ ماما کو اپنی سرگرمیوں کو برقرار رکھنے کے لیے ایک گھر سنبھالنے والی کی ضرورت تھی۔“

معیز جو بہت دیر سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ درمیان میں بول ہی پڑا۔

”تو یہ کام دل آویز کریں گی۔ کم از کم میں تو اتنی فارغ نہیں ہوں کہ گھریلو سیاست کے چکر میں باورچن بن جاؤں۔“ دلنشین کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ دلشاد بیگم نے پہلی بار سوچا کہ دلنشین بہت منہ پھٹ اور بدتمیز ہو چکی ہے۔ دلشاد بیگم اتنا بھی صرف اس لیے سوچ سکتی تھیں کہ وہ فلاحتی این جی او سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ جہاں دن رات اخلاقیات پہ لمبی چوڑی بحث ہوا کرتی تھی۔ دلشاد بیگم نے بذات خود کبھی کوئی تقریر نہیں کی تھی۔ انہیں لکھنا تو کیا پڑھنا بھی نہیں آتا تھا لیکن کچھ کچھ کہنا ضرور آ گیا تھا۔ ابراہیم صاحب مختلف تنظیموں کو فنڈ دیا کرتے تھے۔ اسی توسط سے لوگوں کا ان کے ہاں آنا جانا تھا۔ ان کے دوستوں کی اکثر بیویاں بھی ان تنظیموں میں کام کرتی تھیں۔ ان ہی میں ملاقاتوں سے انہوں نے گھر سے باہر نکلتا سیکھا اور یونہی ایک تنظیم کی ممبر بن گئیں۔ پھر تو ان کا ایسا دل لگا کہ وہ اپنا سارا ماضی ہی بھول گئیں۔

ابراہیم صاحب نے ان کے اس شوق پہ کبھی پابندی نہیں لگائی تھی۔ بذات خود ابراہیم لبرل ذہن کے مالک تھے لیکن جب تک ان کے والدین حیات رہے۔ زندگی والدین کی من پسند گزاری بھی اختلاف رہ۔ نہ کیا۔ لیکن اماں جی کے بعد انہوں نے اپنی فیملی کو ہر آزادی مہیا کی۔ اس کے باوجود وہ

دل آویز کے ذہن سے ماضی کے اثرات دور نہ کر سکے۔ دلشاد بیگم اپنے ہاتھوں سے سونے کی چوڑیاں اتارنے لگیں تو ان کی نگاہیں اپنے ہاتھوں پہ جم کر رہ گئیں۔ بڑھاپے کی جھریاں ان کے ہاتھوں پہ نظر آنے لگی تھیں۔

بائیں ہاتھ سے کام کرنے کی عادت کی یادداشت میں کتنی سزا بگھتی تھی۔ زندگی نے اس حصہ میں آکر وہ خود کو احساس کمتری کی سلاخوں سے باہر نہ نکالیں تو شاید ان کا حال۔۔۔ دل آویز سے کم نہ ہوتا۔ انہوں نے سوچ کر جھر جھری لی اور تب ہی ابراہیم صاحب کی موجودگی کو محسوس کر کے مسکرا دیں۔

”کیا بات ہے بڑی گہری سوچ میں مبتلا نہیں؟“

”دل آویز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اگر وہ میرے ساتھ باہر آنا جانا شروع کر دے اور کسی این جی او کی ممبر بن جائے تو اس کی زندگی کا سکوت ٹوٹ سکتا ہے۔ پڑھی لکھی ہے، سمجھ دار ہے۔ مگر یہ لڑکی نہ جانے کیا چاہتی ہے۔“

ابراہیم نے تاسف سے ان کی طرف دیکھا۔

”بیمار ذہن کا حل فلاحی تنظیم نہیں ہوتا۔“

”میری بیٹی بیمار نہیں ہے اور اگر وہ بیمار ہے تو اس کے ذمے دار آپ اور آپ کی ماں ہے۔ جنہوں نے مجھے ان حالات پہ پہنچایا اور میری بچی کے ذہن پہ ان باتوں کا اثر پڑا۔“

ابراہیم صاحب خجی سے ہنس پڑے۔ ”یہ بحث اب پرانی ہو چکی ہے۔“ انہوں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور گردن بدل لی۔ مگر ان کا دل چلا چلا کر کہتا چاہتا تھا یہ زندگی کا سب سے بڑا سچ ہے۔ کمزور لائف پائر سب سے زیادہ نقصان اپنے ساتھی کو پہنچاتا ہے۔



سرخ گنٹل پہ ٹریفک کا اثر دھام بے کراں تھا۔ طارقی کو فوری طور پہ بینک پہنچنا تھا۔ جس کے بند ہونے میں صرف ایک گھنٹہ ہی باقی تھا۔ اگلے دو روز کی چھٹی تھی۔ سوائے بہت سے معاملات نمٹانا تھے۔ وہ بھی گھڑی دیکھتا تھا اور کبھی ہارن بجاتا تھا۔ تب ہی اچانک اس کی نگاہ دلشاد بیگم پہ پڑی۔ وائٹ مٹی کار میں وہ کسی انجان لڑکے کے ساتھ بیٹھی جو گفتگو تھی۔ اس کی نگاہیں اس پہ ٹھہر گئیں۔ وہ دونوں اتنے مصروف تھے کہ انہیں ارد گرد کا بھی ہوش نہ تھا۔ پھر اچانک وہ گاڑی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی اور بے تحاشا ٹریفک نے سارا منظر بدل دیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ گنٹل کھل چکا ہے اور پیچھے سے ہارن کا شور صرف اسے اپنی جگہ سے ہلانے کے لیے دیا جا رہا ہے۔ اس نے فل اسپید میں گاڑی آگے بڑھا دی۔

کام سے فراغت کے بعد بھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ جلد ہی گھر آ گیا۔ اس وقت پانچ بج چکے تھے۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے دلشاد بیگم کے بارے میں پوچھا۔ پتا چلا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے تو اس نے بے چینی سے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

دوسری دستک پہ دلشاد بیگم نے دروازہ کھولا۔

”بالکل یہی کپڑے پہن رکھے تھے اس وقت اس نے۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہ

کوئی اور نہیں دلنشین تھی۔“

دلنشین نے آنکھیں مسلتے ہوئے طارق کی طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے طارق بھائی ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ وہ سو کر اٹھنے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔ کیونکہ اس نے بھی طارق کو دیکھ لیا تھا۔ اور طارق سوچ رہا تھا کہ اس سے کیسے بات کرے۔ پھر اسے ایک دم خیال آیا۔

”تمہاری یونیورسٹی کس وقت آف ہوتی ہے؟“

”میکسی دو بجے۔“ جواب لا پرواہی سے ملا۔

”تم آج گھر کس وقت آئی ہو؟“

”تقریباً ڈھائی بجے۔“ صاف جھوٹ بولا گیا۔

اس نے تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔ میں یہ بتانے آیا تھا۔ کل سے میں خود تمہیں پک اینڈ ڈراپ کیا کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ

اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دلنشین نے بے حد مشتعل ہو کر دروازہ بند کیا تھا۔



حور نے مچھلی میں مسالا لگا کر صبح سے رکھ دیا تھا۔ آٹا بھی گندھا رکھا تھا۔ بس املی کی چٹنی بنانا تھی اور تھوڑا سا سلاد۔

مچھلی کی خوشبو اتنی اشتہا انگیز تھی کہ دل آویز بے چین ہو کر کمرے سے نکل آئی۔ لیکن جب حور کو کچن میں مصروف پایا تو دروازے میں ہی ٹھٹھک گئی۔

حور نے دل آویز کو دیکھ لیا تھا۔ سو فوراً وضاحت کر دی۔

”طارق آگئے ہیں۔ میں ان کے لیے کھانے کا انتظام کر رہی تھی۔“

”چھ بجے۔۔۔؟“ دل آویز نے استہزائیہ کہا۔ ”طارق کب سے ڈنر چھ بجے کرنے لگا۔ وہ تو اکثر

لیٹ نائٹ ڈنر کرنے کا عادی رہا ہے اور وہ بھی باہر۔“

حور کھسا سی گئی پھر بھی اعتماد سے بولی۔ ”پتا نہیں۔ شاید ایسا ہی ہو۔“

”پر نانو تہمتی تھیں مرد جیسے ہی گھر لوٹیں انہیں اسی وقت گرم کھانا پیش کر دینا چاہیے۔ اس طرح

وہ۔۔۔۔۔ حور نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”کیا۔۔۔؟“ دل آویز کی دلچسپی عروج پر تھی۔

”اس طرح وہ باہر کا رخ نہیں کرتے۔“

دل آویز کو یہ بات دلچسپ بھی لگی اور عجب بھی۔ کیونکہ اس نے بچپن سے جوانی تک کبھی نہیں

دیکھا تھا کہ ابراہیم صاحب کے آنے کے بعد دلشاد بیگم ان کے کھانے پینے کے لیے بھاگ دوڑ کرتی

ہوں۔ سب ہی رات کا کھانا دیر سے کھاتے تھے۔

کوئی باہر کھا کر آ جاتا تھا اور کوئی ملازموں کے ہاتھ کا پکا گھر میں ہی کھا لیتا تھا۔ دلشاد بیگم نے کھانا ہانے میں کبھی دجپی نہیں لی۔ شروع سے ہی ان کے ہاں خانساں کھانا بناتا تھا اور اس چیز کو کوئی محسوس نہیں کرتا تھا۔

”تو گویا تم رواجی ہتھکنڈوں سے طارق کے دل پہ حکمرانی کرنا چاہتی ہو۔“
حور کو حیرت ہوئی۔ خوش گوار سی حیرت، اسے امید ہی نہیں تھی کہ دل آویز کبھی اس طرح کی بات ہی کرے گی۔ حور نے مسکرا کر کاندھے اچکا دیے اور اعتماد سے بولی۔

”اگر عورت چاہے تو مرد کے دل ہی پہ نہیں دماغ پہ بھی حکومت کر سکتی ہے۔“
”ان معمولی خد متوں سے۔“ دل آویز تہقہہ لگا کر کہی تو حور نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا۔
”جذبے کبھی معمولی نہیں ہوتے۔ طارق مجھ سے محبت نہیں کرتا، نہ ہی وہ مجھے اپنا ناچا ہوتا تھا مگر میں اتنی بے صلاحیت بھی نہیں ہوں کہ اس کی زندگی میں آنے کے بعد اسے اپنے ہونے کا احساس بھی نہ دلا لوں۔“

دل آویز کو اس کے اعتراف پہ خاصی حیرت ہوئی تھی۔
”تم یہ بات جانتی ہو پھر بھی اتنا خوش اور مطمئن نظر آتی ہو؟“ دل آویز مچھلی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر کھانے لگی تھی۔

”ہاں۔۔۔ وہ اس لیے کہ میری زندگی میں اول و آخر صرف طارق ہی تو نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جو مجھے چاہتے ہیں، میری قدر کرتے ہیں اور مجھے اپنا سمجھتے ہیں۔ یہ خوشی اور اعتماد ان ہی کا دیا ہوا ہے۔“

”تو پھر تم طارق کے ساتھ کیسے رہ رہی ہو؟ جب تمہیں اس سے اور اسے تم سے محبت نہیں ہے۔“
حور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ طارق سے محبت نہیں کرتی لیکن اس نے فی الحال اس کی تردید نہیں کی اور دل آویز کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
وہ اس لیے کہ عورت، مرد کے بنا اور مرد، عورت کے بنا مکمل نہیں۔“

دل آویز نے حور کی اس بات کو گویا نظر انداز کر دیا اور رشک سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
”ویسے تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں طارق جیسا جیون ساھی ملا اور ایسا گھر۔ کوئی بھی لڑکی یہاں با آسانی ایڈجسٹ ہو سکتی ہے۔“
اس کی خوش فہمی پہ حور کو غش آنے لگا تھا۔

”میرے تو مسائل ہی بڑے عجیب تھے۔“ دل آویز نے کہا تو حور گنگ رہ گئی۔ کیا وہ اس قابل تھی کہ دل آویز اس سے اپنے مسائل ڈسکس کر سکے۔
”کھانا ٹھنڈا ہوا جائے گا۔ تم طارق کا کھانا لے جاؤ۔“ یک دم دل آویز نے بات بدل دی اور کہتے ہوئے کچن سے نکل گئی۔



”رمیض کا فون آیا تھا۔ وہ آپ لوگوں سے ملنا چاہتا ہے۔“ طارق کی اطلاع پہ دلشاد بیگم ہی نہیں ابراہیم صاحب بھی مشتعل ہو گئے۔

”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“ دلشاد بیگم نے سوال کیا۔

”پتا نہیں۔ وہ جب آپ سے ملے گا، تب ہی پتا چلے گا۔ ویسے سنا ہے کہ اس کی بہن بیمار ہے اور وہ بہت پریشان ہے۔“

”تو وہ اس لیے ملنا چاہتا ہے کہ اسے دل آویز کی خدمتوں کی ضرورت ہے۔ میری بیٹی ملازمہ نہیں ہے جو اس کے بھانجا، بھانجی اور بہن کو سنبھالے گی۔ اب وقت بڑا تو اسے دل آویز یاد آگئی۔ اس سے پہلے دل آویز اس کے قابل ہی نہیں تھی۔ تم نے جواب کیوں نہیں دیا اسے کہ ہم اس سے ملنا نہیں چاہتے۔“ ابراہیم صاحب نے سختی سے کہا

”نہ ملنا مسئلہ کا حل تو نہیں ہے۔“ طارق نے مشورہ کیا۔

”تو گویا تم اس مسئلہ کا حل نکالنا چاہتے ہو۔ چاہتے ہو کہ وہ جھوٹے منہ یہاں آئے اور ہم دل کو اس کے ساتھ روانہ کر دیں۔“

”بابا! میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“

”تو پھر۔۔۔ رمیض کی ہمت کیسے ہوئی تم سے رابطہ کرنے کی۔ ہم بڑے بیٹھے تھے۔ اس نے ہم سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ اس لیے نا کہ تم نے اس سے تعلق ختم نہیں کیا تھا۔“

”بابا! اتنی بدگمانی۔۔۔!“ طارق کے لہجے میں غم و غصہ تھا۔

”ہاں۔ اتنی ہی بدگمانی۔ اعتبار ہی نہیں رہا مجھے تمہارے اوپر۔۔۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“ طارق کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ

ہو رہا تھا۔

”تمہیں دل آویز ہی نہیں دلنشین بھی کھٹک رہی ہے۔ کون سا جرم سرزد ہو گیا تھا اس سے کہ تم نے اس سے اس کا موبائل فون لے لیا۔ اس پر پابندی لگا دی کہ وہ کسی لڑکے سے دوستی نہ کرے نہ صرف پابندی بلکہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ وہ آگے نہیں بڑھے گی۔ پھر یہ کہ اسے لانا لے جانا شروع کر دیا۔ کیا ہو گیا ہے طارق تمہیں۔ کیا وہ دس بارہ سال کی بچی ہے۔ کیا سوچیں گے اس کے فرینڈ اس کے بارے میں۔ وہ کوا بچہ کشن میں پڑھ رہی ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے اس کے فرینڈ زمیل ہوں یا بی میل۔“ طارق دم بخود سا باپ کو دیکھ رہا تھا۔ کہ ابراہیم صاحب غیض و غضب میں بولے۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے سراسر میری معصوم بچی پہ بد اعتمادی کی ہے۔ جن کی وجہ سے وہ اتنا بد دل ہو گئی ہے کہ اس نے مزید نہ پڑھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”وہ مجھے غلط سمجھ رہی ہے بابا! میں اس کا بھائی ہوں اور میں نے اس سے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ جس سے وہ دل برداشتہ ہو۔ لیکن وہ نا سمجھ ہے۔ ہم لوگ اس کے بارے میں زیادہ بہتر سوچ سکتے ہیں۔“

”بہتر سوچ سکتے تھے، جب تک تم اکیلے تھے۔“ دلشاد بیگم بہت دیر کے بعد ان کی گفتگو میں شامل ہوئی تھیں۔

”کیا مطلب ہے ماما آپ کا۔۔۔؟“ طارق کچھ نہیں سمجھا تھا۔
 ”دراصل تمہاری سوچ کا زاویہ بدل گیا ہے۔ اس کم حیثیت لڑکی نے تمہاری سوچ بھی پست کر دی ہے۔“

پھر وہ ابراہیم صاحب کی طرف متوجہ ہو کر بولیں۔
 ”ضرور اس نے ہی اس کے اٹنے سیدھے کان بھرے ہوں گے۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس نے ایسا کبھی نہیں کہا۔“
 ”ماما۔۔۔!“ غم و غصے سے طارق کی کنپٹیاں پھٹنے لگی تھیں۔ وہ کیا بتاتا۔ حور کو وہ کیا حیثیت دیتا ہے۔ کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اے۔۔۔
 بے ساختہ اس نے باپ کی طرف دیکھا اور اسی لمحے ابراہیم صاحب نظریں چرا گئے۔ یعنی ان کی بھی ایسی ہی سوچ تھی۔

”میرے خدا۔۔۔!“ طارق کو لگ رہا تھا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔
 ”حالانکہ اسے خود اس گھر میں کسی قدر آزادی مل رہی ہے، اس کے باوجود وہ میری بچیوں کی خوشیوں کی دشمن بن رہی ہے۔“
 ”بس کریں ماما۔۔۔ بس کریں۔“ طارق نے اپنا سر تھام لیا۔ ”میرے کسی بھی معاملے میں اس کا کیا عمل دخل ہے۔ آپ خواخواہ اُسے گھسیٹ لائی ہیں۔“
 ”دیکھ رہے ہیں آپ، کس طرح حمایت کر رہا ہے یہ اس کی۔ چار دن میں اتنا اس کا ہو گیا ہے کہ اس کے خلاف کچھ نہیں سن سکتا۔ ایک آپ تھے، جنہوں نے ساری عمر میری برائیاں سنیں اور کبھی اپنی ماں کو جواب نہیں دیا۔“
 دلشاد ابراہیم صاحب سے الجھنے لگیں تو طارق غصے میں باہر نکل گیا۔



سر دی بہت زیادہ تھی اور رات گہری ہو چکی تھی۔ وہ بڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑا رہا تھا۔ گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جس باپ کے لیے اس نے قربانی دی تھی۔ آج اسی نے اتنا ذلیل کر دیا تھا۔
 تم از کم وہ ماما کی سوچ کو رد کر سکتے تھے۔ مگر وہ کیوں کرتے۔۔۔؟ ماما کی خوشنودی کے لیے ہمیشہ ہی وہ جائز و ناجائز کرتے آئے ہیں اور وہ کتنا بے وقوف ہے۔۔۔ بلاوجہ اپنی زندگی کو خود اجیرن کر رہا ہے، کیا ملا ہے اسے اور مل بھی کیا سکتا تھا۔ ہر انسان اپنی زندگی میں مگن ہے۔ ہر ایک، دل آویز سے لے کر معیض تک اور دلنشین جسے وہ معصوم اور نا سمجھ سمجھتا رہا تھا۔ کتنا کاری دار کیا ہے اس نے۔ کیا وہ نا سمجھ ہو سکتی ہے۔ گھر میں ہر ایک کو صرف حور سے تکلیف ہے۔ کوئی بھی حور کو اچھا نہیں سمجھتا۔ کتنے تحقیر آمیز جملے تھے ماما کے۔۔۔ اس کم حیثیت لڑکی نے اس کی سوچ بھی پست کر دی ہے۔ اودہ ماما۔۔۔۔۔
 طارق کو شدید تکلیف پہنچی تھی ان جملوں سے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی ماں کسی انسان کے بارے میں ایسی سوچ بھی رکھ سکتی ہیں۔

اس نے اسٹیزنگ موڑ لیا، اسے گھر تو آنا ہی تھا۔ گھر آ کر وہ چپ چاپ کپڑے بدل کر اپنے بستر میں پڑ گیا۔ صبح وہ جلدی اٹھنے کا عادی تھا لیکن آج صبح وہ بستر پر پڑا رہا۔ اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے سوتا دیکھ کر حور کو حیرت ہوئی۔

وہ دیر سے سوتا اور جلدی اٹھتا تھا۔ وہ اس کے معمولات دیکھتی آرہی تھی۔ وہ ناشتا کر کے واپس آ گئی، وہ تب بھی سو رہا تھا۔ اب اسے گڑبڑ محسوس ہونے لگی تھی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہے۔ جو وہ بے سدھ پڑا ہوا ہے۔

وہ بہت دیر تک متذبذب کیفیت میں ادھر ادھر چکراتی رہی اور پھر اس سے رہا نہ گیا۔ ذرا سالخاف اس کے چہرے سے ہٹایا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ پیشانی پہ بال بکھرے پڑے تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ حور نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پہ رکھا تو وہ انگاروں کی طرح دھک رہی تھی۔

وہ پریشان ہو گئی۔ پھر لحاف میں سے اس کا ہاتھ باہر نکالا اور نبض دیکھنے لگی۔ اس کا ہاتھ بھی گرم ہو رہا تھا اور نبض بھی تیز چل رہی تھی۔

تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مضطرب سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے وضاحت کرنے لگی۔

”میں آپ کا ٹمپریچر نوٹ کر رہی تھی۔ ایسا لگا جیسے آپ کی طبیعت خراب ہے لیکن واقعی آپ کو بخار۔۔۔“

طارق نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور کروٹ لے کر لیٹا رہا۔ حور بے چین ہو گئی۔

”اگر آپ کی طبیعت خراب ہے تو آپ ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟“

طارق نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”اگر آپ کہیں تو میں کسی کو بلاؤں؟“

”مگر تو نہیں رہا ہوں۔۔۔ کیوں سوار ہو رہی ہو میرے سر پر۔“

لہجہ روکھا تھا اور آواز سے لگ رہا تھا جیسے اس کا گلا بھی خراب ہے۔

”میں تو ہمدردی کر رہی تھی۔“ وہ تنک کر بولی تھی۔

”کیوں کر رہی نہیں مجھ سے ہمدردی تم۔۔۔؟“ وہ ڈپٹ کر بولا۔

حور کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”بھی میں نے کی ہے تم سے کوئی ہمدردی؟“

”کیا مطلب؟“ حور حیرانی سے اس کا سرخ چہرہ دیکھنے لگی۔

طارق چپ ہو گیا۔ پھر توقف سے بولا۔

”کوئی مطلب نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے واپس لحاف اپنے منہ پہ ڈال لیا۔ اب کی بار اس کا لہجہ

بہت نرم تھا۔

حور نے نہ سمجھتے ہوئے پریشانی سے اسے دیکھا تھا۔



”دوپہر میں ماما نے حلیم بنانے کو کہا تھا۔ انہوں نے شاید اپنی کسی دوست کے ہاں بھجوانا تھا لیکن شاید ماما بنا کر بھول گئی ہیں۔ آپ کے پاس اگر ان کا موبائل نمبر ہے تو انہیں اطلاع کر دیں۔ تاکہ میں اس ڈشوں میں نکال کر گارش کر دوں۔“

حور نے دلشیں سے کہا تھا۔

”واٹ۔۔۔ حلیم۔۔۔! کیسی بکواس چیزیں پکینے لگی ہیں اب ہمارے گھر میں۔ کون کھائے گا وہ حلیم۔“ دلشیں نے ناک منہ چڑھا کر بے زاری کا اظہار کیا۔ پھر بہن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا ماما نے خانساں کی چھٹی کر دی ہے جو ہمیں یہ تجربے بھگتنا پڑ رہے ہیں۔“ دلشیں کی اتنا ہٹ عروج یہ تھی۔

دل آویز نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور لا پرواہی سے حور کی طرف دیکھ کر بولی۔

”تم سے ماما نے جو کہا تھا تم نے وہ پورا کر دیا ہے نا۔ اب تمہیں زیادہ ایفی شنسی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ ماما کو ضرورت ہوگی تو منگوا لیں گی۔ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

حور کو ان دونوں کی بدتمیزی پہ غصہ تو بہت آیا۔ لیکن اس نے کمال برداشت کا مظاہرہ کیا اور چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔ وہ ان کے منہ لگ کر کوئی بد مزگی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ طارق گھر پر تھا اور اس کی طبیعت خراب تھی۔ جب طبیعت صحیح نہیں ہوتی تو اچھے اچھوں کے مزاج بگڑ جاتے ہیں اور وہ تو اپنی دونوں بہنوں کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ حساس تھا۔ اس لیے خاموشی کو ہی بہتر جانا اور رات کے کھانے کے لیے چاول صاف کرنے لگی۔ چاول صاف کرتے کرتے اسے خیال آیا کہ طارق صبح سے کمرے میں بھوکا، پیاسا پڑا ہے۔ کیوں نہ اس کے لیے چائے بنا کر لے جائے۔ جب وہ اوپر کمرے میں چائے لے کر گئی تو طارق بستر میں نہیں تھا۔ واش روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اسے حیرانی ہوئی کہ وہ اچانک بخار کی حالت میں کہاں چلا گیا۔

وہ بے دلی سے خود ہی چائے پینے لگی۔ تب ہی وہ گیلری سے نمودار ہوا۔ حور کو زور کا اچھو کا لگا، اس نے تیزی سے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”میں تو بھی تھی کہ آپ کہیں چلے گئے ہیں۔ مم۔۔۔ میں۔۔۔ یہ چائے آپ کے لیے لائی تھی۔“ طارق نے استہزائیہ انداز میں چائے کے کپ کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی طرف۔ پھر جیسے اس کی نگاہیں پلٹنا بھول گئیں۔ کا جل، سر مہ سے بے نیازی آنکھیں، خشک ہونٹ، چوڑیوں سے خالی ہاتھ اور ملگجے پڑے۔ وہ اس کی شریک سفر تھی یا۔۔۔ اس گھر کی معمولی ملازمہ تھی۔۔۔؟“

وہ چپ چاپ چائے اٹھا کر پینے لگا۔

اس کے بعد اس نے دراز میں سے ٹیبلٹ نکال کر پانی کے ساتھ لیں اور واپس گیلری میں چلا گیا۔

جہاں سے لان کا سارا نظارہ نظر آتا تھا۔

سر دی اس قدر تھی کہ ٹھنڈی ہوائیں اس کے وجود میں اتر رہی تھیں۔ اس کے باوجود اس نے

صرف ایک قیص شلواری پہنی ہوئی تھی۔

اس کی خاموشی حور کو پری طرح کھٹک رہی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ لیکن ہمتیں مجتمع نہیں کر پاتی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے ہمیشہ ہی بے جھجک بات کرتی تھی لیکن آج عجیب و غریب کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

پھر اپنی بے چین طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کی گرم چادر لے کر اس کی طرف بڑھی۔
”اتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے اور آپ نے گرم کپڑے بھی نہیں پہنے ہوئے۔ یہ چادر شانوں پہ ڈال لیں۔
ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“

وہ یونہی گم صم کھڑا سامنے دیکھتا رہا۔

”جب انسان کی روح جل رہی ہو تو جسم کو ٹھنڈک محسوس نہیں ہوتی۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔
”کوئی پریشانی ہے آپ کو۔۔۔؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

طارق نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ سے چادر لے کر ایک طرف پھینک دی۔

”تم نے کتنے گرم کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔۔۔؟“ اس کے بے ساختہ سوال پہ حور نے خود کو دیکھا اور ہنس پڑی۔

”مجھے زیادہ سردی نہیں لگتی۔ ویسے بھی میں ابھی تو کچن سے آرہی ہوں۔ کام کاج کرتے ہوئے سیر دی کہاں لگتی ہے۔ سردی تو فارغ بیٹھ کر لگتی ہے۔“ وہ جواب دیتے ہوئے خود ہی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

”تو سارا دن تم فارغ نہیں ہوتیں۔۔۔؟ یہی مصروفیت رہتی ہے تمہاری جو آج رہی ہے؟“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کبھی اس سے بھی زیادہ مصروف ہو جاتی ہوں اور کبھی بالکل فارغ۔۔۔ کیوں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ یہاں تمہاری کوئی عزت نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ میں بھی۔ اس کے باوجود تم یہ سب نوکری کس کے لیے کرتی ہو۔“

”تمہارے لیے۔ اپنی محبت کے لیے۔“ وہ کہنا چاہتی تھی لیکن چپ رہی۔

وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ حور کو کیلری میں کھڑے کھڑے سردی لگنے لگی تھی۔

”آپ یہ سوال و جواب کمرے میں بھی کر سکتے ہیں۔ یہاں بہت سردی ہو رہی ہے۔“ وہ اس سوال کو گویا ناٹل رہی تھی۔ طارق ہنس پڑا۔

”ابھی تو تم نے یہ کہا تھا کہ تمہیں سردی نہیں لگتی۔“

”سردی لگنا اور بات ہے اور سردی میں خواہ مخواہ کھڑے رہنا اور بات۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ سوچتے ہوئے طارق بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔

”اب پوچھیے۔۔۔ کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ۔۔۔؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ ایک دم پھر اجنبی ہو گیا۔
وہ اس کی بدلتی کیفیت کو محسوس کر کے خاموش ہو گئی۔ وہ بستر میں لیٹ کر ٹی وی دیکھنے لگا تھا۔
اسے رات کے کھانے کی تیاری کرنا تھی۔ اس لیے وہ بھی باہر نکل گئی۔

رات کھانے سے ابراہیم کے چند دوست مدعو تھے۔ اس لیے اسے کچھ سے دیر سے فراغت ہوئی۔
اب وہ کمرے میں آئی تو۔۔۔ طارق بری طرح بخار میں پھنک رہا تھا۔ اسے گھر والوں کے سر درویوں
سنت حیرت ہو رہی تھی۔ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ طارق گھر میں ہے تو کیوں ہے۔ کیا اس کی طبیعت
اب ہے۔ یا کوئی اور وجہ۔ عجیب بات تھی۔ کسی کو کسی کی پروا ہی نہیں تھی۔ کوئی تو پوچھتا۔
اگر یہی سب کچھ اس کے گھر میں ہوتا تو باوجود سوتیلے رشتوں کے سب بے چین ہو جاتے۔ وہ
بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی سب ہی اس کی عزت کرتے تھے۔ نہیں بنتی تھی تو صرف ماں سے۔
یونہی وہ یہ محسوس کرتی تھیں کہ ابراہیم سب سے زیادہ حور العین کو چاہتے ہیں۔ اور پھر اس کا وقت ہی کتنا
کمزور تھا ان کے درمیان۔ نانو کے فوت ہونے کے بعد چند سال، ورنہ پہلی بڑھی تو وہ نہ خیال میں ہی تھی
۔۔۔“ اس نے اپنی سوچ کو جھٹکا۔

وہ ولید کے پاس آگئی اور طارق کے بخار کا بتایا۔
”لیکن بارہ بجے کون سا ڈاکٹر بیٹھا ہوگا۔ اگر طارق کی اتنی ہی طبیعت خراب تھی تو آپ مجھے فون کر
تیں۔ میں نے اپنا نمبر تو دے رکھا ہے نا آپ کو۔“
”اگر ڈاکٹر نہیں ہے تو کوئی میڈیسن ہی لادو۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔ تو ولید ہنس پڑا۔
”بہت فکر ہو رہی ہے آپ کو۔۔۔؟“ ولید کا انداز شرارتی تھا۔ حور جھینپ گئی۔
”سردی اتنی ہے کہ ڈراسی بے احتیاطی سے آپ بھی بیمار ہو سکتی ہیں۔ اس لیے آپ طارق کے
ہاں جائیں۔ میں میڈیسن لے کر آتا ہوں۔“
کورڈور کی لائٹس آف تھیں۔ حور ولید کے کمرے سے نکلی تو دلنشین کچن کی طرف جارہی تھی،
انہوں کا تصادم ہوتے ہوتے بچا۔ حور جلدی میں تھی۔ میٹرھیاں چڑھتی چلی گئی۔ اس نے بالکل توجہ نہ دی
دلنشین اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔



ساری رات بے چینی میں گزری تھی۔ وہ اس کے ماتھے پر پانی کی پٹیاں رکھتی رہی۔ یہ تو ولید ہی تھا
۔۔۔ دوپلا گیا تھا۔ ورنہ اس کے بس میں کہاں تھا کہ وہ اس مدہوشی کی حالت میں دوپلا پائی۔
رفتہ رفتہ اس کا نمبر بچر کم ہو رہا تھا اور وہ مطمئن ہو رہی تھی۔ اور نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔
صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کا سر طارق کے بازو پہ تھا طارق نے اس کی جانب کروٹ لے رکھی تھی
اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ وہ اتنا منہمک، اتنا مگن تھا کہ اسے حور کے جانے کا پتا ہی نہ
پایا۔ اس کی نگاہ کلاک پہ پڑی تو دنگ رہ گئی۔ دس بج رہے تھے۔ ایک دم جھگٹے سے اٹھی اور بستر سے نکلنے
لگی تو طارق نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”میں انڈے سمیت چار سلاسل کھا چکا ہوں۔“
 ”اس لیے کہ میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے بے دلی سے کہتے ہوئے نظریں چرائی تھیں۔
 ”اب اس دل کو سمجھا لو۔ ہم سے بچنا نہ لے۔ ورنہ بہت برا ہوگا۔“ وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے
 اور کی سانس اٹک گئیں۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ طارق اس کے ساتھ بھی اس طرح کی بات
 کرے گا۔

حور نے بمشکل چائے اپنی اندر اتاری تھی۔ وہ خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اپنے
 ہارے اور کانوں کی سرخی کو طارق کی نگاہوں سے پوشیدہ بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ چائے کا کپ رکھ کر وہ برتن
 اٹھانے لگی تو طارق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آج سے تم کوئی کام نہیں کرو گی۔“ وہ محبت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اس گھر میں پہلے بھی
 ملازم تھے اور اب بھی ملازم موجود ہیں۔ تم یہاں طارق کی لائف پارٹنر بن کر آئی ہو۔ ملازم نہیں۔“
 حور نے حیرت سے طارق کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا یا پلٹنے کو اپنی خوش قسمتی سمجھ سکتی تھی۔ ہواؤں
 میں اڑ سکتی تھی۔ لیکن اس نے اپنے قدم زمین سے اٹھنے نہ دیے اور اعتماد سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔
 ”گھر کے کام گھر کی عورتیں ہی کرتی ہیں۔ اس میں ملازماؤں والی کون سی بات ہے۔“
 ”لیکن اس گھر میں ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ تم یہاں گر کر کبھی بھی اپنا آپ نہیں منوا سکتیں۔ آج سے
 تمہارا حق اور حیثیت ہے، تم اس پہ قائم رہو گی۔“

حور الجھ رہی تھی۔ ایک دم اچانک ایسا ہو جانا۔ یا تو وہ پہلے ڈرامہ کر رہا تھا۔ یا اب۔۔۔ لیکن اس کی
 آنکھوں سے محبت چھلک چھلک جاتی تھی۔ حور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نظریں کترائیں۔
 ”شام کو تیار رہنا۔۔۔ ہم کہیں باہر گھومنے چلیں گے۔ ساتھ ہی تمہارا چھوٹا ساقز ہے۔ وہ بھی
 ادا کرنا ہے۔“ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

”تمہاری رو نمائی کا تحفہ جو مجھ پہ آج تک ادھار ہے لیکن آج میرے ساتھ چل کر تم خود ادھار چکتا
 کر آؤ گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 حور کی سماعتیں یقین و بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔

اچانک طارق کو اس سے محبت ہو گئی تھی۔ یا اس پر رحم آ گیا تھا۔۔۔ یا اپنے ہونے کا احساس دلا کر
 وہ اسے۔۔۔ چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ بہت دیر تک واہموں اور وسوسوں میں گرفتار رہی۔
 پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اسے خود کو بہت سنبھال کر چلنا ہے۔ اگر وہ یوں طارق کے کہنے سے
 زندگی کا رخ پلٹنے کی کوشش کرے گی تو اس کے لیے مزید مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ یہ سوچتے ہوئے اس
 نے خود کو ہلکا چھلکا محسوس کیا تھا اور بالکنی میں آ گئی تھی۔

یہاں سے لان کا منظر کتنا خوب صورت لگتا تھا۔ اس منظر میں اچانک دل آویز کولان میں مصروف
 کچھ کر حور کی نگاہیں ایک جگہ پہ ٹھہر گئیں۔ دل آویز پودوں کو خود اٹھا اٹھا کر ترتیب سے رکھ رہی تھی اور مالی
 منی کھودنے میں لگا ہوا تھا۔
 حیرت کی بات تھی۔ آج سورج کس طرف سے نکلا تھا۔ دل آویز کا اس طرح مٹی میں ہاتھ ڈالنا۔

اسے لگا جیسے دل آویز کچھ کہہ رہی تھی۔ اس وقت وہ نہایت جذباتی کیفیت میں دکھائی دے رہی تھی۔ گے سارے ملازم اس کے ارد گرد اکٹھا ہو گئے تھے اور اس کے ساتھ کام کر رہے تھے۔
حور کو تجسس ہوا کہ وہ جا کر سنے وہ ملازموں کو کیا کہہ رہی ہے۔ وہ اتر کر نیچے آ گئی۔

”میں اس گارڈن کو ایسا بنانا چاہتی ہوں کہ لوگ یہاں آئیں تو حیران ہو کر اسے دیکھیں۔ یہاں مجھے یہ معمولی پودے نہیں لگانے۔ بہت نایاب قسم کے پودے لگانے ہیں۔“ دل آویز کہہ رہی تھی۔
”وہ کیا سمجھتی ہے، اچھے اچھے کھانے بنا کر سب کو اپنا گرویدہ کر لے گی اور پھر رفتہ رفتہ سارے گھر پر چھانچا جائے گی۔ یہ ہمارا گھر ہے۔ یہاں کی ہر چیز ہماری مرضی، پسند سے ہونی چاہیے۔ دلنشین صحیح کہہ ہے۔ ماما نے تو ساس بننا سیکھا ہی نہیں۔ لیکن وہ بھول میں ہے۔ اگر ماما گھر میں دلچسپی نہیں لیتیں تو اس مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر جگہ حور ہی حور ہو۔ میں اس کے خواب جلد توڑ دوں گی۔“
اچانک دل آویز نے سر اٹھایا تو حور العین سامنے کھڑی تھی۔ دل آویز کے لب بھینچ گئے۔ اور ملازموں پہ چلانے لگی۔

”کیا میں نے تم سب لوگوں کو یہاں منہ دیکھنے کے لیے بلایا ہے۔ یہ پودے درست کرو۔“
حور دلچسپی سے سارے عمل کو دیکھتی رہی۔ پھر سارے ملازم ادھر ادھر ہو گئے تو حور۔۔۔ دل آویز کے قریب آ گئی اور اس کی محنت کو سراہتے ہوئے بولی۔
”بہت خوب صورت ترتیب دی ہے تم نے کیا رویوں کی۔ شاید میں کوشش کرتی تب بھی ایسا کر پاتی۔“

حور کی تعریف پہ دل آویز نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر استہزائیہ بولی۔
”تم کیا سمجھتی ہو۔ اس جھوٹی تعریف سے میں بہل جاؤں گی۔ بے وقوف سمجھتی ہو تم مجھے۔ میں تمہاری برائیاں کر رہی ہوں اور تم مجھے کھن لگا رہی ہو۔ مجھے تمہاری نہ کسی ہمدردی کی ضرورت ہے اور ہی محبت کی۔۔۔ سمجھیں تم۔۔۔؟“

حور چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ دل آویز کے لہجے میں حور کے لیے نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔
”محبت۔۔۔ ہمدردی کی۔۔۔ تمہیں نہیں مجھے زیادہ ضرورت ہے۔ جھوٹی ہی سہی کوئی تعریف نہ کر دے۔ اسی جتو میں وقت گزر جاتا ہے۔ اپنائیت کے بول ہی مل جائیں۔ ساعتیں اسی کی تلاش میں رہتی ہیں۔ بچپن میں ماں باپ کا پیار نہیں ملا تو کیا ہوا۔۔۔ زندگی گزر رہی گئی۔“
دل آویز نے حیرت سے حور کی طرف دیکھا۔

حور کے چہرے پہ مایوسی اور آنکھوں میں محرومی تھی۔
دل آویز کو یقین نہیں آیا کہ حور العین اندر سے اتنی شکستہ بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو اسے بہت پر اعتماد اور بہت خوش سمجھتی آرہی تھی۔

”تمہاری یہ محرومی تمہاری ماں کے نہ ہونے سے ہے۔ یا زندگی کی ان آسائشوں کے نہ ہونے سے جو تمہیں اب میسر آئی ہیں۔“ دل آویز کی ہمدردی میں اب بھی طنز پوشیدہ تھا۔ حور نے نگاہ غلطہ دل آویز پہ ڈالی۔

”اگر ایسا ہوتا تو مجھے آج بہت خوش ہو جانا چاہیے تھا۔ کسی بھی چیز کی کمی تو نہیں تھی پھر میرے پاس۔“ حور کے ہونٹوں پر تلخ تبسم بکھرا اور پھر معدوم ہو گیا۔ وہ وہاں رکی نہیں۔ تیزی سے چلی گئی۔ دل آویز متحیر سی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ واپس اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئی۔ مگر اس کا دھیان اب بھی حور کی طرف تھا۔ اس نے بے دلی سے کھربا پھینک دیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے اندر آ گئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ نہا کر کپڑے بدلے گی۔ پھر اپنے کمرے میں جائے گی لیکن حور کو کچن میں دیکھ کر وہ اسی طرف آ گئی۔ حور دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ اسے کھانا بنانا دیکھ کر دل آویز کو نئے سرے سے اس سے چڑھوس ہوئے لگی۔

”تم دوپہر میں کھانا فضول بناتی ہو، شاید میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ یہاں کھانے والا ہوتا ہی لون ہے۔ میں اور تم۔۔۔ میں بچ کرتی نہیں ہوں اور تم۔۔۔ کچھ بھی کھا کر پیٹ بھر سکتی ہو۔ فضول اتنا تکلف کرنے کی ضرورت کیا ہے؟“

وہ چڑچڑے سے انداز میں بولی تو حور نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کے سامنے فریج سے نکلی کھانے کی اشیاء رکھ دیں۔ جس میں کچی سبزیاں تھیں جو خراب ہو رہی تھیں، چند بچے ہوئے روزانہ لے سالن تھے اور کچھ جاول۔

”میں یہ سب کچھ گرم کر کے ملازموں کو دے رہی تھی۔ اور یہ سبزیاں وغیرہ خراب ہو رہی تھیں۔ فریج کی صفائی کرتے ہوئے میں نے یہ سامان باہر نکالا تھا۔“

دل آویز کو چپ ہونا پڑا۔ چپ چاپ وہاں سے پلٹنے لگی۔ تب ہی اس کی نگاہ دھوپ میں پڑی چار پائی پہ پڑی جس پہ کچن لے برتن اور مسالوں کے ڈبے، فروٹ کی ٹوکریاں دھو کر سکھائی گئی تھیں۔ زمین پہ اوون کے اسٹینڈ اور بالیاں بھی سوکھ رہی تھیں۔

اس سے پہلے تو اس گھر میں ایسے کام نہیں ہوتے تھے اور ہوتے بھی ہوں گے تو کسی کو کہاں پتا چلتا تھا۔

”جان بوجھ کر کام پھیلاتی ہے۔ اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنا سنگھڑا پا دکانے کے لیے سب کچھ کرتی ہے۔ لیکن اس کی چھٹی نہ کردی تو میرا نام بھی دل آویز نہیں۔“

یہ سوچتے ہوئے وہ نہانے چلی گئی۔ جتنی دیر اس نے غسل کیا، اس کے ذہن میں یہی بات رہی کہ نام کا کھانا وہ خود بنائے گی اور کیا بنائے گی۔ یہ بھی اس نے سوچ لیا تھا۔

اب اسے جلدی بھی تھی۔ کہیں حور بیگم ساتھ ساتھ شام کے کھانے کی تیاری ہی نہ شروع کر دیں۔ پھر اسے پتا ہی نہ لگا کہ وہ کب نہا کر نکلی مگر آج پہلی بار۔۔۔ بہت جلد ہاتھ روم سے نکلی تھی۔

اس نے بال سکھائے۔ اس دم اس کی نگاہیں آئینے سے الجھ گئیں۔ خشک روکھے سے بال اور روکھا بیبا سا چہرہ۔ نحیف سا وجود اور نکلتا ہوا قد، یہ دل آویز ابراہیم ہی تھی یا کوئی اور۔۔۔ جس کے پاس آٹا شوں کا ڈھیر تھا۔ رزق کی فراوانی تھی اور ملازموں کی لمبی قطار۔۔۔ اس کے باوجود وہ کتنی نحیف اور لڑوہ رنگ رہی تھی۔

وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ گھر میں سب ہی کچھ تو ہے پھر وہ۔۔۔ کون سی کمی ہے۔ جس نے اسے ایسا بنادیا۔ اسی پل حور کا سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

ہشاش ہشاش چہرہ، کھلے گلابوں جیسے ہونٹ اور مسکراتی ہوئی جان دار آنکھیں۔ زندگی میں آسانوں کی کمی کے باوجود وہ کتنی پھر پورھی۔

ایک غریب گھرانے کی لڑکی۔ جسے دل آویز ابراہیم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ مقابلے میں آچکی تھی اور دل آویز کو پیچھے چھوڑ رہی تھی۔

”یہ میں کیا سوچنے لگی ہوں۔ کیا مجھے یہ سب سوچنا۔ مائی گاڈ۔۔۔!“ دل آویز نے گہرا سانس خارج کیا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

”میں حور اعین سے مقابلہ کیوں کرنے لگی ہوں۔ کیوں وہ میرے سر پر سوار ہوتی جا رہی ہے۔“ وہ بستر میں گر گئی۔۔۔

وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ بھی محسوس کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن سوچیں خود۔ خود داس کا حصار کر رہی تھیں۔ آج پھر رمیض کا رویہ اسے یاد آ رہا تھا۔

”آخر ہمارا وقت ہی کتنا گزرا ہے ایک ساتھ۔۔۔ جو تمہیں بچے کی خواہش ہو رہی ہے۔“ وہ رمیض کے ساتھ خلوت میں ایسی ہی چڑچڑی ہو جاتی۔

”ایک ساتھ۔ یعنی تم اس بات سے خوب اچھی طرح واقف ہو جب ہی ہفتہ ہفتہ بھر ماں کے گھر جا کر بیٹھ جانی ہو۔“

”یہ بات تم ماما سے پوچھو۔۔۔ مجھے اس معاملے میں ٹارچر کیوں کرتے ہو۔“ وہ فرار کے پہلو نکال رہی تھی۔

”تو تم اپنی ماں سے کیوں نہیں کہتی کہ وہ ہمارے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ کیوں انکار نہیں کرتیں تم وہاں جانے سے۔“

”میں۔۔۔ میں بھلا کیوں انکار کروں گی؟“ اس نے نظریں چراتے ہوئے تنک کر کہا۔

رمیض غصے میں آ گیا اور اس دم اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو اس کے وجود پہ سانپ بچھو ریگنے لگے۔

ایک دم وہ بستر سے ایسے اٹھی جیسے ابھی یہ سب ہو رہا ہو۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور وجود میں اب بھی کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ اپنے کپڑے جھاڑتی رہی۔ اپنے ہاتھوں سے، چہرے سے، گردن سے کسی نادیدہ شے کو ہٹانے کی کوشش کرتی رہی۔

وہ ایسی کون سی چیز تھی جو ہٹ نہیں رہی تھی۔ اس کے چہرے کی بے زاری اس بات کا پتا دے رہی تھی۔

حور اعین نے بڑی حیرانی سے اس منظر کو دیکھا تھا وہ چائے لے کر آئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسے دل آویز کی ذہنی حالت پہ شبہ ہونے لگا۔ بہت دیر تک وہ خود کو کسی نادیدہ شے سے آزاد کرانی رہی پھر واش روم میں کھس گئی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اب دو چار گھنٹے وہاں سے نہیں نکلے گی۔

حورالعین بے تحاشا سوال دل میں لیے واپس کچن میں آگئی اور اگلے ہی پل وہ دنگ رہ گئی۔ دل آویز کچن میں آچکی تھی۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پتا نہیں آج بھوک کیوں لگ گئی۔“ وہ فرج کھولتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جیسے اسے اپنے کہے گئے لفظوں پہ خود ہی شرمندگی ہو رہی تھی۔

”میں نے ابھی چائے بنائی تھی۔ سوچ رہی تھی، اکیلے چائے پینا کتنا عجیب لگتا ہے لیکن اب آپ کے ساتھ پینے میں مزا آئے گا۔“ وہ دوستانہ سے انداز میں کہتے ہوئے چائے کے کپ لیے ٹیبل کی طرف آگئی۔

دل آویز پہلے تو جھجکی۔ پھر خاموشی سے بیٹھ کر کپ اٹھالیا۔



”کل تمہاری طبیعت خراب تھی اور تم نے کسی کو بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔“ ابراہیم نے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو طارق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”طارق! میں تم سے بات کر رہا ہوں۔۔۔ اور تم مسلسل مجھے نظر انداز کر رہے ہو۔ اس سے قبل میں نے تمہارے اندر ایسی ہٹ دھرمی نہیں دیکھی۔“

اب کی بار طارق نے چہرہ اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ اور لبوں پہ تلخ تبسم تھا۔

”ماما کی طرح آپ بھی کہہ دیجیے کہ یہ سب کچھ حورالعین کی وجہ سے ہو رہا ہے۔“ بیٹے کی بات پہ ابراہیم نے نظریں چرائیں۔

پھر جیسے ٹالتے ہوئے بولے۔ ”تمہیں اپنی ماں کا پتا تو ہے، وہ اول دن سے اس رشتے کے خلاف تھیں۔“

”اور میں اس رشتے کے لیے مراجار ہا تھا۔“ طارق کا شکوہ چبھتے ہوئے نشتر کی طرح آیا۔

”نہیں۔ تم نے تو مجھ پہ احسان کیا ہے میرا کہا مان کر۔ میں عمر بھر تمہارا یہ احسان نہیں اتار سکوں گا۔“

ابراہیم قدرے تلخ اور چڑچڑے لہجے میں بولے تھے۔ طارق تاسف سے باپ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

”ماما کا تو رویہ سمجھ میں آتا ہے لیکن مجھے آپ کا رویہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اچانک آپ کو مجھ سے شکایتیں کیوں ہونے لگی ہیں۔ پہلے ہر معاملہ مجھ سے ڈسکس کیا جاتا تھا اچانک ہی میں غیر بن گیا۔ صرف آپ کے سامنے سر جھکا دینے کی وجہ سے۔“

ابراہیم نے تڑپ کر بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر قدرے تھکے تھکے سے انداز میں اپنی کرسی پہ بیٹھ گئے۔

”میں نے اپنی لاپرواہی کی وجہ سے اپنی ایک بیٹی کو زندگی سے دور کر دیا ہے طارق! میں نہیں چاہتا، دلنشین بھی ایسی ہی کسی لڑکی کا شکار ہو۔ دل آویز کا دکھ میرے لیے کافی نہیں ہے کیا۔ جو میں دلنشین کو

”بھی۔۔۔“

”میں نہیں جانتا کہ دل آویز آبا کن مسائل سے دور چار ہو کر یہاں تک پہنچی ہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ سکتی ہیں۔ لیکن دلنشین جس راستے پہ چل رہی ہے وہ راستے زندگی کی طرف نہیں آتے۔ اگر آپ پھر بھی یہی سمجھتے ہیں کہ آپ اس کی بھلائی میں سب کچھ کر رہے ہیں تو مجھے فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“

طارق لا پرواہی سے بولا تو ابراہیم بڑی فکر مند لگا ہوں سے بیٹے کو دیکھنے لگے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ طارق معمولی باتوں کو اہمیت دینے کا عادی نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ ضرور تھا کہ وہ اس حد تک پہنچا تھا۔

اور اس حد کو جانچنے کے لیے انہوں نے دلنشین کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے کی تلاشی لی تھی۔ جہاں اس کے کلاس فیلوز کے ہمراہ اس کی بہت سی تصاویر تھیں۔ ان کے خاندان میں تو چیز کا تصور بھی نہیں تھا۔ دلنشین نے عجیب بے ہودہ ڈرائنگ کی ہوئی تھی۔ کیا وہ اس حلیے میں گھر سے جانی تھی۔ اس سے بھی زیادہ وہ بے ہودہ قسم کے لڑکوں سے چسپی بیٹھی ہے تو کہیں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بھاگ رہی ہے۔ اور پھر انہیں حیرت نے جکڑ لیا۔ جب ایک ہی تصویر انہوں نے بار بار دیکھی۔ وہ لڑکا کون تھا۔ کیا اس سے دلنشین جذباتی وابستگی رکھتی تھی۔ یادہ کوئی عام سادوست تھا۔ اس چیز نے ابراہیم کو سوچنے پہ مجبور کیا تھا۔۔۔ اور بار بار انہوں نے سوچا تھا کہ وہ اس سلسلے میں بیٹی سے پوچھیں۔

مگر پوچھ کر ملتا کیا۔۔۔

سو انہوں نے چپ چاپ ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

”میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ میں تمہیں اپنے ایک اہم فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔“

ابراہیم صاحب کی پرسوج آواز کافی دیر خاموشی کے بعد ابھری تھی۔

”دلنشین کے لیے رشتہ آرہا ہے۔ تمہاری ماں کی اور میری متفقہ رائے یہ ہے کہ ہمیں اس رشتے کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے بھی دل آویز کو غیروں میں دے کر ہمیں ایسا لگا ہے کہ اپنوں سے بہتر کوئی نہیں ہوتا۔ تمہاری خالہ۔۔۔ دلنشین کو اپنے بڑے بیٹے حافظ عباد سے لینا چاہتی ہیں۔“

طارق کو خوش گوار حیرت ہوئی۔

”لیکن۔۔۔ خالہ جان کا اور ہمارا اثیش۔۔۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔“ طارق نے دبے

لفظوں میں کہا۔

”اور کیا دلنشین اس رشتے پر راضی ہو جائے گی۔ حافظ عباد احمد مولانا ٹاپ آدمی ہیں۔ آج کل کی

لڑکیاں روک ٹوک کہاں برداشت کرتی ہیں۔“

”یہ مسائل ان مسائل کے سامنے معمولی ہیں۔ جن بنیاد پہ گھر میں تلخی بڑھتی جا رہی ہے۔ تمہاری ماں کا اپنے بہن بھائیوں کی طرف شروع سے بہت رجحان رہا ہے۔ تمہارے لیے وہ اپنی بیٹی لانا چاہتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ حور العین کو ناپسند کرتی ہیں۔ اس سرد جنگ کو ختم کرنے کا یہی واحد حل ہے کہ اب باقی رشتہ دار یاں تمہاری ماں کی مرضی سے ہوں۔“

طارق حیرت سے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”ایک کی زندگی بچانے کے لیے کسی دوسرے کی زندگی داؤ پہ لگا دینا کہاں کی دانش مندی ہے بابا۔۔۔!“

اور پھر یہ ہم یعنی میں یا ولید ہم اپنے مسائل کو خود حل کر سکتے ہیں۔ جبکہ دلنشین۔۔۔ دلنشین تو۔۔۔“

”تم دلنشین کی فکر مت کرو۔۔۔ وہ نا سمجھ ضرور ہے مگر ہم سے محبت تو کرتی ہے نا۔۔۔ اور عباد ایسا بھی کنز روینو نہیں۔ بڑا سلجھا ہوا، روشن خیال لڑکا ہے۔ اچھی طرح جانتا ہوں میں اسے۔۔۔“
 ”تو گویا آپ مطمئن ہیں۔۔۔؟“ طارق نے اطمینان سے باپ کی طرف دیکھا۔
 ”ہاں اور مجھ سے زیادہ تمہاری ماں مطمئن اور خوش ہیں۔ ہم جلد ہی اس ممکنہ کا اعلان بھی کرنے والے ہیں۔“

”اور دل آویز۔۔۔ کیا اس کا معاملہ یونہی رہے گا؟“
 ”ہاں۔۔۔!“ ابراہیم کا لہجہ اتنا سرد اور مستحکم تھا کہ طارق کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔
 ”ماما کی سوچ آپ سے مختلف ہے۔ وہ دل آویز کی مکمل علیحدگی چاہتی ہیں اور اس کے بعد۔۔۔ شاید۔۔۔ دوسری شادی۔“

طارق کا لہجہ دھیما اور جھجکا ہوا تھا۔
 ابراہیم غصے میں کھڑے ہو گئے۔
 ”تمہاری ماں پاگل ہو گئی ہے جو ایسے سنے دیکھتی ہے۔ دل آویز میرے چوکھٹ بھوڑھی ہو سکتی ہے لیکن یہ داغ۔۔۔ ہماری سات نسلوں میں نہیں لگا۔ میں اپنی پیشانی پہ لگا لگوں۔ نہیں ہرگز نہیں۔۔۔ یہ میرے جیتے جی نہیں ہوگا۔“

”آپ کو اپنے بابا دادا کے نام کی فکر ہے۔ دل آویز کی زندگی کی کوئی فکر نہیں۔ وہ ایک ذہنی مریض کے ساتھ کیسے زندگی گزار سکتی ہے۔“

”مت نار چر کرو مجھے طارق! مت تکلیف پہنچاؤ مجھے۔۔۔ زخم زخم ہو چکی ہے میری روح۔۔۔ مت لہو لہان کرو مجھے۔۔۔ ذہنی مریض مریض نہیں میری بیٹی ہے۔ وہ جہاں بھی جائے گی اس کے یہی مسائل ہوں گے۔ اس کے مسئلے کا حل دوسری یا تیسری شادی نہیں ہے۔ میں مزید رسوائیوں کا محمل نہیں ہو سکتا۔ مجھ میں سکت۔۔۔“

وہ رو رہے تھے بے آواز۔۔۔ صرف آنسوؤں سے۔۔۔ کرب ان کی روح تک سے ٹپک رہا تھا۔ طارق تیزی سے آگے بڑھا۔

”بابا۔۔۔! بابا۔۔۔! خود کو سنھال لے۔“

”میں بہت پچھتا رہا ہوں۔۔۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ ہم دل آویز کی شادی ہی نہ کرتے۔“
 ”کیوں سوچ رہے ہیں آپ ایسا، کیا کمی ہے دل آویز میں۔ جو ہم اس کی شادی ہی نہ کرتے۔ خوب صورت ہے، پڑھی لکھی ہے۔ سب سے بڑھ کر اس گھر کی بیٹی ہے۔ دراصل بابا۔۔۔ آپ نے

آسانی سے وہ کیسے جانب دار ہو رہے تھے۔ وہ سپر باور تھے۔ ماما کو کسی طرح سے بھی اس مسئلہ پر راضی کر سکتے تھے۔ لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ بجائے مفاہمت کی طرف لانے کے وہ خاموشی سے ماما کی بے جا حمایت کرنے لگے تھے۔ جس سے اس کے لیے مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں۔

”میں گھر میں کسی بھی محاذ آرائی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“

”جب آپ گھر کے بڑے ہو کر ایسا سوچ سکتے ہیں۔ تو میری حیثیت کیا ہے۔ میں بھی اپنی ذات کو متنازع نہیں بنا سکتا۔“

”اگر تمہاری جگہ ولید ہوتا تو وہ۔۔۔“

”کسی کی بھی پروا نہ کرتا۔۔۔ اور شاید اس کی خود سری سے سب خاموش ہو جاتے۔ ہمیشہ کی طرح باغی اور ہٹ دھرم۔ وہ یہ جنگ بھی جیت جاتا لیکن میں تو ازل سے صلح جو رہا ہوں۔ اس لیے شاید بزدل بھی ہوں لیکن یہ مت بھولیے گا، اس بزدل نے ہی قربانی کے لیے سر جھکا یا تھا۔ آپ کے وعدے کو ایفا کیا تھا۔“ وہ سارا بوجھ باپ کے کاندھوں پہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

اور اب اپنے آپ میں آکر وہ واقعی خود کو پا کا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ یہ بات کتنی خوش گوار تھی کہ بابا کو حور العین کی پروا تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اب اس پروا کو سامنے آنا چاہیے۔ اس نے مسکراتے ہوئے سر کرسی سے اٹکا لیا اور آنکھیں موند لیں۔ حور العین کا سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ بے باک اور لا پروا لڑکی، پھر خود سر بیوی اور پھر گھریلو کاموں میں مصروف ہو کر خود کو بھول جانے والی بیوی بننے لگی۔ کتنے روپ دیکھ لیے تھے اس نے لیکن کسی ایک روپ سے بھی وہ خود کو فتح یاب نہیں کر پائی تھی۔ فتح سے ہمکنار کیا تھا تو اس محبت نے جو وہ اس سے بچپن سے کرتی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا اور دوسرے ہی پل وہ اس کے موبائل کا نمبر مل رہا تھا۔



حور العین لیٹی ہوئی تھی۔ سیل فون بجنے پہ چونک کر اٹھ گئی۔ یہ وہ فون تھا۔۔۔ جو اسے اپراہیم نے سلامی میں دیا تھا۔ ابھی تک اس نے فون کو استعمال نہیں کیا تھا۔ اسے نمبر دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ آیا یہ راگ کال ہے یا اس کے کسی اپنے کا فون ہے۔ کون جان سکتا ہے اس نمبر کو۔

اس نے حیرت سے دیکھا اور کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد بالآخر فون اٹینڈ کر ہی لیا۔

”بڑی دیر کے بعد فون ریسیو کیا۔ کیا سوری نہیں؟“

طارق کی آواز سن کر وہ چونکی تھی۔ طارق کا لہجہ بہت خوش گوار اور اپنائیت سے لبریز تھا۔

اس لہجے پہ وہ جاں نثار کر سکتی تھی لیکن کیوں۔۔۔؟ اس نے یک دم خود کو سنبھال لیا۔

”میرے پاس سونے کے علاوہ بھی اور بہت سے کام ہیں۔“ وہ روکھے سے لہجے میں گویا ہوئی

تھی۔

بہت جلد بازی کا ثبوت دیا۔ دل آویز کے لیے آپ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص دیکھنا چاہیے تھا۔ رمیض لاکھ دولت مند ہے۔ مگر اس کا ذہن وہی سطحی ہے۔ میں مانتا ہوں۔ دل آویز آیا۔۔۔ کچھ دیکھو وہی سی ہیں لیکن اگر رمیض کچھ پڑھا لکھا ہوتا تو سنبھال لیتا۔ آپ مان لیں، وہ شخص احساسِ کمتری میں مبتلا ہے۔

”بس کرو۔۔۔ طارق۔۔۔ مت میرے زخم چھیڑو۔“
 ”مان لیجیے۔۔۔ آپ نے یہ فیصلہ جلد بازی میں تنہا کیا تھا۔“ طارق پے در پے چوٹ مار رہا تھا۔
 ”آپ نے یا کسی نے رمیض کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“
 ابراہیم نے تاسف سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ تلخ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔
 ”دراصل ہم نے دل آویز کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔“
 وہ کرسی کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے نہایت کمزور اور دل گرفتہ نظر آرہے تھے۔

طارق کو مصلحتاً خاموش ہونا پڑا۔
 پھر جیسے انہوں نے توقف کیا۔۔۔ اور بیٹے کی طرف دیکھنے لگے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں بابا؟“
 ”تم نے حور سے کیا تعلق رکھا ہوا ہے۔ دن بہ دن بجھتی جا رہی ہے وہ۔“
 طارق گنگ ہی تورہ گیا۔۔۔

”وہ یہاں ناگفتہ حالات میں آئی تھی لیکن تمہیں تو اس کے ساتھ رویہ صحیح رکھنا چاہیے تھا۔“ وہ جیسے شکایت کر رہے تھے۔

باب کی بھانجی سے ہمدردی پہ طارق نے اندر سے خوشی محسوس کی لیکن بظاہر بے نیازی سے بولا۔
 ”میں کس لیے اس کے ساتھ رویہ بہتر رکھوں۔ مسلط کی گئی ہے مجھ پہ وہ۔“
 وہ دانستہ رخ پھر کر دیوار گیر شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ابراہیم نے افسوس سے بیٹے کی پشت کو

دیکھا۔

”اگر میں کہوں کہ ہٹ دھرمی میں تم اپنی ماں پہ گئے ہو تو بے جا نہ ہوگا۔“ وہ شکستہ سے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ طارق نے یک دم رخ پھیر لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”آپ میں بھی کچھ کم تو نہیں ہٹ دھرمی۔ کیا یہ کہنا بے جا ہوگا؟“

”کیا چاہتے ہو تم۔۔۔؟“ ابراہیم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”اس کا جواب میں نے نکاح سے قبل دے دیا تھا۔“

”آخر برائی کیا ہے حور العین میں۔۔۔؟“ ابراہیم زچ ہو گئے تھے۔

”اس سوال کا جواب آپ ماما سے لے دیں۔ میں سریندر کر دوں گا۔“

”تمہیں پتا ہے تمہاری ماں کو اس سے بلاوجہ نفرت ہے۔“

”اور آپ کو سمجھنا چاہیے کہ میں اس نفرت کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔“

طارق نے بڑے اطمینان سے خود کو علیحدہ کر لیا تھا۔ ابراہیم کے چہرے پہ سوچ کے سائے گہرے دو گئے۔ ان کی آنکھوں کی بے چینی طارق سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اسی طرف تو وہ انہیں لانا چاہتا تھا۔ اتنی

”جی ہاں۔۔۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ طارق ہنستے ہوئے بولا۔

”آپ کو یہ نمبر کہاں سے ملا ہے؟“

”جہاں سے آپ کو فون ملا ہے، وہیں سے ہمیں نمبر مل گیا۔“

”کوئی کام تھا۔۔۔؟“ اس کے اجنبی لہجے پہ طارق کے دل میں کسکی ہوئی لیکن اگلے ہی پل وہ

مسکراتے ہوئے شگفتہ سے لہجے میں بولا۔

”کیا میں تمہیں صرف کام کے لیے ہی یاد کرتا ہوں؟“

”آج تک تو ایسا ہی ہوا ہے۔“ وہ بھی حور العین تھی۔ طارق کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”چلو ایسا ہی سمجھ لو۔ سب سے پہلا کام اپنا لباسِ فاخرہ جو تم نے نہ جانے کتنے دن سے زیب تن کیا

ہوا ہے فوراً چھین کر لو اور اچھا سا لباس پہن کر خوشبوؤں سے آراستہ پیراستہ ہو کر میرے انتظار میں بیٹھ

جاؤ۔“

طارق کے لہجے میں بہت سے اسرار نہاں تھے۔ حور کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔

”اس کے بعد میری من پسند خوشبو ”ہیوگو“ سے خود کو معطر کر لو۔ تاکہ لہسن پیاز اور مسالوں کی مہک

جو تمہاری آمد کی پیشگی اطلاع کر دیتی ہے کم از کم وہ زائل ہو جائے اور ہاں پائیز بالوں کو باندھنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تمہارے کھلے ہوئے بال ہی اچھے لگتے ہیں۔ شادی کے بعد بجال ہے جو تم نے

ایک دن بھی بال کھلے چھوڑے ہوں۔ شادی سے پہلے تو ہر فنکشن میں تمہارے بال کھلے رہتے تھے اور

خاص طور پہ عادل چاچو کی شادی میں۔ یار! قسم سے ساہرنگ تم پہ بے پناہ چلتا ہے لیکن آج میں تمہیں سیاہ

لباس پہننے کے لیے اس نہیں کہوں گا کہ آج ہم بوم سیاہ نہیں پوم محبت منانے جا رہے ہیں۔“

حور کو اس کے پوشیدہ احساسات جان کر عشی آنے لگی تھی اور وہ یقین دے بیٹھنی کی کیفیت میں لنگ

رہ گئی تھی۔

”اے۔۔۔ ہیلو کیا پھر سے سو گئیں۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ مسز طارق! سن رہی ہیں آپ؟“

”جی۔۔۔ میں۔۔۔ سن رہی ہوں۔“ وہ بدقت بولی تھی۔

”کم آن یار۔۔۔! صرف سنو تو نہیں کچھ کہو بھی۔“

”کیا کہوں۔۔۔؟“ وہ جیسے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

طارق ہنس پڑا۔۔۔ ”اب یہ مجھے حور العین کو بتانا پڑے گا۔ جو بولنا شروع ہوتی ہے تو کسی کو بولنے

کا موقع ہی نہیں دیتی۔ یہی کہتی تھیں نادادو تمہارے بارے میں۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ جو نانو کہا کرتی تھیں تم سب سنتے تھے لیکن جان کر انجان بنے رہتے تھے،

صرف مجھے اذیت پہنچانے کے لیے۔ صرف یہی نہیں بہت سی اذیتیں ہیں جن کا جواب تمہیں دینا ہے۔“

”ہیلو۔۔۔ کم آن یار۔۔۔! تم نے تو جی جی بوری کر دیا۔ مجھے کیا پتا تھا میری بیوی اتنی ڈل ہوگی۔

میں اس سے پہلے بارائے لکڑی آفس میں بیٹھ کر خصوصی اپنا سٹنٹ چھوڑ کر عشق لڑاؤں گا۔ اور وہ مراقبہ

میں جا بیٹھے گی۔ کچھ تو بول، پہلے تو تم بہت بولتی تھیں۔ بے تکان اور بے محل لیکن اب یوں لگ رہا ہے جیسے

تمہارے منہ میں زبان ہی نہیں۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔۔۔“ وہ خود ہی اپنی بات سے محظوظ ہو رہا

منا اور چشم تصور سے حور کا شر مانتا جھینپتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”وہ سب باتیں پرانی تھیں۔ اب نہ نانو ہیں اور نہ ہی حورالعین کی شرارتیں۔ سب کچھ یاد ماضی کا کیا ہے۔“ اس کے لہجے میں انجانا سا درد تھا۔

جیسے طارق نے صاف محسوس کیا تھا۔ وہ اس بو جھل پن کو دور کرنے کے لیے بے ساختہ بول پڑا۔
 ”دادو کی بہت سی باتیں تمہارے اندر پائی جاتی ہیں۔ اس بات کا اعتراف پا پاپی نہیں میں بھی کرتا ہوں۔“ وہ اب بالکل سنجیدہ تھا۔

حور کو پھر حیرانی نے آن دو بوجھا۔ آخر آج وہ کس کس چیز کا اعتراف کرنے والا تھا۔
 ”مجھے دادو کے ساتھ رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا ورنہ میں بھی ان سے بہت کچھ حاصل کر لیتا۔ میری بہت سی مصلحتوں نے مجھے ان کے قریب نہ ہونے دیا۔ آج مجھے اس چیز کا بہت افسوس ہوتا ہے۔“
 ”۔۔۔ تمہارا ساتھ میرے لیے یقینی تھا۔ شاید اسی لیے مجھے دادو کا پیار بلا واسطہ نہیں بالواسطہ مل رہا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“ حور تقریباً چیخ پڑی۔
 طارق کا قہقہہ جان دار تھا۔ ”ارے یار۔۔۔! تم تو واقعی ہوش میں آگئیں۔ مجھے تو لگ رہا تھا جیسے میں تمہیں لوریاں سنارہا ہوں اور تم سو رہی ہو۔ ویسے بھی لگتا ہے تمہیں سونے کا بہت شوق ہے۔“
 ”بائی داوے آپ کی یہ انفارمیشن غلط ہے۔ میں صرف رات کو ہی سوتی ہوں۔ اگر آپ کو اس چیز پر اعتراض ہے تو آپ خود ایک کام کریں۔ دن میں نہ سویا کریں تاکہ آپ کو رات کو بے محل جاگنا نہ پڑے اور دوسروں پر اعتراض کا موقع بھی نہ ملے۔“ وہ جل کر بولی تھی۔
 ”کمال کرنی ہو۔ دن بھر یہاں سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہوتی اور تم کہہ رہی ہو کہ میں یہاں سوتا ہوں۔ محترمہ میں یہاں کام کرنے آتا ہوں۔ کھیاں مارنے نہیں کہ جب موقع ملا ستالیے۔ یہاں تو ایک پل کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔“

”جی ہاں، آپ کی مصروفیت کا تو مجھے پچھلے بیس منٹ سے خوب اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ دن بھر اس قدر مصروف رہتے ہوں گے۔“
 ”ارے یار! وہ تو میں تم سے۔۔۔ ایسے ہی باتیں کرنے کو جی کر رہا تھا اور ہاں دیکھو، جس کام کے لیے تمہیں فون کیا تھا وہ تو میں بھول ہی گیا۔“
 ”شکر ہے۔ آپ کو کوئی کام کی بات بھی یاد آئی۔ ویسے بھی آج تک بنا کام تو آپ نے مجھ سے ہمیشہ کوئی بات نہیں کی۔“

”اے۔۔۔ اے۔۔۔ لڑکی باز آ جاؤ۔ بہت ہو گئی۔ تمہاری سوئی کام، کام اور کام پہ انک گئی ہے۔ کام بتانے پہ آ گیا تو تمہارے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔“
 ”میرے ہوش۔۔۔ ہونہر۔۔۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، میں کام چور ہوں۔۔۔؟“
 ”دیکھ لو۔۔۔ کچھ ایسے کام بھی ہیں۔۔۔ جو تم سے ابھی تک لیے نہیں گئے ہیں۔“ طارق کا لہجہ یل دم دھیما اور شرارتی ہوا تھا۔

حور نے بات فوراً بدل دی۔ ”میری نماز قضا ہو رہی ہے جو کچھ کہنا ہے، جلدی کہہ دیجیے۔“
 طارق اس کی گھبراہٹ پہ ہنسنے لگا۔ ”دل کر رہا ہے ابھی گھر آ جاؤں۔“
 ”اس میں میرے لیے کون سا کام ہے۔“ وہ انجان بنی۔
 ”وہ میں آ کر بتا دوں گی۔ فی الحال مجھے کہیں جانا ہے۔ برنس کے سلسلے میں رات میں دیر سے آؤں گا۔ اس لیے آج کا پروگرام کنسل ہے۔“
 ”کون سا پروگرام؟“ پھر وہ انجان بنی تھی۔
 ”صبح میں نے کہا نہیں تھا کہ تمہیں ساتھ لے کر جانا ہے۔ تمہارا کچھ قرض ہے وہ اتارنے کے لیے۔ فی الحال، آج وہ نہیں ہو سکتا۔ کل پرسوں یہ رکھ لیتے ہیں۔“
 ”اتنی جلدی بھی کیا ہے کل یا پرسوں پریشن تو آپ کو ملتی نہیں۔ اس لیے میرے سامنے بار بار شرمندہ ہونے سے بہتر ہے کہ اس پروگرام کو مستقل کنسل کر دیں۔“
 یہ کہہ کر حور نے فون بند کر دیا۔ ہنسی ضبط کرنے کی وجہ سے حور کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ تیر ہی اس نے ایسا مارا تھا کہ طارق کا سارا موڈ ہی غارت ہو کر رہ گیا۔ وہ شدید غصے میں بند فون کو گھور رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ حور کو ابھی اسی وقت کیسے اس بات کا جواب لوٹائے۔ چونکہ کام بھی ضروری تھا۔ سو اسے حور کا ”تختہ“ برداشت کرنا پڑا۔



”میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اور آپ لوگوں نے مجھ سے پوچھے بغیرہ کر لیا۔ کسی نے مجھے بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔“
 دل نشیں بری طرح تمللا رہی تھی۔
 دلشاد کو بیٹی کا یوں اتاؤ لانا ہو کر چننا چلا نا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
 ”دلنشین ہوش سے کام لو۔ آزادی دینے کا مطلب یہ نہیں کہ تم ماں باپ کی حیثیت کو ہی بھول جاؤ۔ ہم ماں باپ ہیں تمہارے۔ تمہارا اچھا برا خوب جانتے ہیں۔“
 ”میرا اچھا برا۔۔۔ آہ۔۔۔! میرا اچھا برا آپ کیا جانیں گی، آپ کے پاس تو ہمارے لیے وقت ہی نہیں ہے۔“
 ”دلنشین۔۔۔! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔“ دلشاد بیگم سخت غصے میں آ گئیں۔
 ”آپ اس لڑکی کی کن ترانیاں سن رہے ہیں۔ دل آویز بھی تو ہماری بیٹی تھی۔ ذرا بھی چوں چرا کی تھی اس نے۔“ دلشاد کا رخ ابراہیم صاحب کی طرف ہو گیا۔
 ”اپنی اسی خاموشی کو تو بھگت رہی ہے۔ اگر پہلے بول لی ہوتی تو آج اس حال میں نہ ہوتی۔“
 دلنشین نے استہزاء سے کہا۔
 ”تو تم جتنی ہوتی ہو، ہم سے زیادہ بہتر سوچ سکتی ہو۔“ ابراہیم صاحب نے پہلی بار گفتگو میں مداخلت کی تھی۔ دلنشین لا جواب ہو کر رہ گئی۔

”ہماری بات کا جواب دو لنشیں!“ ابراہیم صاحب کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ دلنشین کے وجود میں سنسنایٹ دوڑ گئی۔ وہ باپ سے ڈائریکٹ اپنی پسند کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے فی الحال تھوڑا سا وقت چاہیے تھا جس سے وہ کوئی راستہ نکال سکے لیکن ماں باپ اسی راستے کو بند کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم اب یونیورسٹی نہیں جاؤ گی۔ گھر داری میں دلچسپی لو۔۔۔ تاکہ مستقبل میں تمہیں دشواریاں پیش نہ آئیں۔“

”واٹ ڈو یو مین بابا۔۔۔!“ وہ بری طرح چیخ گئی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کیا کر ڈالے۔
 ”تو گویا آپ نے اپنے بیٹے کی بات کو درست جان کر یہ سب کچھ کیا ہے یوں کہیے مجھ پہ اپنی بیٹی پہ یقین نہیں رہا آپ کو۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے دلنشین! میں اس موضوع پہ تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“
 ”مگر میں کرنا چاہتی ہوں۔ میرے بھائی اپنی من پسند زندگی گزار رہے ہیں۔ میں ان پہ کبھی اعتراض نہیں کرتی تو وہ کون ہوتے ہیں مجھ پہ اعتراضات کرنے والے۔“

”تمہارے رشتے سے ان کا کیا تعلق ہے؟ یہ سراسر ہمارا فیصلہ ہے۔“ دلشاد کو بیٹی کا بڑھ بڑھ کر بولنا سخت ناگوار لگ رہا تھا۔

”میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں ماما! جو اس کھیل کو نہ سمجھ سکوں۔ پہلے طارق بھائی نے مجھ پہ شک کیا۔ اس کے بعد اچانک ہی میرا رشتہ کہیں سے آن ٹپکا اور آپ لوگوں نے فیصلہ بھی کر لیا کہ میں آگے نہیں پڑھوں گی۔ ان سب باتوں کو ملا کر یہی نتیجہ نکلتا ہے نا کہ مجھ پہ میرے کردار پہ شک کرتے ہوئے آپ میرے لیے شادی کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ مجھ سے پوچھ ہی لیا جائے۔ اس سب کو میں کیا سمجھوں؟“

دلنشین رونے لگی تھی۔ بیٹی کے احتجاج اور رونے پہ ابراہیم صاحب کے دل پہ بوجھ سا اڑا۔ البتہ دلشاد بیگم کا دل نرم نہیں ہوا تھا۔ وہ ناگواری سے بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ ابراہیم صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”فی الحال تم جاؤ اور آرام کرو۔۔۔ ہمیں بھی ابھی فنکشن میں جانا ہے۔ پھر بات کر لیں گے۔ ابھی ہماری طرف سے کچھ بھی حتمی نہیں ہے۔ لیکن تم اپنی طرف سے خوب سوچ سمجھ لو۔ جو پر پوزل ہم نے تمہارے سامنے رکھا ہے۔ اس پر سوچ کر پھر ہمیں جواب دینا۔“

دلنشین کے دل کو کچھ ڈھارس ہوئی تھی۔ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے چپ چاپ والدین کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

اچانک ہی تمام مسائل کو پیس پشت ڈال کر ماں باپ کا اس پر متوجہ ہو جانا۔ غیر معمولی نہیں تھا۔ وہ اپنے بستر پہ لیٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

خود پہ سے توجہ ہٹانے کے لیے اسے کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا تھا۔
 کس کے خلاف۔۔۔؟ اور پہلا دھیان اس کا حور العین اور طارق کی طرف ہی گیا۔ رگ و پے

میں نفرت اُٹھ آئی۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا ان ہی کی وجہ سے ہو رہا تھا۔
 اس کے ماما اور بابا نے سوچ کیسے لیا کہ وہ عباد احمد کی شریک سفر خوشی خوشی بن جائے گی۔
 راحیل کے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اسے چھوڑنا تو میرے لیے موت سے کم نہیں
 ہوگا۔
 اسی وقت اس نے فون اٹھایا اور راحیل کا نمبر ملائے گی۔ مسلسل گھنٹیاں جا رہی تھیں لیکن فون اٹھینڈ
 نہیں ہو رہا تھا۔
 دلنشین نے غصے میں آکر فون ایک طرف پھینک دیا۔



جب وہ کچن میں آئی تو وہاں حور العین پہلے سے ہی موجود تھی۔
 ”تم نے کیا کچن میں مستقل قیام کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے؟“ وہ سخت چڑچڑے انداز میں بولی تو
 حور العین نے چونک کر اسے دیکھا۔
 دلنشین سخت غصے میں تھی۔
 ”نہ جانے کیا گھول کر ماما اور بابا کو پلا دیا ہے کہ گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔“ حور حیرانی سے اسے دیکھ
 رہی تھی۔
 ”یہ گھر ہمارا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوگا۔ ہماری پسند سے ہوگا آئندہ ہمارے لیے کچھ پکانے کی
 ضرورت نہیں ہے تمہیں۔“ سمجھیں تم۔“
 یہ کہہ کر اس نے ملازموں کو چلا چلا کر کچن اکٹھا کر لیا۔
 ”اگر اس گھر میں خانساں تبدیل ہو گیا ہے تو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے علی میاں کو
 کھڑے کھڑے شرمندہ کر دیا۔ ”صرف باتیں بگھارنے آؤ یہاں یا لان میں بیٹھ کر دھوپ سکیں۔“
 علی میاں! گھر کا پرانا خانساں تھا۔ دلنشین کے بے عزت کرنے پہ سخت خائف نظر آ رہا تھا۔
 ”ہمیں تو چھوٹی بیگم صاحب نے کہا تھا کہ کھانا وہ بنایا کریں گی۔ یہاں سارا دن دل آویزی بی
 بھی ہوتی ہیں۔ انہوں نے تو بھی اعتراض نہیں کیا۔“
 ”اس لیے کہ اُسے گھر یا گھر سے متعلق کسی بھی الا بلا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور یہ چھوٹی بیگم
 صاحبہ تم کہہ رہے ہو۔۔۔ اس کا جو نام ہے نا۔ اسے اس کے نام سے ہی پکارا کرو۔ زیادہ بیگم صاحبہ
 دم بھلا لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔“
 وہ حقارت سے بولی۔ تو حور العین کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔
 ”میں اس گھر کے بڑے بیٹے کی بیوی ہوں۔ جتنی عزت و قدر طارق کی ہے اتنی ہی میری بھی
 ہے۔ میں اس کے ساتھ بھاگ کر نہیں آئی۔ باقاعدہ چار لوگوں کے بیچ عزت بنا کر لائی گئی ہوں۔ اب
 لوگ یہاں سے جاسکتے ہو۔“
 سارے ملازم کچن سے نکل گئے۔

حورالعین کے جواب پہ دلنشین سبک پا ہو گئی۔
 ”باقاعدہ اور باعزت۔“ وہ تنہا سے پھنکاری تھی۔ ”باقاعدہ ضرور آئی ہو۔ مگر باعزت نہیں۔ ماما
 دل آویز اور میں نے ابھی اس رشتے کو قبول ہی نہیں کیا۔“
 حورالعین ہنس پڑی۔

”مجھے جس نے قبول کرنا تھا، کر لیا ہے۔ باقیوں سے مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔“
 ”تم حد سے بڑھ رہی ہو۔“ دلنشین مستعل ہو گئی۔ ”ماما گھر پر ہوتی تو میں تمہارا حشر کروا دیتی۔“
 ”شکر کرو۔۔۔ کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ ورنہ یہاں بہت کچھ ہو جاتا۔“ حورالعین کچن سے نکلنے لگی۔
 دلنشین نے دل آویز کو آوازیں دینا شروع کر دیں اور چلا چلا کر آسمان پر اٹھا لیا۔
 مگر دل آویز گھر پر ہوتی تو سستی نا۔ وہ تو بیوی سیلون گئی ہوئی تھی اور یہ بات حورالعین اچھی طرح
 جانتی تھی لیکن دلنشین کو نہ بتائی۔ وہ کیوں بتاتی؟ وہ تو صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ دل آویز ہی نہیں دلنشین بھی
 اپنی مریضہ بن چکی ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں دل آویز۔۔۔ گھر میں داخل ہوئی تو لاؤنج میں دلنشین غصے میں بھری بیٹھی تھی۔
 ”دیکھو۔۔۔ دلنشین۔۔۔! میں نے کیسا ہیرا سٹائل بنوایا ہے۔ لگ رہی ہوں نا اپنی عمر سے دس
 سال چھوٹی۔۔۔“ وہ پرس سے آئینہ نکال کر بالوں میں برش چلانے لگی تھی۔
 اس کا دھان پان سا دود اور سوکھا لبوتر اچہرہ اور ہر وقت جلتی گلستی آنکھیں۔۔۔ اور سوکھے ہونٹ
 آج کتنے مختلف لگ رہے تھے۔ چہرے۔ زندگی چمک رہی تھی۔ تن پہ کپڑے بھی خوش رنگ دکھائی دے
 رہے تھے اور آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ دلنشین حیرت سے اس کی تبدیلی کو دیکھ رہی تھی۔
 ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو مجھے۔ کیا میں کوئی عجوبہ لگ رہی ہوں تمہیں؟“
 دل آویز متذبذب نظر آ رہی تھی۔ دلنشین نے گہرا سانس خارج کیا۔ گویا اپنا غصہ کم کرنے کی کوشش کر
 رہی ہو۔

”ہر شخص اپنی اپنی میں پڑا ہوا ہے کسی کو کچھ احساس ہی نہیں ہے۔“ غصہ تھا کہ ایک طوفان جو
 اندر نے کو بے تاب تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا کیا کہنا چاہتی ہو تم۔۔۔؟“ دل آویز، اس کے قریب بیٹھ گئی۔
 ”کچھ نہیں۔“

”کچھ تو ہے دلنشین جو تم۔۔۔“ پھر دل آویز چپ سی ہو گئی۔ اس کی عادت ہی نہیں تھی، کسی کے
 معاملے میں مداخلت کرنے کی۔ آج وہ کیسے دلنشین کو ٹٹولنے جا رہی تھی؟

دلنشین نے گہری نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔
 ”میں اس تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟“

”کون سی تبدیلی کی؟“ دل آویز حیرانی سے بولی۔

”آئینے میں خود کو جا کر دیکھو۔ لگتا ہی نہیں یہ وہ دل آویز ہے جو صرف ایک کمرے تک محدود ہو کر
 رہی تھی۔“

دل آویز اس کی بات پہ ہنس پڑی۔

”اچھا لگنا کون نہیں چاہتا۔۔۔؟“ وہ ایک ادا سے بولی تھی۔

”اس سے پہلے تو تمہیں اس بات کا خیال نہیں آیا۔“ دلشین کا لہجہ کٹھن تھا۔

”ہاں۔۔۔ لیکن اب آگیا۔ آخر۔۔۔ وہ ہی۔۔۔ وہ ہی۔۔۔ کیوں اس گھر میں۔۔۔ کیا صرف

وہی۔۔۔ خوب صورت لگ سکتی ہے۔“ دل آویز کے لہجے میں جلن تھی۔ ”آخر وہ ہے کیا۔۔۔ ہمارے

سامنے۔۔۔“ پھر دل آویز سرگوشی سے بولی۔ ”تمہیں پتا ہے اس گھر کے ملازمین بھی اس کی خوب صورتی

اور فٹنس کی تعریف کرتے ہیں۔ کیا واقعی۔۔۔ وہ تمہیں بھی اتنی ہی خوب صورت لگتی ہے؟“

دلشین کے آگ ہی تو لگ گئی۔

”کیا ہو گیا ہے سب کو۔۔۔ جیسے دیکھو وہی اس سے متاثر نظر آ رہا ہے۔“

”مم۔۔۔ میں کوئی متاثر نہیں ہو رہی۔ میں نے تو تمہیں ایک بات بتائی ہے۔“

”آج ہمارے اوپر اتنا برا وقت آگیا کہ ہم اسی کو موضوع بنا میں گئے۔ جبکہ اس نے

ابھی ابھی میرے ساتھ اتنی بدتمیزی کی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی اور اب میں سمجھ گئی ہوں کہ ایسا کیوں ہو رہا

ہے۔ وہ ہم سب کو باری باری اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتی ہے اور خود حکمرانی کرنا چاہتی ہے اس گھر

پہ۔۔۔“

”تم کھل کر بات کرو۔۔۔ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے اور تم کیوں منہ لگیں اس کے جو اس نے

تمہارے ساتھ بدتمیزی کی۔“

”میں اسے اس گھر میں قطعی برداشت نہیں کر سکتی۔“ یہی کہتی تھیں ناما بھی، پھر کیا ہوا۔ بھول گئیں

سب کچھ۔ گویا ہوش ہی نہیں ہے اور جب ہوش آئے گا وہ اپنا تسلط جما چکی ہوگی اور یہ سب کچھ طارق کرا

رہا ہے۔ اسے پتا تھا میں۔۔۔ ماما۔۔۔ اور تم اسے قبول نہیں کرو گے۔۔۔ اسی لیے وہ تمہیں تمہارے

گھر۔۔۔ اور مجھے میرے گھر بھجوانے پتل گیا ہے۔ مگر یہ سیاست کوئی نہیں سمجھ رہا۔“

دل آویز گہری سوچ میں پڑ گئی۔

”وہ میرا گھر کیسے بسا سکتا ہے۔ رمیض مرد ہی نہیں ہے۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔“ دل

آویز کی بات پہ دلشین سکتے میں آ گئی۔

حور العین کو سخت جھٹکا لگا تھا۔ وہ ان کی گفتگو چھپ کر سن رہی تھی۔

”یہ سچ نہیں ہو سکتا یہ دل آویز نے نئی چال سوچی ہے۔ رمیض سے پیچھا چھڑانے کے لیے۔ اسے

بچپن سے وہم کی بیماری ہے۔ ناپاکی کا وہم، یہ نارمل لوگوں کی طرح زندگی نہیں گزار سکتی۔ بقول ڈاکٹر

عبداللہ کے یہ صرف ایک عادت ہوئی ہے۔ جسے جتنا دہرایا جائے وہ اتنی ہی پختہ ہوتی جاتی ہے اور اس کا

دہرانا شعوری بھی ہو سکتا ہے اور لاشعوری بھی۔ رمیض مکمل انسان ہے لیکن وہ سطحی مزاج کا مرد ہے۔ وہ

ان تکلفات میں کیوں پڑے گا۔ اسے کیا فیوژن ہے۔ بقول ڈاکٹر عبداللہ کے۔ اس نے شادی کی ہے

اپنی ازدواجی خوشیوں کے لیے۔ جب وہ حاصل نہیں ہوں گی تو وہ کیسے خوش رہ سکتا ہے یا خوش رکھ سکتا

ہے۔ یہ بات تو اس فریق کو سوچنا چاہیے کہ وہ کس الجھن میں اپنے ساتھی کو مبتلا کر رہا ہے۔ کیا وہ اس

راستے سے فرار چاہتا ہے۔ یا اذیت دینا چاہتا ہے اپنے ساتھی کو۔۔۔ وہ سوچ رہی تھی۔“
 ”اگر اذیت دینا چاہتا ہے تو کیوں؟ اس کا مطلب ہے وہ بالکل نارمل ہے اور اگر فرار چاہتا ہے۔
 تو اس کیس میں گڑبڑ ہے کیونکہ وہ اپنی عادتوں کو اتنا پختہ کر چکا ہے کہ ان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر
 لیتا۔

اگر اس سے کہا جائے کہ وہ یہ کیوں کرتا ہے تو اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اگر اسے
 اس کے فعل سے روکا جائے گا تو وہ اپنے اندر ایک تناؤ کی کیفیت محسوس کرنے لگے گا۔ جو ضد اور
 پڑ پڑے پن کی صورت ظاہر ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں اسے اس کے حلال پہ چھوڑ دینا یا اس کا
 الگ تھلگ زندگی گزارنے پہ آمادہ ہو جانا۔ اس کے لیے بہتری نہیں ہے۔ بہتری تب ہی آئے گی۔ جب
 چلتی پھرتی زندگی اس کے سامنے ہوگی۔

ایسا انسان بعض دفعہ اپنے آپ کو مظلوم بھی سمجھتا ہے اور اندر سے احساس کمتری کا شکار بھی ہوتا
 ہے۔ جب وہ لوگوں کو خوش اور مگن دیکھتا ہے تو اپنے آپ کو اور بھی کمتر محسوس کرنے لگتا ہے۔
 وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے لوگوں سے تقابلی جائزے پہ مصر ہو جاتا ہے اور اس سبکیٹ کا
 یہی ایک کمزور پوائنٹ ہے کہ اس کی جلن اور حسد کی کیفیت کو اجاگر کیا جائے۔ جلن اور حسد بھی احساس
 کی ایک شکل ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ منفی احساسات کو اجاگر کرتے ہیں۔

جب یہ احساسات باہر آئیں گے تو دو صورتیں درپیش ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس طرح جھگڑا
 فساد پیدا ہونے کا امکان ہو۔ دوسرے یہ کہ سبکیٹ اپنی خامیاں چپکے چپکے دور کرنا شروع کر دے اور خود کو
 نمایاں کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اگر سبکیٹ اس طرح کرتا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ اس طرح اس
 کی ذات کے دروازے کھلتے ہیں اور اس سے تعاون کیا جاسکتا ہے۔“

ڈاکٹر عبداللہ کی گفتگو اور رائے صحیح صحیح ہے۔ یہ جارہی تھی۔
 اور اس میں صرف اس کی کوشش نہیں تھی۔ ابراہیم صاحب کا اسے مکمل تعاون حاصل تھا۔ یہ اور
 بات ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس عمل سے باخبر نہیں تھا۔

حور العین وہاں سے ہٹ گئی تھی، کیونکہ ان کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ لیکن ان کا ابھی موضوع
 بند نہیں ہوا تھا۔



رمیض کے بارے میں اس نے دل آویز کے منہ سے یہ بات دوسری بار سنی تھی کہ رمیض میڈیکل
 فٹ نہیں ہے۔

اس سے پہلے وہ یہ بات گھر کی ملازمہ کے سامنے اسے بتا چکی تھی کہ رمیض فٹ نہیں ہے۔ یہ تو سوچا
 بھی نہیں جاسکتا تھا کہ دل آویز اس کو اپنی انتہائی ذاتی زندگی کی کوئی بات بتاتی شاید وہ یہ بات سب میں
 اچھی طرح پھیلا دینا چاہتی تھی تاکہ مزید اس سے کوئی سوال ہی نہ نہ کر سکے۔

حالانکہ اس نے تو کوئی سوال بھی نہیں کیا تھا۔ اس کی اتنی مجال ہی کہاں تھی کہ اس کے نجی معاملے

میں مداخلت کرنے کی جرأت کرتی۔ وہ اس گھر میں رچ بس جانا چاہتی تھی۔ برباد ہونا نہیں۔۔۔ وہ دل آویز کی دل جوئی اور خوشامد تو کر سکتی تھی۔۔۔ سوال وجواب نہیں۔
باقی گھر والوں کی غیر موجودگی میں غیر محسوس طریقے سے وہ یہی کر رہی تھی کہ ایک دن دل آویز خود ہی پھٹ پڑی اور کہنے لگی۔

”مجھ سے اپنے ماں باپ کا غم نہیں دیکھا جاتا۔ وہ میری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ پریشانی خود مول لی ہے۔ اب کوئی بھی مجھے ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا کیونکہ جن حالات سے میں گزری ہوں کوئی بھی لڑکی انہیں برداشت نہیں کر سکتی۔“ ملازمہ نے ہمدردی کا اظہار کیا۔
”اگر اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد سے نواز دیتا تو یہ رشتہ کوئی بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔“
”اولاد!“ دل آویز نے اس لفظ پہ بڑے اچنبھے کا اظہار کیا تو ملازمہ ہی نہیں حورالعین بھی حیران ہو گئی۔

”ہاں جی اولاد، رب سونے نے آپ کو چار سال میں بھی اولاد نہ دی۔“
”چار سال میں، وہ رہی ہی کتنا تھی وہاں۔“ حورالعین دل ہی دل میں حساب کتاب لگا رہی تھی۔
”اولاد کیسے ہوتی؟ وہ اس قابل ہی نہیں ہے۔“ حورالعین اچھل پڑی تھی اور ملازمہ ساکت رہ گئی تھی۔

یہ بات کہتے ہوئے دل آویز کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور لہجہ بھی اجنبی سا تھا۔ اس کے بعد وہ وہاں نہیں رکی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔
ملازمہ سے نگاہوں کا تصادم ہوا تو حورالعین نے نگاہیں چرا لیں لیکن سیکنہ بوا تو ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ زمانے کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف تھیں۔

جھاڑ پونچھا چھوڑ کر حورالعین کے نزدیک آگئیں اور رازداری سے بولیں۔
”ہمیں یہاں کام کرتے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا لیکن آج آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ آپ نے دل آویز بی بی کے شوہر کو دیکھا ہے کیا۔ آپ کو دل آویز بی بی کی بات پر یقین آیا؟“

”سیکنہ بوا! آپ مجھ سے اس موضوع پر بات ہی نہ کریں تو بہتر ہے۔ آپ جا کر ان ہی سے پوچھیں، جنہوں نے یہ کہا ہے۔“

”تو بہ، تو بہ۔ مجھے کیا نوکری سے نکلنا ہے۔ میں تو خود حیران ہوں۔ یہ تو جی بہت بڑی بات ہے۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو چار سال کیوں دل آویز بی بی وہاں رہیں۔ اس بات کا فیصلہ تو چار دن میں ہی ہو جاتا۔“

ایک ان پڑھ جاہل ملازمہ عورت چار سیکنڈ میں اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی تو دل آویز اور اس کے والدین کیا سوچ رہے ہوں گے؟



محمود نے آکر بتایا کہ اس کا فون آیا ہے۔ محدود تیرہ چودہ سالہ لڑکا تھا جو سیکہ بنی بی کا ہی بیٹا تھا۔
 ”کیا دل آویز اور دلنشین لادنج میں ہی بیٹھی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں جی، وہ تو شاید کہیں چلی گئی ہیں۔“

”چلی گئیں؟ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے ہیں۔“

وہ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے نیچے آئی۔ فون اس کی چھوٹی بہن کا تھا۔

”آپی! میں زنیہ بول رہی ہوں، ابو کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ آپ کو یاد کر رہے تھے۔“

”کب سے خراب ہے ابو کی طبیعت اور تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”ابو نے خود ہی منع کیا تھا کہ آپ پریشان نہ ہو جائیں۔ ویسے بھی آپ شادی کے بعد ایک دو بار

ہی آئی ہیں۔ آپ تو خود فون بھی نہیں کرتیں۔ اس لیے آپ کے گھر فون کرتے ہوئے ہمیں بھی گھبراہٹ ہوتی ہے۔“

”اچھا فضول باتیں نہ کرو، میں ابھی آرہی ہوں۔“ وہ جھینپ سنا تے ہوئے بولی اور فون بند کر

دیا۔

گھر میں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ کس سے پوچھ کر جاتی اور کس کے ساتھ جاتی۔ وہ تذبذب میں مبتلا

ہو گئی۔

ابراہیم صاحب بھی گھر پر نہ تھے وہ دلشاد بیگم کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ ان کا نمبر ملایا تو ان کا فون

نہ تھا۔ ملاحظہ سے بھی کامنیکٹ نہ ہو سکا۔ وہ باپ کی بیماری کا سن کر سخت بے چارہ تھا،

بالآخر وہ تنگ آ گئی اور اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا طارق کا فون ضرور آئے گا اور

تب وہ اسے بتا دے گی۔



ڈرائیور کے ساتھ جب وہ گھر پہنچی تو رات کے نو بج رہے تھے۔ زنیہ، زویہیب اور نوشین اسے

دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان کی خوشی کا اظہار اتنا بے ساختہ اور دل موہ لینے والا تھا کہ وہ ساری ٹینشن

بھول گئی۔

”آپی آپ تو جا کر ہمیں بھول ہی گئی ہیں۔“ ان سب کی زبان پہ ایک ہی شکوہ تھا۔ حورالعین کو

شرمندگی سی ہوئی۔ اس کے چاروں چھوٹے بہن بھائی جو کہ بے شک سوتیلے تھے۔ مگر وہ تھے تو ایک ہی

باپ کی اولاد اور کتنا اسے چاہتے۔ کیوں وہ ایک ہی مخصوص دائرے میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ جہاں صرف

ان تنہائی، نفرت اور حقارت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

”اچھا میں ابو سے مل لوں۔“

”ابو تو گھر پر نہیں ہیں۔ ذیشان ابو کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہوا ہے۔“

”اور امی کہاں ہیں؟“ اس نے زنیہ سے پوچھا۔

”ظاہر ہے امی بھی ہمراہ ہی گئی ہیں۔ آپ سکون سے بیٹھیں ہمارے ساتھ کھانا کھائیں وہ لوگ

ابھی ابھی نکلے ہیں دیر تو لگے گی آنے میں۔“
اور پھر پل بھر میں ہی زنیہ اور نوشین نے انواع و اقسام کے کھانوں کی اشیاء اس کے سامنے
سجادیں۔

”زنیہ! نوشی! یہ سب اتنا تکلف تم نے صرف میرے لیے کیا ہے؟ کیا ضرورت تھی اتنا سب کچھ
کرنے کی۔“

”آپ ہمارے غریب خانے پہ اب نہ جانے کب تشریف لائیں گی۔ لہذا شرف بخش دیجیے۔“
زوہیب نے گورنش بجالاتے ہوئے کہا۔

”تم لوگوں کے روپے سے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے ابو کی طبیعت بہت زیادہ خراب نہیں ہے۔“ حور
اب ذہنی طور پہ بالکل ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔

زنیہ ہنسی بھری ہوئی۔ پھر اس کے سامنے سالن کا ڈونگار رکھتے ہوئے بولی۔
”ابو کو شوگر ہو گئی ہے۔“

”ابو کی فیملی میں سب ہی شوگر کے مریض ہیں۔ فقط ابو ہی رہتے تھے۔ ذہبی۔۔۔“ وہ پریشانی
سے زیر لب بولی۔

”پھر ابو کی ڈائنٹ وغیرہ بالکل تبدیل ہو گئی ہوگی۔“ وہ سالن نکالتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”سب کچھ ہی چھینچ ہو گیا ہے۔ ابو بہت احتیاط کر رہے ہیں۔“ روزانہ صبح واک پہ جاتے ہیں۔ نہار
منہ کا بلی چنوں کا پانی پیتے ہیں مین کی روٹی ناشتے میں لینے لگے ہیں۔“
”پھر شوگر کنٹرول ہوئی ابوی؟“

”کہاں۔۔۔؟ بہت ہی کمزور ہو گئے ہیں اور شوگر ایک منٹ میں آسمان پہ اور ایک منٹ میں
زمین پہ آ جاتی ہے۔ یہی سب سے بڑی پریشانی کی بات ہے۔“

زنیہ فکر مند سی بتا رہی تھی۔ پھر نوشین کہنے لگی۔

”ابو کی وجہ سے امی بھی بہت دیک ہو گئی ہیں۔ ہر وقت امی کو کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔“ وہ اداس
ہو گئی تو حور نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

”کچھ نہیں ہوگا امی ابو کو۔ کیوں فکر مند ہو رہی ہو۔ اچھا اور بہتر علاج، خوراک اور ذہنی سکون،
انسان کو ان بیماریوں کے خطرناک نتائج سے بالکل محفوظ رکھتا ہے۔ اور لوگ سالہا سال جیتے ہیں۔“

وہ نوشین کو تسلی دے رہی تھی۔ زنیہ کے چہرے پہ بھی فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔ جبکہ زوہیب
بالکل چپ چاپ بیٹھا تھا۔

نوشین اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

”آپ بہت بہادر ہیں آپ! ہم تو امی ابو کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ حور کو کتنا رنج ہوا

تھا۔

”ہم کتنے ہی بڑے ہو جائیں اور کتنے ہی بہادر لیکن اپنے ماں باپ کو کوئی نہیں بھولتا۔ آج میری
امی ہوتیں تو۔۔۔ شاید میں بھی تم لوگوں کی طرح ہوتی۔ پر جوش اور توانا۔“ یہ کہتے کہتے وہ رنجیدہ سی ہو گئی

تھی۔

”حور آئی! ہماری امی بھی تو آپ کی ہی امی ہیں۔“ نوشین نے گویا اپنی طرف سے حور کو دلا سا دینے کی کوشش کی تھی۔ حور کو اس کی معصومیت پہ ہنسی آگئی۔

”ہاں، کیوں نہیں، تمہاری امی بھی میری ہی امی ہیں۔“

”پہلے تو آپ ایسا نہیں کہتی تھیں۔ آپ تو کہتی تھیں اسماء تمہاری ہی امی ہیں۔ میری نہیں۔“ نوشین نے بے ساختہ کہا تو حور یک دم شرمندہ ہوگئی۔

”نوشین! تمہاری یہی بے وقوفیاں ہیں، الٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہو۔“

”نہیں زنیہ! اسے کہنے دو۔ مجھے اس کا بولنا بالکل برا نہیں لگا ہے۔“ پھر وہ چپ چاپ کھانا کھانے لگی۔

”ہاں میں پہلے ہی کہتی تھی۔ اسماء میری ماں نہیں ہے۔ نہ میں ان کی عزت کرتی تھی اور نہ ان سے محبت۔ بدلے میں انہوں نے بھی مجھے کچھ نہیں دیا۔ سوائے نفرت اور بے زاری کے نہ وہ اپنا دل بڑا کر سکیں اور نہ ہی میں۔ لیکن اب احساس ہوا ہے زندگی میں سمجھوتا ہی سب کچھ ہے اب میں کیا کر رہی ہوں؟ اگر میں یہی کچھ اپنی سوئیلی ماں کے ساتھ بھی کرتی تو شاید ان کے دل میں جگہ بنا لیتی۔ تب مجھے احساس نہیں تھا اور اب مجھے مکمل احساس ہے۔ اس بات کا کہ اپنائیت اور محبت کس چیز کا نام ہے۔“ وہ سوچ رہی تھی۔

”کہاں کھو گئیں آپ؟ کچھ بھی نہیں کھایا اور اٹھ کر کہاں جا رہی ہیں۔“

”میں ہاتھ دھونے جا رہی ہوں۔ شاید ابو آگئے ہیں۔ باہر رکشہ کتنے کی آواز آئی ہے۔“



وہ ارباب رحیم کے پاس بیٹھی تھی۔

”مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارے آنے سے میری تکلیف ختم ہوگئی ہے۔“ وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

”طارق کو بھی آنا جانا چاہیے۔ مگر تم ہی نہیں آتیں تو وہ کیونکر آئے گا۔“

”آپ مجھے بے حد شرمندہ کر رہے ہیں ابو! میں سمجھتی تھی، امی میرا یہاں آنا پسند نہیں کرتیں۔ اب

سوچتی ہوں یہ میری غلط سوچ تھی۔ امی اتنی بری نہیں ہیں جتنا میں انہیں سمجھتی تھی۔“

ارباب صاحب نے حیرانی سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ جو سر جھکائے بیٹھی تھی اور چادر کی جھال سے چھپڑ چھاڑ کر رہی تھی۔

”تم وہاں خوش تو ہو حور۔۔۔؟“ حور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”میں نے سنا تھا دلشاد دخت مزاج عورت ہے اور اس کی بچیاں بھی۔ مگر تمہاری نانو کے فیصلے کے

ماننے۔۔۔“

ارباب کو اندیشوں نے آگھیرا۔

”میں بہت خوش ہوں ابو۔۔۔ یہ فیصلہ نانو کا تھا اور انہوں نے ہمیشہ میرے لیے اچھا ہی سوچا

تھا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

اس کے چہرے کے سکون نے ارباب صاحب کو سکون کا احساس دلایا تھا۔ تب ہی اس کا موبائل بجا۔ اس نے نمبر دیکھا۔ فون طارق کا تھا۔ وہ فون اٹینڈ کرنے کی غرض سے باہر آگئی۔

”کیا بات تھی۔ تم نے مجھے فون بھی کیا تھا؟“ طارق شاید جلدی میں تھا۔

”ہاں وہ میں نے پایا کو بھی فون کیا تھا اور ماما کو بھی مگر فون نہیں مل رہا تھا۔“

”کیوں خیریت تو تھی؟“

”ہاں وہ ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں اپنے ابو کی طرف آئی ہوئی ہوں بس یہی بتانے کے لیے فون کر رہی تھی۔ مگر۔۔۔“

”اب کیسی طبیعت ہے انکل کی، کیا ہوا ہے انہیں؟“ طارق کے لہجے میں پریشانی تھی۔

حور العین اسے تفصیل بتانے لگی۔

”ٹھیک ہے تم ایسا کرو۔ فی الحال وہیں رکو مجھے آج رات کام کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی جانا پڑ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے ایک دو روز لگ جائیں۔“ اسے طارق کے رکنے کی اجازت دینے پر خوشی ہوئی۔

”اچھا سنو، انکل کا خیال رکھنا اور اپنا بھی۔۔۔“

حور العین کو ہنسی آگئی۔

”اے ہلو، سنو یہ کیا مسئلہ ہے۔ جب میں بولتا ہوں تمہاری بولتی کیوں بند ہو جاتی ہے؟“

اب حور العین کو جواب دینا ہی پڑا۔

”آپ کی اوٹ پانگ باتوں کا بھلا میں کیا جواب دے سکتی ہوں؟“

”آ۔۔۔ پ۔۔۔ اللہ رے۔ اندازِ مخاطب۔“

”میں کیا آپ کی عزت نہیں کرتی؟“ وہ شکوہ کر رہی تھی۔

”نہیں!“ وہ سچائی سے بولا۔ ”اور عزت تو تم میری جب بھی نہیں کرتی تھیں جب میں تمہارا استاد

تھا۔ البتہ محبت۔۔۔ محبت تم مجھ سے شروع سے کرتی ہو۔“

حور العین کو اس کا اترانا سخت زہر لگا تھا۔

”میں آپ کی عزت کرتی ہوں نہ آپ سے محبت۔“

”اب تو نباہ کرنا ہی پڑے گا مجھے غریب کو۔ دادوسر منڈھ کر جوگئی ہیں۔“ طارق کے طنز پر حور کو غصہ

آگیا۔

”اس بات کا جواب تو میں تب ہی دے سکتی تھی جب آپ کے رو برو ہوتی۔“ وہ گویا دانت کچکا کر

بولی تھی۔ طارق نے بے حد لطف لیا تھا۔

”کوئی بات نہیں منظر طارق! ایسے مواقع بار بار آئیں گے۔ جب ہم آپ کے اور آپ ہمارے

رو برو ہوں گی۔ تب آپ کی جراتیں بھی دیکھ لیں گے۔“ طارق کا لہجہ کچھ معنی خیز تھا۔

”حور یک دم زبردست ہوگئی۔ اسے گم صم پا کر طارق دل کھول کر ہنسا تھا۔



”انسان کو اتنا بھی بزدل نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ نہ کر سکے۔ کس چیز کا دباؤ ہے آخر تمہارے اوپر جو تم کھل کر اپنی رائے کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔“ دلنشین راحیل کے رویے پہ بری طرح جھلس چکی تھی۔

”تم یہ چاہتی ہو کہ جس طرح تم سوچتی ہو، سب اسی طرح سے کریں۔ آخر میری بھی کچھ مجبوریات ہیں۔“ راحیل بری طرح بے بس دکھائی دے رہا تھا۔

”تم جو میرے سامنے اس قدر بے بسی کا اظہار کر رہے ہو مجھے یہ بتاؤ کیا میں تم سے نکاح کا مطالبہ کر رہی ہوں یا میں نے یہ کہا ہے کہ ہم کورٹ میرج کر لیں گے؟“

”میں نے ایسا کب کہا ہے؟“

”میں تمہارے لیے اتنا آگے آگئی ہوں کہ اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتی۔ تم مجھے صاف صاف بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟“

راحیل نے سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر کے بعد آہستگی سے بولا۔

”میرے اور تمہارے اسٹیشن میں بہت فرق ہے۔ میں غریب شخص کی اولاد ہوں اور تم دولت مند باپ کی بیٹی۔ مجھے اپنا کیریئر بنانے کے لیے تمہارے برابر کے لیے وقت چاہیے۔ کیا تم تب تک میرا انتظار کر لو گی؟“

دلنشین اس کی طرف دیکھ کر لا پرواہی سے ہنس پڑی۔

”بس اتنی معمولی سی بات جسے تم نے اپنے دل کا بوجھ بنا رکھا تھا۔“

”یہ بات معمولی نہیں ہے دلشی! ایسی باتیں تب تک معمولی لگتی ہیں، جب تک انسان پریکٹیکل زندگی میں قدم نہیں رکھ لیتا۔ پریکٹیکل لائف میں یہی بنیادی چیزیں کامیابی اور ناکامی کا سبب بنتی ہیں۔“

دلنشین اس کی دلیل پہ چڑی گئی۔

”یہ باتیں اب کیوں کہہ رہے ہو۔ جب تم نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا تب نہیں سوچا تھا کہ یہ دوستی دلوں کی زنجیر بھی بن سکتی ہے۔“

راحیل تڑپ کر بولا۔

”اچھا مجھے تھوڑا سا وقت تو دو۔ میں کوئی راستہ نکالتا ہوں۔“ اس کا لہجہ بہت کمزور سا تھا۔

”تم تھوڑا سا وقت مانگ رہے ہو جبکہ میں تمہیں اس موضوع پہ سوچنے کے لیے ساری عمر بھی دے دوں تم تب بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔“

تدفیر سے کہتے ہوئے دلنشین اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔



اب وہ تنہا لاہوریری میں بیٹھی تھی۔ اتنا گر کر اور جھک کر اس نے راحیل سے زندگی بھر کا ساتھ مانگا تھا۔ پھر بھی اس نے پذیرائی نہیں کی۔ اگر وہ اتنا ہی کہہ دیتا دلنشین تم صرف میری ہوا اور وقت آنے پہ اس

چیز کا فیصلہ ہوگا کہ تمہیں کون اپنائے گا۔

”آہ۔۔۔!“ دلشین، اپنی خوش فہمیوں پہ خود ہی ہنس پڑی۔

”وہ تو اپنی مجبوریوں کا ہر کر رہا تھا مجھ سے یقین دہانی چاہ رہا تھا۔ کیا میں اس کا انتظار کر سکوں گی کیا مجھے نہیں پتا کہ اس کی مجبوریوں کیا ہیں۔ وہ سات بہنوں کا اگوتا بھائی ہے۔ سب کی امیدوں کا مرکز۔ میں شاید اس کی ترجیحات میں آخری نمبر پر ہوں۔ وہ یہ کہنا تو شاید بھول ہی گیا۔“ پھر دلشین اپنی بے وقوفی پہ خود ہی ہنس پڑی۔

”کیا مجھے راحیل سے بہتر اور اچھا نہیں مل سکتا۔ صرف اس کے حسن پہ مر مٹی ہوں میں۔ یا اس کی اس ذہانت پہ جس کی بنیاد پہ وہ ساری یونیورسٹی میں شہرت رکھتا ہے۔ ان دو چیزوں کے سوا تو اس میں کچھ بھی خاص نہیں ہے۔ لیکن یہی تو سب کچھ ہے جو اور لڑکیاں بھی اس پہتی ہیں۔ مگر وہ کسی کو بھی لفٹ نہیں کراتا۔ اس کی دوستی ہے تو صرف دلشین ابراہیم سے ہے اسی وجہ سے تو یہ اور سارہ بھی مجھ سے جلن اور حسد کا شکار رہتی ہیں۔

میری منگنی کی خبر یونیورسٹی میں پہنچ گئی تو سب سے زیادہ ٹوبیہ کو تکلیف ہوگی جو مجھے ہر وقت نچا دکھانے کے لیے اپنے باپ کی دولت کی نمائش کرتی رہتی ہے۔

میرا باپ بھی مجھ پہ جان چھڑکتا ہے۔ لیکن اتنی آزادی نہیں دے سکتا۔ جتنی آزادی ان لوگوں کو حاصل ہے۔ پھر ان لوگوں کا لائف اسٹائل بہت مختلف ہے۔ لیٹ ٹائمٹ ایک دوسرے کے ساتھ گھومنا پھرنا اور ہونٹنگ کرنا۔ اب مجھے بھی زنجیروں میں جکڑا جا رہا ہے مگر یہ زنجیر عباد کے نام کی ہی کیوں؟ عباد جیسے انسان کے ساتھ میں اچھی اور بھرپور زندگی نہیں گزار سکتی۔ مولانا ٹائپ حلیہ اور لیا دیا انداز مگر۔۔۔ میں راحیل جیسے انسان کے ساتھ بھی اچھی زندگی نہیں گزار سکتی۔ وہ بے چارہ تو مجھے بنیادی ضرورتیں بھی مہیا نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا محبت اہم نہیں ہوتی؟“ وہ الجھ رہی تھی۔

”ہیلو، کہاں کم ہو؟“ اس کے سامنے کرسی پہ کوئی آکر بیٹھا تھا اور بڑے بے تکلفانہ انداز میں اس کے سامنے ہاتھ نچایا تھا۔ وہ یک دم چونک گئی۔

”مجھے شکیل باجوہ کہتے ہیں۔“

وہ اس کے نام ہی سے نہیں اس کے کردار سے بھی بخوبی واقف تھی۔ ناگواری کی لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ میز پہ سے فائل اٹھا کر وہ کھڑی ہو گئی تو وہ سامنے آ گیا۔

”مجھے تمہاری یہ ادا بہت اچھی لگتی ہے۔ مگر آج کچھ اچھی نہیں لگی دلشین!“ اس نے بڑا چبا چبا کر اس کا نام ادا کیا تھا۔ دلشین کے تو آگ لگ گئی۔

”اس سے پہلے بھی تم میرا رستہ روک چکے ہو۔ میں خاموش رہی مگر اب میں پرنسپل کو تمہاری شکایت کروں گی۔“

”کیوں؟ میں نے تمہیں ایسا کیا کہا۔ جو تم میری شکایت پر پرنسپل صاحب سے کرو گی؟“

دلشین نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور ایک طرف سے ہو کر چپ چاپ نکلے گی۔ شکیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دلشین نے دوسرے ہی پل زوردار چھٹر شکیل کے چہرے پہ جڑ کر دیا اور گراسٹوڈنٹ

اکٹھے ہو گئے۔

شکیل یقیناً کوئی پیش رفت کرنا چاہتا تھا۔ مگر یک دم جھوم کو اکٹھا پا کر گڑبڑا گیا اور تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔

”کیا ہوا دلشین! خیریت تو ہے؟ سنا ہے شکیل باجوه سے تمہاری لڑائی ہو گئی ہے۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں، تم اس کے منہ کیوں لگیں؟“

”شٹ اپ!“ مختلف سوالات پہ دلشین زچ ہو گئی۔ اسماء اور اقصی خاموش ہو گئیں۔
”میں بھلا کیوں منہ لگوں گی ایسے لوگوں کے، میں ابھی پرنسپل کے آفس میں جاؤں گی اور اس کی کمپلین کروں گی۔“

”میرا خیال ہے تم فی الحال گھر چلو۔ اس کے بعد سوچنا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔“ راحیل نے اسے جھوم سے نکالا تھا۔

وہ چپ چاپ راحیل کے ساتھ جھوم سے نکل آئی۔
اب وہ راحیل کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ سخت الجھا ہوا اور پریشان دکھائی دے رہا تھا جبکہ دلشین ابھی تک غم وغصے کا شکار تھی۔

”تم نے اچھا نہیں کیا اس پہ ہاتھ اٹھا کر؟“ راحیل سے بالآخر ضبط نہ ہو سکا تو یہ کہہ بیٹھا۔
”واٹ ڈو یو مین؟“ دلشین نے اچھی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تمہاری غیرت گوارا کر سکتی ہے اس طرح تمہاری منگیترباہن کا کوئی ہاتھ پکڑے؟“

”وہ بات اور ہے۔ لیکن دلشین! ایک یونیورسٹی میں وقت گزارتے ہوئے ہم ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ بارہا ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے ہیں۔ کبھی اس طرح کا تھپڑ تم نے مجھے تو نہیں مارا۔“

”راحیل۔۔۔“ دلشین کا غم وغصے سے برا حال تھا۔ اس کا بس نہیں چلا تھا کہ وہ اس کا سر پھاڑ ڈالے۔

”اول تو شکیل باجوه میرا دوست نہیں ہے اور وہ کس کیلگری کا لڑکا ہے یہ سب جانتے ہیں بہر حال یہ میرا معاملہ ہے۔ میں خود اس سے نمٹ لوں گی۔“

”یہ صرف تمہارا ہی ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ میری قسمت بھی داؤہ پہ لگ چکی ہے۔ صرف اور صرف تمہاری وجہ سے۔ سنا تم نے اور یہی تھی میری لافعلقی اور خاموشی کی وجہ۔ لیکن تم جیسی ہٹ دھرم لڑکیاں صرف اپنا بھلا دیکھتی ہیں۔ تمہارا کیا ہے۔ تم ایک لینڈ لارڈ باپ کی بیٹی ہو۔ تم تعلیم ادھوری چھوڑ بھی دو گی تو تمہاری زندگی پہ کچھ اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن میرا۔۔۔ میرا تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔“

دلشین نے حیرت سے راحیل کی طرف دیکھا۔
”کیا کہہ رہے ہو تم۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ وہ بری طرح الجھ چکی تھی۔

راحیل کچھ نہیں بولا۔ چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔
”تمہیں۔۔۔ تمہیں شکیل باجوه سے معافی مانگنا پڑے گی۔“

”واٹ!“ دلشین اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ نفرت اور دکھ اس کے چہرے کے ہر نقش سے نمایاں تھا۔
 ”میں اور اس سے معافی مانگوں گی؟“
 راجیل کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔

”ہاں تمہیں اس سے معافی مانگنا پڑے گی، یہی تمہارے اور میرے حق میں بہتر ہے۔“
 ”تم شکیل باجوہ کو سجدے کرو، مجھے پروا نہیں لیکن آج کے بعد جان لینا۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ میں ساری زندگی شرمندہ رہوں گی کہ تمہارے ساتھ وقت گزارا۔ شکیل باجوہ کو میں نے پھڑ مارا ہے اور وہ مجھ سے معافی مانگے گا، یہ میں تمہیں دکھاؤں گی۔“
 دلشین نے حقارت سے کہا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتی وہاں سے چل پڑی۔
 راجیل نے بے چارگی سے اس کی پشت کو دیکھا اور پھر غصے سے زمین کو ٹھوک مار کر رہ گیا۔



وہ سو کر اٹھی تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل نے اسے متوجہ کر لیا۔ پھر اسے یہی خیال آیا۔ ہو سکتا ہے ماما کی کولیکز چائے پہ انوائینڈ ہوں۔
 ابھی وہ کسمنڈی سے بستر میں پڑی سوچ ہی رہی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ دلشاد کے ہمراہ دولڑکیاں تھیں۔ ایک کی گود میں بچہ تھا اور ایک کنواری معلوم ہوتی تھی۔ دلشین انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ ان دونوں نے سلام کیا پھر باری باری بیٹھتے ہوئے بے تکلفانہ انداز میں بولیں۔
 ”خالہ! دلشین تو بالکل آپ پہ گئی ہے۔ ہم نے تو اتنا عرصہ کے بعد دیکھا ہے۔ نہ خیال میں کہیں بھی تو نظر نہیں آتیں آپ کی بیٹیاں۔“
 ”پھر بھی دل آویز کو تو کبھی جانتے ہیں۔ دلشین کو تو ہم پہلی بار ہی دیکھ رہے ہیں۔“
 ان کی گفتگو پہ دلشاد ہنس پڑیں۔ ”نہ خیال میں یہ نہیں جانتیں تو تم لوگ کون سا آتے جاتے ہو۔“
 ”جلے یہ شکایت اب دور ہو جائے گی آپ کی۔“ وہ دونوں یکے بعد دیگرے کھلکھلائیں۔
 ”دلی بیٹا! یہ تمہاری خالہ کی بیٹیاں ہیں یہ بڑی رابعہ ہے اس کے تین بچے ہیں اور یہ ماریہ ہے۔ ایف اے کر کے گھر میں فارغ ہے۔“

”سنا ہے آپ یونیورسٹی جاتی ہیں؟“ ماریہ نے چہکتے ہوئے دلشین کی طرف دیکھا۔
 دلشین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دلشاد فوراً بول پڑیں۔ ”ہاں دلشین کا یونیورسٹی میں پہلا سال ہے۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے ہم نے بھی اسے روکا نہیں۔ ویسے تو دل آویز نے بھی ایف اے کیا ہوا ہے بس آنا فائنا پکی کی شادی کر دی۔ آہ، ہا کیا معلوم تھا کم عمری میں ہی بچی کو روگ لگا رہے ہیں۔ تین سال جس کھینچا تانی میں گزرے۔ ہمارے دل کو ہی پتا ہے۔“
 دل آویز کا دکھن کر رابعہ اور ماریہ بھی دل گرفتہ ہو گئیں۔

”اسی لیے تو کہتے ہیں غیر دی دولت سے اپنوں کی جھوٹی بہتر ہے۔“
 ”بس ایک غلطی ہو گئی۔ اب تو دلشین کو اپنوں میں ہی دیں گے۔“ دلشاد کی بات پہ رابعہ اور ماریہ

کھل انھیں۔

”ہمارے تو گھر کے نصیب جاگ جائیں گے خالہ! ہمارے گھر میں دلنشین جیسی بھابھی آگئی تو۔ امی کے سارے بچوں میں عباد سب سے سعادت مند اولاد ہے۔ ہم تو یہی کہیں گے عباد کی نیکی کا انعام ہے دلنشین۔“

”اچھا تم لوگ آپس میں باتیں کرو، میں باجی کے پاس جا رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر دلشاد کمرے سے نکل گئیں۔ وہ عباد کا تذکرہ اس کے سامنے کر رہی تھیں۔ مگر حیرت کی بات تھی اسے بالکل برا نہیں لگ رہا تھا۔ کہاں تو وہ اس ذکر پر ہی ہتھے سے اکھڑ گئی تھی اور کہاں اب اس کے وجود میں خوشی کے سوتے پھوٹنے لگے تھے۔

ان کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک اپنی ذات کا تجزیہ کرتی رہی۔ اس کے من میں کہیں بھی راحیل کا نام و نشان نہ تھا۔ عباد کے نام سے اپنی ذات کتنی مکمل مکمل سی لگ رہی تھی۔ عباد پڑھا لکھا تھا، خوب صورت تھا۔ اپنا ذاتی بزنس تھا۔ اس میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں کیا وہ ان خوبیوں پر مرئی تھی؟ ”نہیں!“ اس کے اندر گہری تنہائی نے پچھلی لی تھی۔ باوجود سب کچھ ہونے کے وہ بھی دل آویز کی طرح احساس کمتری کا شکار تھی۔ اپنے لیے کسی کا نام کسی کا ساتھ کتنا معتبر سا کر دیتا ہے دنیا اس رنگارنگی بھیر میں۔ وہ بھی کسی کے لیے اہم ہو گئی تھی۔ ٹھیک ٹھاک قدر دان لوگ ہیں۔ اس کی معمولی خوبیوں کو بھی بڑھ چڑھ کر سراہیں گے۔ اس کی ذات میں فخر نشہ بن کر اتر گیا۔

وہ اس نشے سے لبریز ہو کر اور بھی آزادی اور تفاخر سے زندگی گزار سکتی تھی۔ زندگی کو انجوائے کر سکتی تھی۔ ماں باپ کی ایک بات مان کر دس باتیں منوا سکتی تھی۔ وہ یونیورسٹی نہیں پھوڑے گی۔ اب وہ کھل کر جیے گی۔ وہ سب کچھ کرے گی جو اور لڑکیاں کرتی ہیں۔ دوستیاں نبھاتے ہوئے زندگی کے مزے لوٹتے ہوئے اب وہ ان لڑکیوں کے سامنے خود کو کمتر نہیں سمجھے گی جو بروقت اس سے مقابلے پر اتاری رہتی تھیں۔ اور جن کو مجلس کرنے کے لیے اس نے راحیل کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

کیا اسے راحیل سے ذرا بھی لگاؤ نہیں تھی۔۔۔ ”نہیں“ اس کے اندر سے پُر زور تردید آئی۔

اور نہ ہی راحیل کو اس سے محبت تھی۔ ”اگر اسے مجھ سے ذرا بھی محبت ہوتی تو وہ آج ایسی باتیں نہ کرتا۔“ راحیل کے رویے پہ وہ پھر سے اُبھنے لگی تھی۔

یونیورسٹی سے نکلتے ہوئے اس کی طبیعت تکتا رکھا ضرور ہوئی تھی۔ لیکن اب۔۔۔ وہ خود میں بہت خوش گوار سی تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔

وہ سوچتے ہوئے کمرے سے نکلی۔ لاؤنج میں دلشاد اکیلی بیٹھی تھیں۔ شاید کسی سے فون پہ بات کر رہی تھیں۔

”باجی کل دوبارہ آئیں گی۔ میں سوچ رہی ہوں۔ وہ اتنا اصرار کر رہی ہیں تو چھوٹی سی تقریب کر

دیتے ہیں۔ جس میں وہ دلنشین کو انگوٹھی پہنائیں گے۔ اس طرح منگنی کی رسم بھی ادا ہو جائے گی اور وہ لوگ بھی اپنے مہمانوں کو یہاں لا کر ہمارا تعارف کرا دیں گے۔“ دلنشین مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ اس مسکراہٹ کو صرف دل آویز نے دیکھا تھا اور عجیب سی چھن رگ رگ میں اتر گئی تھی۔



”دلنشین! آج تم یونیورسٹی نہیں گئیں؟“

”نہیں ماما! دل نہیں کر رہا تھا۔“ وہ جواب دیتے ہوئے اپنے لیے پراٹھے کا پیڑا بنانے لگی۔

”ابھی تم نے ناشتا نہیں کیا؟“ دلشاد فریج سے پانی نکالتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”ابھی تو سو کر اٹھی ہوں۔ آپ کہیں تو آپ کے لیے چائے بنا دوں؟“ دلشاد وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ

گئیں۔

”ہاں بنا دو۔۔۔ تمہارے بابا بھی پتا نہیں ناشتا کر کے گئے ہیں یا نہیں۔“ وہ سستی سے بولیں۔

”حورالعین ہی انہیں ناشتا دیتی تھی نا وہ باپ کے پاس جا کر کیوں بیٹھ گئی؟“

”کیوں آپ کو اس کی کمی محسوس ہو رہی ہے؟“ دلنشین کا انداز چبھتا ہوا تھا۔

دلشاد منجھل گئیں۔ ”کم از کم کام سنبھال لیتی تھی اور تو کچھ نہیں۔“

”ہمارے یہاں ملازموں کی کمی تو نہیں۔ خواجواہ بچن میں ڈیرے ڈالے رکھتی تھی۔“ دلنشین بیلن

سے پراٹھا گول کر رہی تھی۔ دلشاد نے کچھ نہیں کہا۔ خاموش ہو گئیں۔

دلنشین پھر کہنے لگی۔

”مجھے حورالعین سے اس وقت نفرت نہیں تھی۔ جس وقت آپ اسے اپنا نا نہیں چاہتی تھیں۔ مجھے

اس سے اب شدید نفرت ہے جبکہ مجھے لگتا ہے آپ اسے اپنا چکی ہیں۔“

دلشاد پسپائی سے مسکرائی تھیں۔

”میرے بس میں ہو تو اسے اب بھی گھر سے باہر نکال پھینکوں۔ جس جگہ کا تصور میں نے اپنی بھتیجی

کے لیے کیا تھا۔ وہاں اس کو دیکھنا بہت مشکل ہے۔ مگر میں اس بات کا رجا رجا بار بار کر کے ذلیل نہیں ہونا

چاہتی۔ میری خاموشی کو رضا مندی نہیں دیتی مفاہمت سمجھو۔“ اتنے میں دلنشین پراٹھا توڑے پہ ڈالنے لگی تو

دلشاد چونک گئیں اور یک دم کرسی سے کھڑی ہو گئیں۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو دلش؟“ وہ حیرانی سے اس کے قریب آگئی تھیں۔

”پراٹھا بنا رہی ہوں ماما!“ دلنشین استہزائیہ بولی۔

”بائیں ہاتھ سے۔۔۔“ دلشاد کو گہرا شک لگا تھا۔

”ہاں آں!“ دلنشین کھلکھلائی تھی۔

”مگر کیوں؟“ دلشاد جیسے چلا اٹھیں۔

”ماما! آپ بھی تو بائیں ہاتھ سے سارے کام کرتی ہیں“

دلنشین کو ماں کی حیرت عجیب لگ رہی تھی۔

دلشاد کے لب سل گئے۔

دلنشین اپنے کام میں پھر سے مگن ہو گئی۔

”پتا ہے کیا ماما! آپ کو بائیں ہاتھ سے کام کرتا دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ کب میں یہ عادت اپنائی چلی گئی۔ مجھے لیفٹ ہینڈ لوگ بہت اچیل کرتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے بہت سینکڑوں لوگ کہلاتے ہیں یہ غیر معمولی خوبیوں کے مالک۔ میرے اساتذہ شروع شروع میں مجھے کہا کرتے تھے لیفٹ ہینڈ ہونے کے باوجود میری لکھائی بہت عمدہ ہے۔

اور آپ کو بتاؤں۔ میری فرینڈز بھی میری اس خوبی پر مرتی ہیں۔ ویسے ماما! کتنا اچھا لگتا ہے جب ام لوگوں سے ذرا مختلف اور منفرد نظر آتے ہیں۔

اور ایک بات اور بتاؤں آپ کو، ایسے لوگوں کو کسی نہ کسی چیز میں شہرت ضرور ملتی ہے۔ اب آپ کو دیکھ لیں۔ بظاہر آپ سادہ سی خاتون ہیں۔ نہ ہی آپ کے پاس ایجوکیشن ہے اس کے باوجود جس این جی او میں آپ ورکنگ لیڈی ہیں وہاں نہ صرف آپ کو نمایاں اہمیت حاصل ہے بلکہ دوسری این جی او میں بھی آپ ٹھیک ٹھاک شہرت رکھتی ہیں۔“

وہ بڑے تقار سے ماں کی خوبیوں پر روشنی ڈال رہی تھی۔

مگر دلشاد کو یہ خوبیاں ان خامیوں کو چھپانے کے لیے اپنا ناپڑی تھیں، جن کی بدولت وہ بیماری اور تنہائی کا شکار ہو رہی تھیں اور اس میں سب سے زیادہ معاون ابراہیم کی دولت آئی تھی۔

دلشاد کا دل چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا۔ مگر اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے۔ دلشاد نے منافقت سے اس سچائی کا گلا اندر ہی اندر گھونٹ دیا اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولیں۔

”تمہاری باتیں ٹھیک ہیں دلشی! لیکن مجھے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ شادی کے بعد مجھے۔۔۔۔۔ اسی سے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“ دلشاد ہچکچاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ گویا وہ اب ماضی پہ بات تو کرنا اور کنارہ جو چننا بھی نہیں چاہتی ہوں۔

”میں جانتی ہوں ماما! آپ نے سسرال میں بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ ہماری داد و نہایت خطی اور لٹریچر و بیوروکریٹ تھیں۔ جنہوں نے آپ کی شخصیت کو بالکل ہی مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔“ دلنشین ناگواری سے کہہ رہی تھی۔

”اوروں کو ہو سکتا ہے دادو سے محبت ہو مگر مجھے تو بالکل بھی نہیں ہے۔ اور یہ نمونہ جو آپ اٹھا کر لائی ہیں یہ بھی دادو کی تصویر کا ایک رخ ہے۔ نہ جانے آپ کو اپنے ماضی سے کیسی محبت تھی کہ اسے حال میں پیوست کر لیا۔“

”تمام حالات تمہارے سامنے ہیں۔ اس کے باوجود تم۔۔۔ مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا رہی ہو؟“ انہوں نے بیٹی سے شکوہ کیا تھا۔

دلنشین بھڑک گئی۔ ”تو پھر کیوں ہے وہ یہاں۔ کیوں دفع نہیں کر دیتیں اسے؟“

”میرے اختیار میں ہوتا تو اسے گھر میں گھسنے ہی نہ دیتی۔۔۔ اور اب اسے نکالوں گی تو پورا بات کر کے۔“

دلشاد نے دل ہی دل میں اپنے ارادے کو دہرایا تھا۔
 ”وہ تمہارے لیے بالکل بھی اہم نہیں ہونی چاہیے۔ تمہیں یہ محسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں
 ہونی چاہیے کہ وہ یہاں ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ وہ ہم سب کے لیے بالکل غیر اہم ہے۔“
 انہوں نے مسکراتے ہوئے بیٹی کے گال کو تھپتھپایا تھا۔
 ”یہ آپ کہہ رہی ہیں لیکن وہ اپنا راستہ بنا رہی ہے۔“
 ”اُسے راستے بنانے دو۔۔۔ وہ کتنی ہی ہوشیار بننے کی کوشش کرے۔ مگر رہے گی تو پست گھرانے
 کی چھوٹی سوچ کی مالک۔ تم دیکھنا وہ ہمیں پیخ کرنے کے لیے اس باورچی خانے تک ہی محدود ہو کر رہ
 جائے گی۔“
 یہ کہہ کر دلشاد مکاری سے ہنسی تھیں۔ اور اس بار ان کی ہنسی اب دلنشین کی ہنسی بھی شامل ہو گئی
 تھی۔



”سچائی کتنی بھی تلخ ہو لیکن انسان اس سے نظریں نہیں چرا سکتا۔ مجھے دلنشین ابراہیم کو استعمال کرنا
 ہے اور اسی میں میرا مفاد پنہاں ہے۔ میں چاہوں بھی تو اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ میری نجات اسی
 میں ہے۔“
 راحیل نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی۔ ”مگر دلنشین یونیورسٹی نہیں آرہی۔ اگر اس نے مستقل نہ
 آنے کا فیصلہ کر لیا تو۔۔۔“ وہ یک دم بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔
 سوچ سوچ کر وہ بلکان ہو چکا تھا۔ لیکن اسے کوئی راہ بھائی نہ دے رہی تھی کہ شکیل باجوه سے کیسے
 جان چھڑائے۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ بجنے لگا۔ رات کے اس پہر کون ہو سکتا ہے۔ وہ حیران ہوا
 دروازہ پھر بجنے لگا۔ سناٹا اتار رہا تھا کہ ساعت پہ گراں گزر رہا تھا اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے
 ہی شکیل اور اس کے ساتھی کھڑے تھے۔

راحیل چونکا نہیں۔ چپ چاپ سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ لوگ اندر آ گئے۔
 ”لگتا ہے، تمہیں بھی نیند نہیں آرہی،“ شکیل نے بے تکلفی سے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے
 ہوئے کہا پھر جوتوں سمیت اس کے بستر پہ نیم دراز ہو گیا۔
 راحیل نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ پہلے ہی بہت الجھا ہوا تھا۔
 ”میں تم سے کہتا تھا کہ اسے میری طرف مائل کرنے کی کوشش کرو۔ لیکن تم نے کبھی بھی دھیان نہیں
 دیا۔“ پھر شکیل خود ہی قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔
 ”تمہیں بھی تو اپنے حلقہ احباب پہ رعب بنانا تھا۔ جب ہی تو اس سونے کی چڑیا کو ساتھ دبا۔
 پھرتے تھے۔“

”اگر وہ میری طرف مائل تھی تو اس میں میرا قصور کیا تھا۔“ راحیل کی آواز گھٹ رہی تھی۔
 ”اُسے اپنا لیتے تو سالوں میں نہیں دنوں میں ترقی کرتے۔“ شکیل نے گویا اس کا مذاق اڑایا تھا۔

اس نے دزدیدہ نگاہوں سے شکیل کی طرف دیکھا۔
 ”یہاں بے شمار لڑکوں کی لڑکیوں سے دوستیاں ہیں۔ کیا سب یہی سوچ رکھتے ہیں؟“
 شکیل اس کی طرف دیکھ کر ہنسا اور طنزیہ لہجے میں پوچھنے لگا۔ ”تو کیا تم نے اسے اپنی بہن بنا رکھا تھا؟“ راجیل کو ضبط کرنا پڑا۔

”اگر ایسا ہی ارادہ تھا تو تم نے میری پیش کش کو نظر انداز کیوں کیا؟“
 راجیل کی برداشت جواب دے گئی۔ ”وہ میری پراپرٹی نہیں تھی۔ جسے میں جب چاہے کسی کے والے کر دیتا۔ وہ بہت ہوشیار اور سمجھ دار لڑکی ہے۔“ اس نے گویا قصہ ہی تمام کر دیا تھا۔
 ”لڑکیاں کتنی بھی ہوشیار ہوں جسے دل دے دیتی ہیں اسے اپنی عقل بھی سوہنے دیتی ہیں۔“
 ”میں نے کہا نا اس کا اور میرا اب کوئی تعلق نہیں ہے۔“ راجیل زچ ہو چکا تھا۔ شکیل ہنس پڑا۔
 ”ٹھیک ہے پھر یہ سال تمہارا ضائع ہی سمجھو۔“ اس نے جیب میں سے چند کاغذ نکالے اور ان کے سامنے لائٹر جلا یا۔ راجیل بڑپ کر اس کی طرف بڑھا۔

”خدا کے واسطے شکیل! ایسا نہ کرو۔ یہ میری عمر بھر کی محنت کا سوال ہے۔“ شکیل نے لائٹر آف کر دیا۔
 ”خدا کے واسطے میرے کسی ڈاکو منٹس کو کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ میں اس سال اگر امتحان نہ دے سکاتا تو جی بھی کسی امتحان میں کامیاب نہ ہو پاؤں گا۔“ وہ رو دیا تھا۔ شکیل اور اس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ راجیل زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ شکیل کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا رو رہا تھا۔
 ”میں سچ کہتا ہوں۔ میں یہاں صرف اعلا تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔ وہ میرے خود بخود قریب آئی تھی۔“

”میں یہ راز کہانی سننے نہیں آیا۔“ شکیل بھڑک گیا پھر اپنے گال پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔
 ”مجھے اس بھڑکاؤ کا الزام چاہیے۔“ شکیل کی آنکھوں میں وحشت تھی۔
 ”مگر وہ معافی نہیں مانگے گی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ پرنسپل کے پاس نہیں جائے گی۔“
 ”کیوں نہیں جائے گی وہ پرنسپل کے پاس؟“

شکیل بھڑک کر سیدھا ہو گیا۔ ”اسے پرنسپل کے پاس ضرور جانا چاہیے۔“ شکیل کے چہرے پر مردہ مسکراہٹ تھی۔ راجیل کا رنگ اڑ گیا۔
 ”دیکھو شکیل! تم میرے محسن ہو۔ مگر اس احسان کو اتارنے کے لیے مجھے کسی غلط کام پہ نہ اکساؤ۔“
 ابھی راجیل بات ہی کر رہا تھا کہ شکیل نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال لیا۔ یہ وہی موبائل فون تھا جو چند دن قبل راجیل کے پاس ہوا کرتا تھا اور یہ اسے باجوہ ہی نے دیا تھا۔ یہ اسے باجوہ نے کیوں دیا تھا۔ یہ ایک الگ کہانی تھی۔

فی الحال شکیل اسے فون میں ریکارڈڈ لٹین اور راجیل کی گفتگو سن رہا تھا۔
 ”یہ براؤن کھڑے بہت جچتا ہے۔ لیکن تم اکثر وہائٹ یا آسمانی شرٹس ہی پہنتے ہو۔“ یہ لٹین کی آواز تھی۔ راجیل کھلکھلا کر ہنسا۔
 ”تمہیں براؤن کھراچھا لگتا ہے۔ میں اب ہر شرٹ اسی کھرکی لے لیا کروں گا۔“

”میں نے اب ایسا بھی نہیں کہا۔ مجھے تو رنگ سارے ہی اچھے لگتے ہیں۔“
 ”لیکن براؤن کلر میرا تو پسندیدہ ہے۔“ راحیل کی آواز میں شوخی تھی۔

”آں، ہاں کیا کر رہے ہو۔ میری چوڑی ٹوٹ گئی۔“ دلشین کی ہنسی میں اعتراض کے ساتھ محبت

کی آمیزش تھی۔

”تمہیں پتا ہے دلش تمہاری آنکھوں کا رنگ بھی براؤن ہے اور یہ تمہارے چہرے پہ بہت چمکا
 ہے۔“ راحیل کی آواز مدہم ہو رہی تھی۔

”آج کا فنکشن بہت زبردست تھا۔“ دلشین کہہ رہی تھی۔

”میں فنکشن کی نہیں، تمہاری تعریف کر رہا ہوں۔“

شکیل نے اسپیکر آف کر دیا۔ راحیل کو اچھی طرح یاد آ گیا کہ یہ کس دن کا واقعہ تھا۔ راحیل دل ہی
 دل میں تملدارہا تھا اسے اپنی بے بسی اور مجبور یوں پہ رونا آرہا تھا۔

”تمہیں یاد ہے جب ہم آڈیٹوریم سے نکلے تھے تو میں نے تمہیں یہ موبائل فون دیا تھا، تم اسے
 لیتے ہوئے ہچکچائے تھے۔“

”ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے اور تب تم نے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا یہ میں تمہیں اس
 لیے دے رہا ہوں تاکہ تم سے رابطے میں رہ سکوں۔“ اس کی سنجیدگی پہ شکیل ہنس پڑا۔

”اور تم اس روز اتنے خوش اور مگن تھے۔ تمہیں پتا ہی نہیں تھا کہ اس کا ریکارڈنگ اسپیکر آن ہے۔“
 شکیل نے یہ کہہ کر موبائل کو چوما اور اسے اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ جب وہ پرنسپل کے پاس

میری شکایت لے کر جائے گی، تب میں انہیں یہ ڈائلاگز سنواؤں گا۔“
 ”کتنی پرانی دشمنی ہے تمہاری؟“

”دشمنی اس نے بنائی ہے، ہم تو دوستی کرنا چاہتے تھے مگر اس نے ہمیں یعنی شکیل باجوه کو نظر انداز کر
 کے تمہارے جیسے چمچر سے راہ ورسم بڑھائی۔ یہ شکیل باجوه کی کھلم کھلا انسٹل تھی۔ وہ اگر امیر زادی ہے تو
 شکیل باجوه بھی کسی سے کم نہیں۔ بس اسی وجہ سے تمہارے قریب آنا پڑا۔“ راحیل اس کی سفاکی پہ حیران
 تھا۔

”تم نے تو شاید یہ سوچا بھی نہ ہو کہ سب کچھ ہوتے ہوئے شکیل باجوه نے جب تمہیں تمہاری مار
 کے لیے رقم دی تو تمہارے ڈائمنٹس بطور گارنٹی اپنے پاس کیوں رکھے اور اب وہ وقت آ گیا ہے اس
 قرض کو میں سود سمیت واپس لینا چاہتا ہوں۔“ راحیل کے چہرے کا رنگ سفید پڑ رہا تھا۔

”گھبراؤ نہیں، تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے زیادہ ہی فائدہ ہو جائے۔“
 کہہ کر شکیل اور اس کے ساتھی کمرے سے نکل گئے جبکہ راحیل اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا وہ اس وقت کو کوس رہا تو
 جب اس نے شکیل سے مدد مانگی تھی۔



رات کو وہ لوگ دیر تک جاگتے رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ اتنے دن بعد تو اپنے بہن بھائیوں سے مل

تھی۔ وہ یہاں آئی تھی ان سب کے لیے یہ خوشی بھی بہت بڑی تھی۔ رات کے پچھلے پہر ان سب کی آنکھ لٹی تھی وہ صبح بہت دیر تک سونا چاہتی تھی۔ بے فکری اور چین کی نیند کتنے دن کے بعد نصیب ہوئی تھی۔

ایان صبح ہی صبح اس کا موبائل بجنے لگا۔ پہلا خیال یہ آیا شاید طارق کا فون ہو۔ الٹی خیر۔

”بھابھی! میں ولید بول رہا ہوں۔ بہت دیر سے ٹرائی کر رہا تھا۔“

”ہاں مگر خیریت تو ہے؟“ اس کے دل میں ہنچل سی ہوئے گی۔ دھیان طارق کی طرف ہی گیا۔

”ہاں بس خیریت ہی سمجھیں۔ میں آپ کو لینے آ رہا ہوں۔ بس پانچ منٹ میں آپ تیار رہیے گا۔“

اید نے اتنا کہا اور فون بند کر دیا۔ حور کی نیند تو کیا حواس بھی گم ہو گئے۔

وہ تیزی سے بستر سے نکلی اور واش روم میں چلی گئی۔

”نہ جانے کیا بات ہے جو ولید یوں اچانک صبح لینے آ رہا ہے۔“

ماموں، ممانی، دل آویز، لٹشین، طارق، کہیں طارق کو تو کچھ نہیں ہو گیا۔ ”منہ دھوتے ہوئے اس کے آنسو پانی میں مل رہے تھے۔ طارق کا خیال آتے ہی جان پتے کی طرح کاپٹنے لگی۔ عجیب عجیب اہے اور وسوسے آ رہے تھے۔ کم از کم ولید بتاؤ دیتا کہ معاملہ کیا ہے۔ اسے خود پر جھنجھلاہٹ اور ولید پہ نمسہ آ رہا تھا۔

جلدی جلدی بال برش کیے۔ اتنے میں اس کا فون پھر بجنے لگا۔

فون کی آواز سن کر اسماء اپنے کمرے سے نکل آئیں۔

”بس میں آ رہی ہوں۔“ وہ چپقلیں پہن کر چادر اوڑھنے لگی تھی۔ فون آف کر کے پرس میں ڈالا۔

اسماء اس کا اترا ہوا چہرہ اور ہیکل آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

”کیا بات ہے حور! اتنی صبح صبح کہاں جا رہی ہو؟“

وہ انہیں کساتی۔ اسے تو خود نہیں پتا تھا۔

”پتا نہیں، گھر سے فون آیا تھا۔ ولید لینے آ رہا ہے۔“ وہ جلدی میں تھی آگے بڑھ گئی۔

”حور کو۔۔۔ یونہی چلی جاؤ گی۔“ اسماء تیزی سے پکڑ میں گئیں اور ایک گلاس دودھ لے آئیں۔

”یہ لیو۔“ حور جرابی سے اپنی ماں کا منہ دیکھنے لگی۔

”کوئی زیادہ پریشانی کی بات ہے تو تمہارے ابو کو اٹھاؤں؟“

”نہیں، نہیں۔ ابو کو مت جگائے گا۔ پہلے ہی ان کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ اور اس کا میرا بالکل دل

نہیں کر رہا۔“

اس نے دودھ کے گلاس کو بڑی کوفت سے دیکھا پھر معذرت خواہانہ انداز میں سوتیلی ماں کی طرف

ایکھا۔ جس نے بالکل برا نہیں مانا تھا۔ تب ہی ڈور بیل بجنے لگی۔ اسماء اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک

آئیں۔

”حور! جاتے ہی فون کرنا۔“ انہوں نے اسے گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر کہا تو حور کے قدم رک گئے۔

اس نے مڑ کر اسماء کی طرف دیکھا۔ جن کے چہرے اور آنکھوں میں حور کے لیے تفکر تھا۔ اس نے اثبات

نہیں کر دیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سگی نہ سہی سوتیلی ماں تو تھی اور ماں کی دعا بھی رانگاں نہیں جاتی۔

اس کے دل کے دوسوے کم ہونے لگے۔
 ”خیریت تو ہے ولید! کچھ بتاؤ گے بھی۔ گھر میں سب ٹھیک تو ہے نا؟“ اس کی بے چینی فطری تھی۔
 ”بالکل شانت ہو جائیں، سب خیریت ہے۔“ اس نے ولید کی طرف دیکھا۔ ملگجاسرپا، اور اس کے وجود سے اٹھتی اسپرٹ کی سی بدبو۔۔۔ وہ بالکل مطمئن انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔
 ”کیا مطلب۔۔۔؟“ وہ مزید الجھ گئی۔
 ”میں نے کہا نا۔ فکر نہ کریں گھر میں گھر والے سب خیریت سے ہیں۔ کوئی خاص پریشانی نہیں۔
 بس ایک معمولی سا مسئلہ ہے۔“

ولید نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کا سیل گانا سنانے لگا۔
 ولید نے فون کان سے لگا لیا۔

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ پھر۔۔۔ چلو کوئی مسئلہ نہیں۔ اسے بعد میں دیکھ لیں گے۔ ہاں۔ تم پریشان مت ہو۔ یہ میرا دوسرا ہے۔ اوکے بائے۔“ فون بند ہو گیا۔
 ”بات یہ ہے۔“ ولید نے تیزی سے گاڑی موڑی۔ حور نے حیرانی سے دیکھا وہ راستہ گھر کی طرف نہیں جاتا تھا۔ اتنے میں ولید کا سیل پھر بجنے لگا۔
 ”اویار، تم سے کہا تو ہے۔ یہ میرا دوسرا ہے۔“

”او۔۔۔ السلام علیکم، انٹینی۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ نیل ہمارے ساتھ ہی تھا۔ بس معمولی سا ایکسیڈنٹ تھا۔ بس نیل کو زیادہ خراشیں آئیں ورنہ ہم سب توجہ گئے۔“
 یہ کہہ کر وہ ہلکا پھلکا سا سسکرا دیا تھا۔ پھر آنٹی کی مزاج پر سی کرنے لگا۔
 حور حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ پوچھتی تو تب ناجب اسے فون سے فرصت ہوتی۔ ایک کال بند ہوتی دوسرا نمبر بجنے لگتا۔ بالآخر وہ اپنی منزل پہنچ گئے۔
 ”یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔۔۔؟“ حور نے گاڑی سے اتر کر اس گھر کو دیکھا جہاں اس کا بچپن گزارا تھا۔

”اس گھر کو نہیں پہچانتیں آپ؟“ یہ کہہ کر ولید آگے بڑھ گیا۔
 ”پہچانتی ہوں مگر تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“ حور نے بے زاری سے پوچھا۔
 ”اطمینان سے اندر آ جائیں پھر بتا دیتا ہوں۔“
 وہ مین گیٹ کھول کر اندر بڑھتا چلا گیا۔ ظاہر ہے اسے بھی پیروی کرنا پڑی۔
 ”رانی اورانی۔۔۔!“ ولید نے آوازیں لگائیں۔ ملازمہ دوڑ کر آ گئی۔
 ”شیر خان کہاں ہے؟“
 ”صاحب وہ باہر گیا ہے۔“

”اچھا تم ایسا کرو جلدی سے کمرے کا حلیہ درست کرو اور سب سے پہلے یہ گلاس وغیرہ یہاں۔
 دفعان کرو اور جگ میں صاف تھراپانی اور دو گلاس لے آؤ۔“
 حور ڈرائنگ روم کے وسط میں خش و بیخ میں مبتلا کھڑی تھی۔ ملازمہ جا چکی تھی۔

”آپ اطمینان سے بیٹھ جائیں۔“ یہ کہہ کر وہ فون ملانے لگا تھا۔
لگتا تھا کائنات بیکت نہیں ہو رہا، تب ہی وہ جھنجلا گیا۔
”نہ جانے لوگ فون رکھتے ہی کیوں ہیں؟“

”میں پوچھ سکتی ہوں تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“ حور کو غصہ آ گیا۔
کمرے کا حلیہ بتا رہا تھا کہ یہاں رات بھر ت جگا رہا ہے۔ ٹی وی، ڈیک سے لے کر کارپٹ اور
اس پر پڑے جا بجا گلاس اور بجھے ہوئے سگریٹ اور کھانے کے خالی برتن کشن و تکیے۔ ٹھیک ٹھاک لوگوں
کی گید رنگ کا پتہ دے رہے تھے۔
اتنے میں رانی پانی لے کر آئی اور کمرے کو سیننے لگی۔

جہاں تک اسے یاد تھا۔ نانو کے بعد یہ گھر ماموں نے لے لیا تھا اور اسے کرائے پر دے دیا تھا۔
تاحال یہ کس کی دسترس میں تھا۔ رہائش نہ ہونے کے باوجود ملازمین یہاں کیا کر رہے تھے۔ حور کو کئی
سوالات نے یک دم پریشان کر دیا تھا۔
”ہم لوگ۔۔۔ یعنی یار دوست وغیرہ یہاں مل بیٹھتے ہیں۔ بس ہلا گلا موج مستی سب ہی کچھ
کرتے ہیں۔“

رات کچھ زیادہ کاموڈ ہو گیا تو گز بڑ ہو گئی۔
وہ شرمندہ تو ہرگز نہیں تھا۔

”دیے تو پہلے بھی ایسے پروگرامز ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن آس پڑوس کے لوگوں کو بھنگ نہیں
پڑتی۔ نہ جانے رات کسے نیمر ز کو پتا چل گیا یہاں پر فریب ہی صدیقی صاحب ہیں بابا کے بہت قریبی
دوست، وہ سارے محلے کو اکٹھا کر کے دروازے پر آگئے۔ اگر بابا کے جاننے والے نہ ہوتے ناتو ایسا
سبق سکھاتا کہ عقل ٹھکانے آ جاتی۔ لڑکی کو تو پچھلے دروازے سے نکال دیا۔ مگر سارا محلہ ایک ہی بات کہہ
رہا ہے کہ یہاں غیر اخلاقی دھندا ہو رہا ہے اور لڑکی ابھی بھی موجود ہے۔“

شیر خان نے بتایا کہ وہ لوگ پولیس کو بلائے کی دھمکیاں دے رہے ہیں لیکن میرا نہیں خیال کہ وہ
لوگ پولیس کو بلائیں گے۔ البتہ ماما بابا سے شکایت ضرور کر دیں گے۔ ماما، بابا نے زیادہ سے زیادہ برا بھلا
کہنا تھا اور بس۔۔۔ لیکن ان ہمسایوں کی تسلی کے لیے فوری طور پر میرا دھیان یہی آیا کہ آپ اپنے
پیرنٹس کے یہاں ہیں آپ کو اور طارق کو بلا لیتے ہیں۔ اول تو یہاں کوئی آئے گا نہیں اور آ بھی گیا تو
معتول جواز ہوگا آپ اور طارق اپنے پرانے آبائی گھر میں دو چار روز گزارنے کے لیے آئے تھے۔ اور
ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ مگر اس طارق پہ مجھے سخت غصہ آ رہا ہے۔ پچھلے دو گھنٹے سے فون ملا رہا ہوں اور
فون آف ہے۔ نہ جانے بھنگ پی کر سو رہا ہے۔“

ولید کی خود غرضی، بے وقوفی اور جلد بازی پر حور کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
”پہمیں پتا ہے ولید۔۔۔ طارق دو روز سے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔“ حور کی آواز خوف سے
پھٹ رہی تھی۔ حور کا اتنا کہنا تھا کہ ولید کا رنگ اڑ گیا۔
”کیا۔۔۔؟ مگر مجھے تو نہیں پتا تھا۔“

”کم از کم تم مجھے اپنے پلان سے تو آگاہ کر سکتے تھے۔“
 حور نے ناگواری سے کہا اور جانے کے لیے اٹھ گئی۔ اس کا یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔
 ”آئی ایم سوری بھابھی۔ مجھے بالکل نہیں پتا تھا کہ طارق شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔“
 ”تمہیں کسی کے بارے میں پتا رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ میرے بارے میں کیسے علم ہو گیا تھا
 تمہیں کہ میں اپنے میکے میں ہوں۔“ حور کا لہجہ ناگواری نہیں نفرت آمیز بھی تھا۔
 ”شاید میں نے پرسوں رات دلنشین وغیرہ سے سنا تھا کہ آپ اپنے گھر گئی ہوئی ہیں۔ چلیے میں
 چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے اس احسان کی۔ میں خود چلی جاؤں گی۔“ وہ غصے میں آگے بڑھی۔
 اسی وقت شیر خان کمرے میں داخل ہوا۔

”صاحب۔۔۔ وہ بڑے صاحب اور بڑی نیگم صاحبہ آئے ہیں۔“
 ”کیا۔۔۔؟“ ولید کو یقین ہی نہ آیا۔ پھر وہ یک دم جیسے ہوش میں آ گیا۔
 ”مائی گاڈ۔۔۔ ماما نے آپ کو یہاں دیکھ لیا تو قیامت ہی آجائے گی۔“
 ”آپ ایسا کریں۔ یہاں پچھلے دروازے سے باہر چلی جائیں۔ وہ لوگ اندر آ جائیں گے تو شیر
 خان آپ کو۔۔۔۔۔“

ولید کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ دلشاد نیگم دروازے میں لال بھبھو کا چہرہ لیے کھڑی تھیں۔ ان
 کے چہرے پہ حقارت، غصہ، نفرت کیا کچھ نہیں تھا۔
 حور کو ولید کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا تھا۔ وہ صاف صاف بتا دینا چاہتی تھی کہ معاملہ کیا تھا لیکن
 اس کے سر پر تو گویا آسمان آگرا۔ جب دلشاد نیگم تنہائی ہوئی آگے بڑھیں اور پے در پے ولید کا چہرہ،
 طمانچوں سے لال کر دیا۔

”ساری رات گزارنے کے بعد اب اسے پچھلے دروازے سے بھگار رہے ہو۔“
 حور شرم کے مارے گویا زمین میں گڑ گئی۔

”فارگا ڈسک ماما! کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“ وہ غصے میں جھنجھلایا تھا۔
 ”تم اب بھی مجھے جھٹلاؤ گے۔۔۔ اب بھی۔۔۔ اتنی بڑی حقیقت کو کیسے جھٹلاؤ گے۔ رات کو
 سارے محلے نے اسے تمہارے ساتھ آتے دیکھا اور اب تم اسے پچھلے دروازے سے نکال رہے تھے۔
 اس بے غیرت کو۔“ دلشاد نیگم کا اشتعال آسمان کو چھو رہا تھا۔
 ”آپ جو کچھ سمجھ رہی ہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔“ غم و غصے سے حور کی آواز پھٹ رہی تھی۔ وہ پوری
 قوت سے چلائی تھی۔

”آواز کو نیچے ہی رکھو تو بہتر ہوگا۔ اپنے باپ کے ہاں گئی تھیں تم یا یہاں راتیں گزارنے کے لیے
 آئی تھیں۔“

”میں کہتی ہوں ایک لفظ بھی آگے بولا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔“
 غم و اشتعال سے اس کا چہرہ اور آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ حور پوری قوت سے چلائی تھی۔

”ہاں۔ بے شرمی کا واحد حل بھی یہی ہے کہ تم کہیں ڈوب مرو۔“
اس الزام پہ حور کے آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لے رہے تھے اور ساری جان پتے کی طرح علیحدہ
کانپ رہی تھی۔

”تمہارا باپ ساتھ آیا ہے میرے۔۔۔ مارے شرم کے وہ میرے ساتھ یہاں تک نہیں آئے۔ مگر
اب۔۔۔ جب انہیں علم ہوگا کہ یہاں کوئی غیر بازاری عورت نہیں ان کی سگی بھانجی موجود ہے تو تب وہ
یہاں ضرور آئیں گے اور انہیں یہ حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھنی بھی ضرور چاہیے۔“ دلشاد بیگم نے چھپتی
نگاہوں سے حور کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ ابراہیم صاحب کو آوازیں دے رہی
تھیں۔

حور کے سر پر تو گویا قیامت ٹوٹی تھی۔ وہ اپنی صفائی دینے کو لرزتی کانپتی ٹانگوں کے ہمراہ باہر نکلی
تھی لیکن سامنے سے آتے ابراہیم کو دیکھ کر اس کا سارا خون خچڑ کر چہرے پہ آگیا۔ ابراہیم صاحب کے
چہرے پر رنج و ملال اور آنکھوں میں اس کے لیے تحقیر تھی۔
حور کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اپنی صفائی میں اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ ابراہیم صاحب چپ
چاپ بنا کچھ کہے سنے واپس پلٹ گئے۔

شدت غم سے حور کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔
بہ وقت تمام اس نے دیوار کا سہارا لیا تھا۔ درود یوار اس کے سر پر آ رہے تھے۔ ولید باپ کے پیچھے
پیچھے نکل گیا تھا۔
”شیر خان!“ دلشاد نے ملازم کو پکارا۔ پھر ملازم کے پیروں میں گاڑی کی چابیاں پھینکتے ہوئے
بولیں۔

”یہ جہاں جانا چاہتی ہے اسے چھوڑ آؤ۔ اس سے قبل یہاں آس بڑوس کے لوگ اکٹھے ہوں اور
ہماری عزت کا جنازہ نکلے۔ اسے یہاں سے دفعان کر دو۔ مجھے تو ابراہیم کی فکر ہو رہی ہے۔ کہیں وہ یہ
صدمہ دل پر ہی نہ لے لیں۔“

وہ تحقیر بھری نگاہوں سے حور کو دیکھتے ہوئے بہ عجلت باہر نکل گئیں۔ حور دیوار سے سرخٹخ ٹخ کر
رنے لگی۔ روتے روتے وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔
شیر خان اس کے انتظار میں گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔

بہت دیر تک وہ زمین پر ایسے ہی بیٹھی روتی رہی تھی۔ پھر اس کی نگاہ ملازمہ رانی پر پڑی۔ تو اس کی
جان میں جان آئی۔ اس نے ہٹیلی سے آنسو صاف کیے اور دوڑ کر رانی کے پاس گئی اور کہنے لگی۔
”تمہیں تو پتا ہے نارانی! کہ میں یہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آئی تھی۔ تمہیں پتا ہے نا؟“ وہ بے
تابی سے رانی سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں جی۔ آپ تو ابھی آئی تھیں۔ وہ عورت جو رات سے یہاں تھی۔ وہ تو کوئی اور عورت تھی۔
آپ تو شریف گھر کی معلوم ہوتی ہیں۔“
”میں، میں اس گھر کی بہو ہوں۔ ان کے بڑے بیٹے کی بیوی ہوں جو مجھ پر الزام لگا کر گئی ہیں۔“

غم سے نڈھال وہ رانی کو اپنی پیتا سنار ہی تھی۔ رانی حیرانی سے حور کی جانب دیکھنے لگی۔
 ”گلتا ہے، تم لوگوں نے شادی میں شرکت نہیں کی۔ تب ہی تم مجھے نہیں جانتیں۔ مگر میں بتاؤں
 تمہیں، میں ولید کے بڑے بھائی کی بیوی ہوں۔“ حور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
 ”انہوں نے غلط فہمی اور بدگمانی کی بنیاد پر مجھ پر اتنا بڑا الزام لگایا ہے۔ طارق میرے شوہر شہر سے
 باہر ہیں۔ انہیں یہ سب بتایا جائے گا تو میرا گھر اجڑ جائے گا۔“
 یہ کہہ کر حور نے رانی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔
 ”تم تو سچائی سے واقف ہو۔ ان لوگوں کو بتاؤ گی تاکہ سچ کیا ہے۔ تم میرا ساتھ دو گی نارانی؟“ حور
 رو رہی تھی۔

رانی کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے اور اس نے حور کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔
 ”آپ فکر نہ کریں بیگم صاحبہ! میں اور شیر خان آپ کا گھر اجڑنے نہیں دیں گے۔ ہم سچائی بتا دیں
 گے۔ مگر۔۔۔۔۔۔“
 ”ماں بولو۔“

”بیگم صاحبہ!“ جب آپ کو پتا تھا کہ آپ کا دیورا اچھے کردار کا نہیں ہے تو آپ اس کے ساتھ کیوں
 یہاں آئیں۔ یہاں تو آئے دن ایسی ہی عیاشیاں ہوتی ہیں۔ ہم توجی کی کمین ملازم لوگ ہیں۔ اسی تابع
 داری سے پیسے ملتے ہیں ہمیں۔ لیکن آپ تو کچھ سوچیں، آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“
 حور نے آنسو صاف کر لیے۔ اس کے دل میں ولید کے لیے زہر اور آنکھوں سے نفرت ابل رہی
 تھی۔

”ولید نے جان بوجھ کر میرے ساتھ ایسا کیا ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اپنے
 عیسوں کی پردہ پوشی کرنے کے لیے اس نے مجھے نشانہ بنایا ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑ دوں گی۔ ابھی معاف
 نہیں کروں گی۔“
 وہ غصہ اور حقارت سے بولی تھی۔



”بے غیرتی کی انتہا اس وقت ہو جاتی ہے جب انسان اپنے کیے پر مطمئن ہو، اسے کوئی شرمندگی
 نہ ہو، یہ بے غیرتی کا چلتا پھرتا شاہکار ہے۔“

دشاد نے اسے اوپر کمرے میں جاتا دیکھ کر دونوں بیٹیوں سے استہزاء کیا کہتا تو حور کے قدم میڑھیوں
 پہ جم گئے۔ وہ گویا پتھر کی طرح ساکت ہو گئی تھی۔

”طارق کو فون کر دیا ہے میں نے، شام کی فلائٹ سے وہ واپس آ رہا ہے۔ جو کچھ یہاں سے لے
 جانا چاہتی ہو، سامان باندھ لیتا۔ غیرت مند مرد بد صورت عورت کے ساتھ تو گزارہ کر لیتا ہے۔ لیکن
 بد کردار عورت کے ساتھ ایک بل بھی نہیں رہ سکتا۔“

حور لڑکھرائی تھی۔ گرل نہ تھا سستی تو منہ کے بل نیچے آتی۔

”میرا طارق غیرت مند ہے۔ میں نے ولید کو بھی گھر سے نکال دیا ہے میں نہیں چاہتی۔ تمہاری وجہ سے بھائی پھائی کا خون کرے۔ اب اس میں ولید کا بھی کیا قصور۔ نہ جانے تم نے رنگ رلیاں اس کے ساتھ منائی تھیں یا اس کے دوستوں کے ساتھ۔“

”دشاد بیگم! خدا کے واسطے خاموش ہو جائیں۔ میرے دماغ کی نیس پھٹ جائیں گی۔“ ابراہیم کی رنج میں ڈوبی دل گیر آواز ابھری تو دشاد کے لب سل گئے۔ وہ گھبرا کر شوہر کی طرف دوڑیں۔

”آپ کیوں بستر سے اٹھ کر آ گئے۔ پہلے ہی آپ کی ہارٹ بیٹس اس قدر تیز ہے۔ ٹیلیٹ کے بعد کچھ دیر آرام تو کر لیتے۔ کچھ ہو جائے گا آپ کو تو کیا کریں گے ہم۔“ دشاد نے مصنوعی آنسو نکالے تو ابراہیم نے ملال و تاسف سے بیوی کی طرف دیکھا۔ اور دل گرفتہ لہجے میں بولے۔

”کچھ ہونے کو اب بھی باقی ہے؟“

دشاد چپک کر بولیں۔ ”آپ اپنے دل پر نہ لیں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔“ دشاد کی کیٹلی نگاہیں سیڑھیوں پہ تھیں

”خدا کے واسطے دشاد بیگم! جو کچھ ہو چکا ہے وہ کم تکلیف دہ نہیں۔ آپ بار بار ہمارے زخموں پہ نمک پاشی کیوں کر رہی ہیں، اس گھر کی عزت کیوں برباد کر رہی ہیں آپ۔ یہاں ملازم بھی ہیں، وہ کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں۔ آخر کو وہ بیٹا تو ہمارا ہی تھا۔“

”اب جانے دیں اس بات کو۔“ دشاد نے گویا ٹالا تھا۔

”کیوں جانے دوں کیسے جانے دوں؟“ وہ بھڑک گئے۔ ”کیا آپ اسے جرم سے بری لڈمہ کر دیں گی؟“

دشاد بیگم کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے نرمی سے ابراہیم کا بازو پکڑا اور انہیں اندر کمرے میں لے گئیں۔

”میں جانتی ہوں۔ آپ سارا الزام اپنے بیٹے کو ہی دیں گے۔ ٹھیک ہے ہمارا ہی بیٹا گندہ تھا۔ گندہ ہے۔ میں پوچھتی ہوں۔ آپ کی بھانجی تو سستی ساوتری تھی۔ وہ کیا لینے پچنی تھی وہاں۔ پندرہ سال سے تو میری بیٹیاں وہاں نہیں کہیں۔ صرف اس لیے کہ اس بے غیرت نے عیاشی کا ڈھ بنا رکھا ہے اسے۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتی ہوں، ولید میں ہٹ دھرمی اور ڈھنائی اتنی ہے کہ آپ نے اس گھر کو تالے لگوا دیے تو اس نے تالے توڑ ڈالے۔ ملازمین کے ساتھ بدسلوکی کی۔ محلے والوں کو ہتایا کتنا کتا تھا میں نے آپ سے، اس گھر کو ہی بیچ دیں۔ محلے والے بھی ہمارے اوپر لعنت ہی بھیجتے ہوں گے۔ لیکن آپ کو تو جیسے اماں جی کی یادوں سے جڑا رہنا تھا۔ اس گھر کو ملکیت میں ہی، کتنا تھا۔ کیسا چاند چڑھایا ہے آپ کی بھانجی نے۔ چلو اماں جی کی روح کو بھی سکون آ گیا ہو گا۔“

دشاد کا کٹھنلا انداز ابراہیم کی روح کو گھائل کر گیا تھا وہ سر ہٹا کر بے بسی سے بیٹھ گئے۔

”اس گھر سے اس کا بچپن وابستہ تھا۔ اماں جی کی یادیں اور بھی بہت کچھ۔ ہو سکتا ہے، وہ اسی لیے لگی ہو۔ لیکن اس نے اکیلے وہاں رات کیوں گزاری۔ مجھے زندہ مار ڈالا ہے حور! تم نے نہیں چاہیں

چھوڑا۔ مجھے تمہاری یہ حرکت بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ تم اتنی نادان اور بھولی تو نہیں تھیں۔“
ابراہیم رو رہے تھے۔ دلشاد کو ابراہیم کی باتوں سے تقویت مل رہی تھی۔ وہ قریب بیٹھ گئیں اور ان کی دل جوئی کرتے ہوئے بولیں۔

”آپ نہیں سمجھ سکتے۔۔۔ جو بچے بنا والدین کے تربیت پاتے ہیں اور خاص طور پر ماں کی تربیت سے محروم لڑکیاں۔ وہ خود کو نقصان پہنچاتی ہی ہیں۔ اپنے خاندانوں کا بھی اچھا برا نہیں سوچیں۔ یہ لڑکی شروع سے ہی خود سر تھی۔ مجھے تو لگتا ہے اس نے طارق کو نچا دکھانے کے لیے ایسا دانستہ کیا ہے۔“
”طارق کو نچا دکھانے کے لیے؟“ ابراہیم نے حیرانی سے بیوی کی طرف دیکھا۔

”ہاں کیونکہ میں محسوس کرتی تھی۔ طارق نے اسے اس کی اوقات پہ رکھا ہوا ہے۔ بارہا مجھے ایسا لگتا تھا کہ ان کے مابین تعلق خوش گوار نہیں ہے۔ شادی والی رات تو ساری رات طارق نے باہر لان میں گزاری تھی۔“

ابراہیم کو یہ انکشافات سن کر حیرانی ہو رہی تھی۔ پھر بھی دلشاد کا رویہ ایسا تھا جو بیٹے کے ساتھ۔
”میں ماں ہوں ابراہیم! اپنی اولاد سے غافل نہیں رہ سکتی۔ طارق میرا بیٹا ہے۔ وہ ایک نظر پاتی پختہ سوچ رکھتا ہے۔ ایسی اوٹ پٹانگ لڑکیاں تو ہزار مل سکتی تھیں اسے۔ مگر آپ نے خیر۔ چھوڑیں اس بحث کو، بہر حال یہ لڑکی اگر ایسا سوچتی ہے تو گھر بسانے کے نہیں گھر اجاڑنے کے حربے ہیں۔ ہمیں کیا، خود ہی نقصان اٹھانے کی۔“

ابراہیم کو دلشاد کی باتوں سے سازش کی بو آ رہی تھی۔ مگر انہوں نے کسی بات کی تردید نہیں کی۔ چپ چاپ وہ سنتے رہے۔ پھر طویل خاموشی کے بعد بولے۔

”اب مزید وقت نہیں ہے۔ ولید کا گھر بس جانا چاہیے۔ یہ ہماری ہی غفلت اور ڈھیل کا نتیجہ ہے کہ آج پانی سر سے گزر گیا پھر خداوند تعالیٰ کو بھی ہم نے منہ دکھانا ہے۔ آپ اس کے لیے لڑکی دیکھیں۔ میں جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتا ہوں۔“

”لڑکی اور میں۔۔۔“ دلشاد بیگم اچنبھے سے بولیں۔

”کہاں خاطر میں لائے گا وہ میری پسند کو۔۔۔“

”دلشاد بیگم! وہ ہمارا ہی بیٹا ہے۔ اسے اتنا ہوا نہیں بنائیں۔ وہ کیوں شادی نہیں کرے گا۔ کیا عمر بھر ہمارے منہ پہ کالک ملنے کے لیے پیدا ہوا ہے وہ۔“

وہ یک دم غیض و غضب میں آ کر بولے تو دلشاد بیگم چپ ہو گئیں۔



وہ ابراہیم کے پیچھے پیچھے گھر تک آیا تھا۔ اور انہیں یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ جیسا وہ لوگ سوچ رہے ہیں ایسا ہرگز کچھ نہیں ہے۔ ابراہیم نے حقارت سے اس کے گڑے حلیے اور اس کے منہ سے پھوٹی شراب کی بدبو کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں اس غمراہ کی وجہ سے سرخ ہو کر سوخ رہی تھیں۔
وہ اس حالت میں ایمان اور قرآن کی قسمیں کھا رہا تھا۔ ایک غلیظ اور ناپاک شخص بار بار اللہ کا نام

لے رہا تھا۔ ابراہیم کو اس کے وجود سے گھٹن آرہی تھی۔ وہ اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔
 زچ ہو کر وہ غیض و غضب میں چلائے تھے کہ وہ ان کی نظروں کے سامنے سے دفع ہو جائے، وہ جانتا تھا اس وقت ماں کو مطمئن نہیں کر سکتا لیکن۔ باپ، باپ اس کے ساتھ یہ بدسلوکی اور بداعتدادی کرے گا؟ اس سے برداشت نہ ہوا اور وہ غصے میں گھر سے نکل گیا۔ یہ سوچے سمجھے بنا کہ اس کے یوں غائب ہو جانے سے حور پر زندگی کا دائرہ کس قدر تنگ ہو جائے گا مگر اسے پرواہی کہاں تھی۔ رنج تھا تو اس بات کا کہ اس کے والدین اسے اتنا گھٹیا بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اسے صرف اپنی ذات کی پرواہ تھی۔ اور کچھ نہیں۔ سارا دن وہ اپنے دوست کے ہاں بند کمرے میں شراب کے سہارے اپنا غم بھلانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔



دن بھر میں اس کے تین چار فون آچکے تھے۔

سب سے پہلے اسماء نے اس کی خیریت دریافت کی۔ پھر اس کے پاپا نے پھر اس کے چھوٹے بہن بھائیوں نے۔ سب ہی کو فکر لاحق تھی کہ وہ اچانک صبح صبح چلی گئی تھی۔ کیا بات تھی۔ وہ کیا بتاتی کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ اسے انتظار تھا تو طارق کا۔۔۔ طارق آئیں گے تو میں انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی اور مجھے ملازموں کی گواہیاں لینے کی ضرورت کیا ہے۔ میرے ماں باپ اور میرے بہن بھائی جن کے ساتھ میں نے رات گزاری، کیا وہ میرے حق میں نہیں کھڑے ہوں گے۔
 مگر کتنی شرمناک بات ہے۔۔۔ کس طرح سامنا کروں گی میں اپنے ماں باپ کا اور بہن بھائیوں کا۔ کیا میرے سسرال والے مجھ پر اتنا گھٹیا بھی الزام لگا سکتے ہیں۔ کیا اوقات ہے میری میرے سسرال میں، سب کو پتا چل جائے گا۔ یا خدا میں کیا کروں۔ کیا کروں۔۔۔ وہ روروہر بلکان ہو چکی تھی۔
 جو لوگ ایسا الزام لگاتے ہوئے نہ کانپے۔ وہ کیونکر کسی کی گواہی کا یقین کریں گے۔ پھر تو میں ہر طرف سے ذلیل و خوار ہو کر رہ جاؤں گی۔ اسے کوئی راہ بھائی نہ دے رہی تھی۔



بالآخر سسک سسک کر وقت گزر رہی گیا

طارق گھر آ گیا تھا۔۔۔ ابراہیم نے بیوی کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ فی الحال کوئی بھی بات طارق سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک تو وہ سفر سے آ رہا ہے۔ دوسرے جب تک ہمیں خود کسی معاملے کا صحیح علم نہیں ہو جاتا۔ اسے پھیلانا ہمارے لیے بھی باعث شرمناک ہے۔
 ”تو گویا آپ ابھی تک بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔“
 ”ہاں!“ ابراہیم نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ وہ ہماری ہی بیٹی ہے، ہمارا خون ہے۔ وہ بدکردار نہیں ہو سکتی۔“

”موقع واردات سے باز یا ب ہونے کے باوجود آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔“
 ”یہی معمرہ تو حل نہیں ہو رہا ہے۔“ وہ یک دم منڈھال سے بولے تو دلشاد کے چہرے پہ چمک

آگئی۔

”ٹھیک ہے آپ کہتے ہیں تو میں طارق کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ پھر بھی میں دیکھتی ہوں آپ کی بھانجی اپنا گھر سہائے گھٹا نہیں۔“

طارق والدین کے کمرے میں کچھ دیر بیٹھا رہا تھا۔ اسے باپ کی طبیعت کی فکر ہو رہی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر امجد سے ٹائم بھی لے لیا تھا جو انہوں نے کل رات کا دیا تھا۔

رات دس بجے جب طارق اپنے کمرے میں آیا تو حور کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ سنا ہوا چہرہ۔ متورم آنکھیں اور خشک ہونٹ اور اجڑا اجڑا سا حلیہ۔ وہ طارق کو دیکھ کر بے صبری سے بستر سے اٹھی اور طارق کے سینے سے لگ گئی۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ طارق حیران و پریشان تھا۔

”کیا ہوا ہے حور! کچھ بتاؤ تو سہی۔“ اس کا نرم اور ملائم لہجہ۔ حور کو حیران کر گیا۔ اس نے بے یقینی سے سر اٹھا کر طارق کی طرف دیکھا۔

وہ خود پریشان سا، الجھا ہوا سا اس کی طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ حور نے جلدی جلدی دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں۔

”آپ کو کسی شے کچھ نہیں بتایا؟“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ وہ خود کس منہ سے اور کس طرح بتائے گی کہ بات کیا تھی۔

طارق نے نفی میں سر ہلا دی اور مسکرا کر اس کے گرد بازو جمائل کرتے ہوئے اسے صوفیہ پہ اپنے ساتھ بٹھایا پھر کہنے لگا۔

”ضرور ماما کاو۔ تمہارا جھگڑا ہوا ہوگا۔ ہے نا۔ یا دل آویز وغیرہ نے تمہیں کچھ کہہ دیا ہوگا۔ کم آن حور! ان باتوں کو لے کر چلو گی تو زندگی کیسے گزرے گی۔ ہاں اور تمہیں پتا ہے۔ بابا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ان کی ہارٹ بیٹرس بڑھی ہوئی ہیں جو تنوشٹ ناک ہے۔ شاید اس وجہ سے کسی نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ تم بتاؤ تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ ارے یہ کیا! مجھ تو لگتا ہے تمہیں نمبر بچر بھی ہو رہا ہے۔

کم آن حور! کچھ تو حوصلہ کرو۔ میرے ساتھ زندگی گزارنا اتنا آسان نہیں ہے۔ تمہیں میں پہلے بھی بتا چکا ہوں تمہیں ان سب مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

وہ آہستہ آہستہ۔ پیار سے اسے بہلا رہا تھا۔ وہ اس کی محبت پا کر بجائے خود کو مضبوط پانے کے ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔

”طارق! آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے۔“ اس کی آواز مدھم تھی۔

”کیا میں نے تمہیں چھوڑنے کے لیے اپنا یا تھا۔“ وہ اس کے بال سنوار رہا تھا۔ وہ بے یقینی سے طارق کی طرف دیکھنے لگی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اسے طارق کو سب کچھ بتا دینا چاہیے وہ طارق سے کچھ نہیں چھپائے گی اور طارق کو سب کچھ بتا دیا۔

”آج صبح صبح ولید نے مجھے فون کیا۔ میں ابو کے گھر میں تھی، سو رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے لینے آرہا ہے۔ دوسرے بہت پریشان لگ رہا تھا میں خود بھی پریشان ہو گئی۔ وہ مجھے لینے آ گیا۔ میں اس

کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھی تو میں نے سب گھروالوں کے بارے میں پوچھا۔ وہ اپنے فونوں میں مصروف رہا۔ پھر وہ مجھے نانو والے گھر میں لے گیا اور اس نے مجھے سارا قصہ سنایا کہ وہ مجھے کیوں لے کر آیا ہے۔ مجھے اس پر سخت غصہ آیا۔ اسے آپ کا بھی پتا نہیں تھا کہ آپ شہر سے باہر ہیں۔ ابھی میں اسے غصے میں برا بھلا کہہ کر نکل ہی رہی تھی کہ ماما اور بابا پہنچ گئے اور پھر۔۔۔ ماما نے مجھ پہ ایسے ایسے الزام لگائے کہ میں بتا نہیں سکتی۔“

یہ کہہ کر حور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ”میں نے ان کے الزامات کو جھٹلایا اور ولید نے بھی۔ مگر انہیں یقین نہیں آیا، انہوں نے کہا کہ میں رات بھر وہیں رہی ہوں پھر انہوں نے بابا کو بھی یہی کچھ بتایا۔ طارق میں نے بابا کی نگاہوں میں خود کو مجرم پایا تو میں بالکل ٹوٹ گئی۔ مگر میں مجرم نہیں ہوں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں مجرم نہیں ہوں۔ آپ تو اس بات کا یقین کریں گے نا۔ اور وہ ولید، ولید تو غائب ہی ہو گیا۔ کم از کم۔۔۔ اسے بھی سچائی کا سامنا تو کرنا چاہیے تھا۔ آپ کے بھائی نے میرے ساتھ جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ نہ جانے یہ لوگ کیا چاہتے ہیں طارق! جو میرے ساتھ ایسا ہوا۔“ وہ رو رہی تھی۔

یک دم اس نے محسوس کیا۔ طارق کا بازو اس کے گرد سے ہٹ گیا تھا۔ طارق کی آنکھوں میں اجنبیت اور چہرے پر سفاکی تھی۔ حور اس کے تاثرات دیکھ کر کانپ اُٹھی۔



دو روز کے بعد ولید کو اس بات کا خیال آیا تھا کہ یوں بند کمرے میں بیٹھ کر ماتم کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسے اصل حقائق کو سامنے لانا ہوگا۔ سچائی جب ہی بے نقاب ہوگی جب وہ دونوں ملازموں کو گھر لے کر جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ وہاں سے نکل پڑا تھا۔

دو دن تک غم و غصے میں بھڑبھڑ جلنے کے باوجود بھی اس کا غصہ نہیں اتر ا تھا کہ اس کی ماں نے اس پر اتنا گھٹیا الزام لگاتے ہوئے ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا۔

کیا وہ اسے اتنا زلیل سمجھتی ہیں کہ وہ اس قدر گری ہوئی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ مانی گاڈ۔ ماما۔ کم از کم آپ کو کچھ تو لحاظ کرنا چاہیے تھا۔

آپ حور العین سے اتنی نفرت کرتی ہیں کہ آپ نے اپنے بیٹے کے منہ پر بھی کیچڑ مل دی۔ پتا نہیں بھابھی کا کیا حال ہوگا۔ یہ حالات تو طارق کو بھی پتا چلے ہوں گے۔ بھابھی کس طرح ایکی ساری نفرتوں کا مقابلہ کر رہی ہوں گی۔ کوئی بعید نہیں ماما نے انہیں گھر سے بھی نکال دیا ہو۔“ اس کی کپنیاں سلگنے لگی تھیں۔

وہ سیدھا اپنے ٹھکانے پہ پہنچا تھا۔ مگر وہاں تالے لگے ہوئے تھے اور یہ اس کے لیے اچھی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ایسا پہلے بھی ہوتا تھا۔ اور تب وہ با آسانی تالے توڑ دیتا تھا۔ مگر اب اسے تالے توڑنے سے غرض نہیں تھی۔ اسے تو شیر خان اور رانی سے ملنا تھا۔ دونوں گھر کی پچھلی سائیڈ پہ کوارٹر نما پوریشن میں رہتے تھے۔ وہ گھر کی پچھلی سائیڈ پر آ گیا۔ کوارٹر میں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ ایسا آج تک نہیں ہوا تھا کہ شیر خان اسے بتائے بغیر کہیں گیا ہو۔ شیر خان اس کا ذاتی ملازم تھا۔ وہ اس کے ہر ٹھکانے سے واقف تھا۔

لیکن اسے نرٹ مایوسی ہوئی۔ شیر خان کا کہیں بھی اتنا پتا نہ ملا۔ شیر خان کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر اسے شاید جھنجھلاہٹ اور غصہ آرہا تھا۔ مگر وہ لاچار تھا اچانک شیر خان کا یوں غائب ہو جانا۔ اس کے پیچھے کیا مجید ہو سکتا ہے۔ اسے یہ سب کچھ جاننے سے غرض نہیں تھی۔ نہ ہی اس کا فی الفور ادھر دھیان گیا۔

شام تک زنج ہو کر وہ گھر لوٹ آیا اور اسے گھر لوٹنا ہی تھا۔ وہ مجرم تو نہیں تھا جو یوں منہ چھپا کر بیٹھا رہتا۔ حیرت کی بات تھی یہ باتیں آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں آرہی تھیں۔ ان دونوں میں حور پر کیا گزری ہوئی، اسے اب اس کی بھی فکر ہونے لگی تھی۔

بہر حال جو کچھ بھی ہوا تھا۔ ٹھیک نہیں تھا۔ اسے ہی اس سنگین مسئلے کا حل نکالنا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو گھر میں غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

پھر اچانک سیڑھیوں کے آگے اس کے قدم رک گئے۔ پہلا خیال یہی آیا۔ نہ جانے بھابھی اوپر ہیں یا اپنے منگے۔

وہ اس قدر شرم سار تھا۔ فی الحال حور کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ گزرتے ہوئے اسے دلنشین کے کمرے سے آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ یہ کمروں کی پچھلی سائینڈھی۔ دلنشین کے کمرے کی کھڑکی ادھ کھلی تھی۔ وہ با آسانی سن سکتا تھا۔ دلنشین ماں سے الجھ رہی تھی۔

”نار گاؤسک ماما۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ نے یہ بات طارق بھائی سے کیوں چھپا کر ہے۔ مصلحت، مصلحت۔۔۔ غیرت کے اوپر آپ مصلحت کو ترجیح دے رہی ہیں۔ مائی گاؤ ماما۔۔۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ یہ طارق بھائی کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوگا۔ آپ کو انہیں صاف صاف بتا دینا چاہیے تاکہ اس مصیبت سے جان چھوٹے۔“

دلنشین کے لہجے میں بے زاری ہی نہیں نفرت بھی تھی۔

”بے وقوف ہو تم دشتی۔۔۔ تم کیا سمجھتی ہو۔۔۔ اس طرح وہ حور سے جان چھڑالے گا اور ہمارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ تم معاملے کی سنگینی کو سمجھو۔ طارق بھی مرد ہے۔ کیا وہ ایک منٹ بھی اس بات کو برداشت کر سکے گا۔ وہ اپنے بھائی کا خون کر ڈالے گا۔ پھر اس سے جان چھڑائے گا۔ اس چڑیل کے پیچھے میں اپنے دونوں بیٹوں سے ہاتھ دھو ڈالوں۔ ایک زندگی سے چلا جائے اور دوسرا سلاخوں کے پیچھے۔ کیا تم اخبارات میں آئے دن ایسے واقعات نہیں دیکھتیں۔“

وہ تو اس گھر کی بربادی کا ہی عزم لے کر آئی ہے۔ تب ہی ایسے گل کھلا رہی ہے۔ مگر میں تو بے وقوف نہیں ہوں۔ اس کا وار کا میاب نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے اس سے جان بھی چھڑانی ہے اور اپنے دونوں بیٹوں کو بھی بچانا ہے۔ پھر۔۔۔ تمہارے بابا۔ ان کی صحت اجازت نہیں دیتی کہ اس معاملے پر مزید ہم کچھ کریں۔ اس کا کچھ نہیں جائے گا دشتی۔ ہر طرف سے نقصان میرا ہی ہے۔ اس لیے میں طارق کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ وقت طارق کو خود بتائے گا۔“

”مگر مجھے یقین ہے۔۔۔ اس چلتے نے سستی سادتری بن کر طارق کو کوئی نہ کوئی من گھڑت کہانی ضرور سنائی ہے۔ آپ طارق کی خاموشی دیکھ رہی ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ طارق اس معاملے سے

آگاہ ہو چکا ہے، وہ الجھا ہوا بھی ہے اور پریشان بھی۔ مگر بابا کی وجہ سے وہ کوئی بات نہیں کر رہا۔ شاید وہ سچائی سے پوری طرح واقف نہیں ہوا ہے۔“

”اے الجھنے دودھی۔ وہ جتنا الجھے گا، اتنا ہی اپنی بیوی سے دور بھاگے گا۔ آخر وہ کب تک اپنی غیرت پہ پہرے بٹھائے گا۔ یہ خود اذیتی کے لمحے ہی اسے حور سے دور کرنے کے لیے ہی کافی ہیں۔ پھر ہماری بلا سے طارق اسے رکھے یا چھوڑے۔ ہمیں اس بات سے کوئی مطلب نہیں۔ میں اصباح کو طارق کی دلہن نہیں بنا سکی تو کیا ہوا، طارق کسی اور کے ساتھ بھی نہیں رہ پائے گا۔“

پھر دلشاد کا لہجہ مغموم ہو گیا۔
”میں نے اس گھر میں اس کے نہیں۔ اپنی بھتیجی کے خواب دیکھے تھے۔ اس غلطی کا احساس میں تمہارے باپ کو دلانا چاہتی ہوں۔ وہ تمہارے باپ کی مرضی سے اس گھر میں آ تو گئی تھی۔ لیکن یہاں بس نہیں سکتی۔ تم دیکھنا، طارق اسی سے جلد ہی علیحدگی اختیار کر لے گا۔ اور تب میں اصباح کو بڑی دھوم دھام سے طارق کے ساتھ بیاہ کر لاؤں گی۔“

تم نہیں جانتیں دلشی۔ میں اپنے بھائی کے سامنے کس قدر شرم سارہوں۔ میں جو مدت سے اصباح کو بہو بنانے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ میرے ان خوابوں سے میرے بھائی واقف تھے۔ مگر میں نے طارق کو بیاہ کر اپنے بھائی سے وعدہ خلائی کر ڈالی۔ اس وعدے کو نبھانے کا وقت آ گیا ہے۔ اب تم دیکھنا اس گھر میں ہماری سمن چاہی خوشیاں ہوں گی۔ بس تھوڑا سا صبر کرو۔۔۔“

ولید کے اندر بھونچال پٹا ہو گیا۔ ”تو صرف ایک اصباح کو اس گھر میں لانے کے لیے آپ نے۔ ماما! آپ نے یہ ڈرامہ رچایا ہے۔ صرف اپنے مفاد کے خاطر۔ نہ صرف اپنے بیٹے کو ذلیل کیا۔ بلکہ طارق کا بھی گھر اجاڑنا چاہتی ہیں۔ نہیں ماما! نہیں۔ میں طارق کا گھر اجڑنے نہیں دوں گا۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ آپ جو چاہیں گی، وہ ہوتا چلا جائے گا۔“

وہ ماں کا سامنا کر سکتا تھا۔ ان سے سوال جواب کر سکتا تھا۔ مگر نہیں۔ اس وقت اسے اپنے غصے اور جذبات پہ قابو پانا تھا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے غم و غصے کی حالت میں وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔



ٹی وی کی تیز آواز سن کر دلشاد ٹھٹھک گئیں۔ تو گویا آج دو دن بعد وہ گھر آ ہی گیا تھا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ کمرے کی ساری لائٹس روشن تھیں۔ وہ ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا۔ دلشاد نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ بستر پہ بدستور پڑا رہا۔ جیسے ماں کو نظر انداز کر رہا ہو۔ دلشاد اس کے رویے پہ کھول انھیں۔

”مل گئیں تمہیں فرصت گھر آنے کی۔“ دلشاد نے ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش لیٹا

رہا۔ جیسے سننے سے قاصر ہو۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں ولید۔۔۔!“

دلشاد سخت غصے میں تھیں۔ اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی سے

دلشاد اچھی طرح سے واقف تھیں۔

”کس منہ سے اس گھر میں قدم رکھا ہے تم نے۔۔۔؟“

ولید کے بدن میں خون آگ بن کر دوڑنے لگا۔ کنپٹیاں سلگ گئیں اور ضبط کی کشمکش چہرے سے عیاں ہونے لگی۔ وہ بستر سے اٹھ گیا اور فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔

”میں تمہاری ہٹ دھرمی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ بچپن سے آج تک تم نے جب بھی غلط کام کیے تمہیں کبھی اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا۔“

وہ تب بھی کچھ نہیں بولا۔ پیٹھ موڑے کھڑا رہا۔

”تمہارے باپ نے اس واقعے کو اپنے دل پہ لے لیا ہے۔ مگر تمہیں۔۔۔ تمہیں ذرا سا احساس

بھی نہیں ہے۔“

اس نے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا۔ دھواں دھواں چہرہ اور دکھ سے لبریز آنکھیں۔ جو رنج سے

شکوہ کر رہی تھیں۔ دلشاد نظریں نہ ملایا نہیں۔ ذرا دیر کو ندامت نے بھی دل پہ دستک دی تھی۔

”جو کچھ بھی ہوا۔۔۔ میں اس پہ بحث نہیں کرنا چاہتی۔“ دلشاد نے خود ہی اس موضوع کو ٹال دیا۔

ولید کو حیرت ہوئی۔۔۔ وہ ماں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ شیر خان اور رانی کو کہاں غائب کر دیا ہے۔

لیکن اسے شدید شاک لگا جب دلشاد نے اس موضوع پر بات کرنے سے ہی انکار کر دیا۔

”تمہارے بابا۔۔۔ تم سے سخت ناراض ہیں۔ اب ہماری عمر اور صحت اس چیز کی اجازت نہیں

دیتی کہ ہم آئے دن تمہارے ان کارناموں سے اپنے منہ پہ کالک ملیں اور تمہیں بے مہار چھوڑے

رکھیں۔ تمہاری شادی بھی طارق کے ساتھ ہو جاتی تو بہتر تھا۔ لیکن تم سنجیدہ ہی نہیں ہوئے اور اس کی سزا

ہم بھگت رہے ہیں۔۔۔ خیر۔۔۔ ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی جلد از جلد کر دیں تاکہ تمہارے

گناہوں کا بوجھ ہمارے دامن میں نہ آئے۔“

ولید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دلشاد نے نظریں اٹھا کر بیٹے کی طرف دیکھا تو وہ ماں سامنے سے

ہٹ کر کھڑکی کی جانب بڑھ گیا جولان میں کھلتی تھی۔

”تمہیں اگر کوئی لڑکی پسند ہے تو بتا دو۔۔۔ ورنہ۔۔۔ میں اور تمہارے بابا اپنی پسند سے تمہاری

شادی کرنے کا پورا اختیار رکھتے ہیں۔“ دلشاد کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

ولید کے چہرے پہ تلخ تبسم نکھر گیا۔ چونکہ اس کا رخ دلشاد کی طرف نہیں تھا۔ اس لیے دلشاد اس کے

تاثرات دیکھنے سے قاصر تھیں۔ جب اس نے کوئی جواب ہی نہ دیا تو دلشاد زچ ہو گئیں۔

”میں ایک گھنٹے سے بک بک کر رہی ہوں اور تم ہو کہ پتھر کی طرح کھڑے ہو۔ آخر اس طرح کب

تک چلے گا ولید۔۔۔ تمہارے اس غیر ذمہ دارانہ رویے سے جانتے ہو یہ گھر بربادی کے دہانے پہ آکھڑا

ہوا ہے۔“

ولید کے اندر آندھیاں چلنے لگیں۔ ماں کے رویے پر اسے شدید دکھ ہو رہا تھا۔

”اور تم ہو کہ تمہیں احساس ہی نہیں۔۔۔“

”میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ما۔۔۔“ اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ ”مگر مجھے دکھ اس بات کا

ہے کہ آپ نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔“

دلشاد نے چونک کر دیکھا۔ وہ پیٹھ موڑے کھڑا تھا۔

”ہمیشہ سے ہی آپ طارق کو چاہتی تھیں اور اسے ہم سب پر فوقیت دیتی تھیں۔ آپ کی بھرپور توجہ سے وہ آپ کا فرماں بردار بننا چلا گیا اور میں۔۔۔ میں محبتیں باہر تلاش کرنے کی کوشش میں خود سے بھی دور ہوتا چلا گیا۔ پھر آپ نے مجھے اپنے وجود سے ہی کاٹ کر پھینک دیا۔ اور آپ کو مجھ سے اتنی نفرت ہے آپ نے مجھے ایسے گھٹاؤنے فعل کا ذمہ دار ٹھہرا دیا۔ کیوں ماما کیوں؟ کیا میں آپ کی اولاد نہیں تھا۔۔۔؟“ وہ تڑپ اٹھا تھا۔

دلشاد کا دل ہی تو تھا پتھر تو نہیں۔ ماما کے احساس سے لبریز ہو گیا وہ پڑمردگی سے ولید کے قریب آگئیں اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر رنج سے کہنے لگیں۔

”کیوں نہیں۔ تم بھی میری اولاد ہو۔ لیکن۔۔۔ تمہاری کچھ نادانیوں نے تمہیں آج رسوا کیا ہے۔۔۔؟ میں تمہیں اول روز سے منع کرتی تھی کہ تم اس سے تعلق نہ رکھنا۔۔۔ یہ عورت اچھی نہیں ہے۔ مگر تم نے میری ایک نہ سنی اس واقعہ کا تمہیں کتنا صدمہ ہے۔ جبکہ وہ سکون سے رہ رہی ہے۔ غیرت مند ماں باپ کی اولاد ہوتی تو کیا اس گھر میں آئی۔۔۔“

ماں کے خیالات سے ولید کے دل کو گھیس پہنچ رہی تھی۔ صرف حورالعین کو اس گھر سے نکالنے کے لیے یہ ساری سازش بنی چارہ ہی تھی اور اصباح کو لانے کے خواب دیکھے جارہے تھے۔ اسے اصباح سے بے انت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ حورالعین کی صفائی میں بولنا چاہتا تھا۔ مگر دلشاد سننے پہ آمادہ ہی کہاں نہیں۔

”جو کچھ ہو چکا ہے نا۔ اسے بھول جاؤ۔ ولید۔۔۔ اس گھر کی سلامتی کے لیے یہی بہتر ہے۔“

پھر وہ رسان سے اس کا بازو پکڑ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولیں۔

”جو پروپوزل میں نے تمہیں دیا ہے۔ اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر مجھے جواب دینا۔

اب ہم مزید تمہاری شادی میں تاخیر نہیں کر سکتے۔“

وہ گم صم سامان کی طرف دیکھنے لگا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔؟“ دلشاد نے نرمی و محبت سے اس کے بال پیشانی سے ہٹائے۔ تو

ولید کا دل کسی پتھر کی طرح سخت ہو گیا۔ اسے اصباح سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ماں نے یہ مکر و فریب جال بنا تھا۔ ولید نے سر جھکا لیا اور فرش کو گھوڑنے لگا۔

”آپ نے طارق کی زندگی کا فیصلہ کرنے سے پہلے طارق کو تو ایسا اختیار نہیں دیا تھا۔ جیسا مجھے

دے رہی ہیں۔ حالانکہ سب جانتے تھے۔ طارق حور بھانجی کو پسند بھی کرتا ہے اس کے باوجود اس رشتے کی آپ نے مخالفت ہی کی۔ پھر مجھے یہ اختیار کیوں۔۔۔؟“

وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر دانت پہ دانت جمائے بیٹھا رہا۔ دلشاد اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔

وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے طارق کا گھر بچانا تھا اور وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

”جن لڑکیوں سے میری دوستیاں ہیں، ایسی لڑکیاں بیویاں بنانے کے قابل نہیں ہوتیں۔“

کافی دیر بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو دلشاد کو خوش گوار حیرت ہوئی۔
”مجھے خوشی ہوئی کہ تم ایسی سوچ رکھتے ہو۔“

”میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جو صرف آپ کی من پسند ہو۔“

”میری من پسند۔۔۔؟“ دلشاد کو جھکا لگا۔ گویا انہیں ولید کی فرماں برداری پر یقین ہی نہ آ رہا ہو۔

”ہاں ماما۔۔۔ صرف آپ کی من پسند۔۔۔“ ولید نے یہ کہہ کر ماں کے ہاتھ تھام لیے اور عقیدت

سے انہیں اپنے ہاتھوں میں بھینچے ہوئے بولا۔

”صرف آپ کی من چاہی لڑکی ہی میری زندگی کا رخ بدل سکتی ہے۔ مجھے بھٹکنے سے روک سکتی

ہے۔ باکر دار، خاندانی اور نیک سیرت لڑکی۔۔۔ آپ ہی میرے لیے تلاش کر سکتی ہیں۔“ دلشاد کو اپنے

کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”نیک سیرت۔۔۔ باکر دار۔۔۔ من پسند۔۔۔ صرف اور صرف اصباح اس کے علاوہ اور کون

ہو سکتا ہے۔ دلشاد کا دل گواہی دے رہا تھا۔ مگر۔۔۔ نہیں۔۔۔ ولید۔۔۔ ولید میں بہت کمی ہے۔ وہ اس

رشتے کو نہیں نباہ سکتا۔“

”کیا سوچنے لگی ہیں ماما۔۔۔؟“ ولید نے دلشاد کے چہرے پہ آتی چمک کو مایوسی میں ڈوبتا دیکھ کر

استفسار کیا تو دلشاد صاف گوئی سے بولیں۔

”کیا تم میری من پسند لڑکی کے ساتھ خوش گوار اور باعزت زندگی گزار لو گے۔۔۔؟“

ان کے اندیشے زبان پہ آئے تو ولید کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھوکا دینے میں لطف آیا۔

وہ ماں کے پہلو سے نکل کر کھڑا ہوتے ہوئے شکوہ کنناں لہجے میں بولا۔

”میں جانتا ہوں۔ آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے۔۔۔ مگر نہ تو آپ نے پہلے مجھے اس کے قابل

سمجھا تھا اور نہ ہی اب سمجھیں گی۔“

وہ مایوسی سے کہہ کر دوسری جانب بیٹھ گیا۔ دلشاد الجھنیں اور شش و پنج میں مبتلا ہو کر بیٹے کی طرف

دیکھنے لگیں۔ جہاں سنجیدگی نمایاں تھی۔ (اچانک ولید میں اتنی چمک ہے ضرور وہ اپنے کیے پر نادم ہے۔)

کچھ لمبے یونہی گزر گئے۔

”میں تمہارے بابا سے بات کروں گی۔ پھر جیسا وہ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“

”نہیں ماما۔۔۔ مجھے بابا کی چاہت کی نہیں آپ کی چاہت کی ضرورت ہے اور میں یہ بھی جانتا

ہوں، وقار ماموں کی اصباح سے زیادہ آپ کے دل میں کسی اور لڑکی کی چاہت ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ کو یہ

رشتہ قبول ہے تو مجھے بھی دل جان سے قبول ہوگا۔“

دلشاد کو اپنی ساعتوں پہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اگر کبھی طارق سے ہٹ کر ولید کے بارے میں

انہوں نے سوچنا بھی چاہا تھا تو اسی خوف نے پیش قدمی سے روک دیا تھا کہ ولید کہاں ایسی لڑکی کو خاطر

میں لائے گا۔ جو کم پڑھی لکھی اور سیدھی سادی ہوگی۔

لیکن اب ولید خود ہی ایسی لڑکی کی خواہش کر رہا تھا۔ ولید نے انہیں نئی امنگ اور نئی فکر میں مبتلا کر

دیا تھا۔



آج بہت دن کے بعد اسے یونیورسٹی میں دیکھ کر راجیل کو گہری طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ دلنشین میں واضح تبدیلی تھی۔ پہلے کی نسبت وہ زیادہ خود اعتماد اور بولڈ دکھائی دے رہی تھی اور یہ تبدیلی سب ہی محسوس کر رہے تھے۔

”بہت دن سے میں تمہیں مس کر رہا تھا۔ دلشی! کئی بار تمہیں فون بھی کیا لیکن تم نمبر دیکھ کر فون آف کر دیتی تھیں۔ میں جانتا ہوں، میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔ اس دوران میں سخت ٹینشن میں رہا۔ تم جانتی ہو۔ امی کی طبیعت سچ نہیں رہتی۔ ساری ذمے داریاں مجھ ہی پر ہیں۔

بس ان ہی حالات کی وجہ سے تمہیں نہ جانے کیا کچھ کہہ بیٹھا۔ آئی ایم سوری دلشی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں بہت دن سے گلٹی فیل کر رہا ہوں۔ کئی راتوں سے سو نہیں پایا۔ میں نے واقعی تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ حالانکہ تم جیسی لڑکی ہی میرا آئیڈیل ہو سکتی ہے۔ اس بات کا احساس مجھے تم سے دوری کے بعد ہوا ہے کہ تم میرے لیے کیا ہو، اس روز میں نے تمہیں برا بھلا کہا۔ تم بھی مجھے برا بھلا کہہ لو لیکن پلینز ناراض مت ہو۔ آئی ایم سوری دلشی۔ آئی ایم ریکلی سوری۔“

اس کی منت سماجت سے دلنشین قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ جو راجیل کو حیران کر گیا۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ اس کی ایک بات نہیں سنے گی۔ الٹا برا بھلا کہہ کر اس کے پاس سے اٹھ جائے گی۔ لیکن دلنشین کا رویہ بالکل متضاد تھا۔ وہ دوستانہ لہجے میں راجیل سے مخاطب ہو کر بولی۔

”اپنی دے۔۔۔ جو کچھ ہو چکا ہے۔ میں اسے بھول چکی ہوں۔ تمہیں بھی وہ سب کچھ بھلا دینا چاہیے۔ ہم اچھے دوست ہیں۔ اور اچھے دوست ہی رہیں گے۔“

”ریکلی دلشی۔۔۔!“ راجیل کو یقین ہی نہیں آیا۔ وہ تو اسے منانے کو ایک معرکہ سمجھ رہا تھا لیکن یہاں تو معجزہ ہی ہو گیا تھا۔ وہ حیرانی سے دلنشین کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پہ دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ راجیل کو اپنا مقصد با آسانی ہوتا نظر آ رہا تھا۔ جبکہ دلنشین اس کی دیوانہ وار خوشی پہ دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔

”جب اسے علم ہوگا کہ میں کسی اور سے منسوب ہو چکی ہوں اور اسے چاہنے بھی لگی ہوں۔ تب اسے بالکل ویسا ہی صدمہ ہوگا۔ جیسا مجھے اس روز ہوا تھا۔ جب میں نے بے وقوفی میں خود ہی اسے پر پوز کر دیا تھا۔ تب اس کی بے اعتنائی پہ مجھے اپنا آپ کتنا گھٹیا لگا تھا۔ میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو کبھی بھی نوک نہ سنہیال پاتی۔ مگر میں نے خود کو سنہیال لیا اور یہ۔۔۔ یہ بھی خود کو سنہیال نہیں پائے گا۔ تب مجھے اپنی بے عزتی کا جواب لوٹا کر کتنا سکون ملے گا۔“ وہ دل ہی دل میں ہنستے ہوئے راجیل کے ہمراہ گھاس پہ نال رہی تھی۔



”میرا خیال ہے کہ تم کچھ روز کے لیے اپنے پیئرٹس کے ہاں چلی جاؤ۔“

بہت دن کے بعد طارق نے اس سے گفتگو کی تھی۔

طارق کے سر روپے سے وہ پہلے ہی لہولہاں تھی۔ اب اسی بات پر اس کی جان پہ بن گئی۔
”میں اپنا گھر چھوڑ کر بلا وجہ کہیں کیوں جاؤں؟“

اس کا زلی اعتماد۔۔۔ اور خود سری۔۔۔ بہت دن کے بعد اس کے رویے میں عود آئی تھی۔ طارق نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی وہ کتنی دلیر تھی جبکہ ولید نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اور وہ ماما رضی سے شادی کرنے پر رضامند بھی ہو گیا تھا۔

آخر ولید کے اس قدر ٹوٹنے کی وجہ کیا تھی؟ شاید یہ کہ وہ مجرم تھا۔ طارق کے شبہات پھر سے زندہ ہونے لگے تھے۔

”میں رانی اور شیر خان کو زمین کی ساتویں تہ سے بھی ڈھونڈ نکالوں گی۔“

گویا اس نے طارق کی خاموشی کو چیلنج کیا تھا۔

طارق کچھ نہیں بولا۔ اس کی سرد مہری، بے اعتنائی پہ وہ سلگ گئی۔ اور شکوہ گناں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”مجھے آپ سے ایسے رویے کی امید نہیں تھی۔ طارق۔۔۔! آپ کے گھر میں میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا، میں نے بھی آپ سے سپورٹ نہیں مانگی، بسھی ان حالات کا رونا نہیں رویا آپ سے۔ جو مجھے درپیش تھے۔ اکیلے ہی مقابلہ کرنی رہی۔ صرف آپ کی خاطر۔ آج مجھے آپ کی سپورٹ کی ضرورت تھی۔ آپ کے مکمل اعتماد کی ضرورت تھی۔ آج آپ نے پھر مجھے تباہ چھوڑ دیا۔ آپ نے تو مجھ سے محبت کے دعوے کیے تھے۔ کہاں گئی وہ محبت۔۔۔ وہ دعوے؟“

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھگ گئی۔

”اگر پھر بھی آپ کو ایسا ہی لگتا ہے۔۔۔ تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی وارڈروب کھولی اور اپنے کپڑے بیک میں ڈالنے لگی۔

اسے طارق کی محبت پر اعتماد تھا۔ تب ہی اس نے طارق کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ مگر طارق ایسا کرے گا۔ اسے امید نہیں تھی۔ اسے طارق کے رویے کا گہرا دکھ تھا۔

”میں اب یہاں سے چلی گئی تو پھر کبھی واپس نہیں لوٹوں گی۔“

اس کی آواز دھیمی اور رنجیدہ تھی۔ اس نے بیک کی زپ بند کرتے ہوئے کہا تو طارق اس کے سامنے آ گیا۔ اور اس سے بیک چھین کر دوڑ پھینکتے ہوئے بولا۔

”بابا کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ گھر میں بھی کچھ تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں۔ جو میرے لیے ہی نہیں شاید تمہارے لیے بھی اچھے کا سبب ہوں۔ میں نے تمہیں عارضی جانے کا کہا ہے۔ ہمیشہ کے لیے نہیں۔ میرے اوپر کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ جنہیں میں یکسوئی سے نبھانا چاہتا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ دن رات تم اس واقعے کو دہرا کر مجھے ذہنی اذیت پہنچا رہی ہو۔ میں نے تمہیں ایک بار بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا۔ مگر شاید تمہیں احساس ہی نہیں ہو رہا کہ مجھے اس موضوع سے کتنی تکلیف ہو رہی

”ہے۔“

حور نے حیرت سے طارق کی طرف دیکھا۔ وہ کس خود غرضی سے اپنی تکلیف کا احساس دلارہا تھا۔ اور جس کے اوپر یہ جھبونی تہمت لگی تھی۔ اس کی تکلیف اس سے کتنی زیادہ تھی۔ اس کا اسے احساس ہی نہیں تھا۔ حور کا دل شدت غم سے پھٹ پڑا۔

”آپ۔۔۔ طارق۔۔۔!“ اس کی آواز گھٹ رہی تھی۔ اور انگشت شہادت طارق کے سامنے تھی۔

”آپ کو ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔ اس لیے آپ مجھے میرے پیرنٹس کے ہاں بھیج رہے ہیں۔ میرا سوچا ہے؟ میرا چین سکون، راتوں کی نیندیں سب کچھ برباد ہو گیا۔ کوئی مددوار کرنے والا نہیں۔ ایسی صورت حال میں۔۔۔ میں وہاں۔۔۔ وہاں کیسے رہ پاؤں گی۔“

وہ ڈھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ مگر وہ کیا کرتا۔ اس کے شکوک کو تقویت پہنچانے کے لیے ولید کا فیصلہ۔۔۔ کاری ضرب ثابت تھا۔

”میں فی الحال تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ جیسے چکر اسار گیا تھا۔

”آپ مجھ سے کھل کر بات کریں طارق۔۔۔! یہ معاملہ معمولی نہیں ہے۔ ہماری ازدواجی زندگی کا سوال ہے۔ آپ کا مجھ سے فرار، مجھے مجرم ثابت کر رہا ہے۔ مجھے زمانے کی پروا نہیں ہے۔ لیکن آپ کی سردمہری دن رات مجھے سسکار کر رہی ہے۔“

”ولید نے فوری شادی کا اعلان کر دیا ہے۔ اور وہ بھی ماما کی پسند سے۔“

وہ اپنے غم میں بڑھال بھی کہ طارق نے یہ ہم اس کے سر پر مارا۔ اس کی رگ رگ میں سناٹا پھیل گیا۔ اس نے تحیر سے طارق کی طرف دیکھا۔ جیسے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ ولید کے اس فیصلے کے پیچھے کون سا عمل کارفرما ہے۔

”وہ گھر واپس آ گیا ہے۔ بچپن سے ہی وہ اس قدر ہٹ دھرم اور ضدی ہے۔ کبھی اپنے کسی گناہ پہ نادم نہیں ہوا۔ اچانک اس کا یوں جھک جانا۔۔۔ کیا ثابت کرتا ہے؟“

وہ حور سے سوال کر رہا تھا۔ حور کے اندر باہر آندھیاں چلنے لگیں، اتنی بڑی سازش۔۔۔ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا ہے۔

میں ولید کو فیر جھتی رہی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ وہ بھی اپنی ماں بہنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ حور کے چہرے کے تاثرات طارق سے پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ کپکپاتے لبوں سے کچھ بولنا چاہتی تھی۔ طارق نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

”ولید کی شادی خیر خیریت سے ہو جائے۔ میں اپنی رہائش تبدیل کر لوں گا۔ میں آئندہ زندگی میں کبھی اس موضوع پر تم سے کوئی بات سننا پسند نہیں کروں گا۔“

طارق کے رویے میں اجنبیت اور سردمہری تھی۔ گویا اپنے ساتھ اسے رکھ کر وہ اس پہ احسان کر رہا تھا۔

وہ یوں نظروں سے گر کر۔۔۔ اپنے جیون ساتھی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل پائے گی۔ جسے

یہ زعم تھا کہ وہ پورے وقار اور تمکنت کے ساتھ اس کی زندگی میں داخل ہوئی ہے۔ اس کی عزت، توقیر تو ملیا میٹ ہو گئی تھی۔۔۔ پھر وہ کیسے زندگی گزارے گی۔ طارق کمرے سے جا چکا تھا۔ اور۔۔۔ وہ۔۔۔ شش و پنج میں مبتلا کھڑی تھی۔



ولید نے شادی کے لیے رضامندی کا اظہار کیا تو سارے ہی کام جھٹ پٹ طے پا گئے۔ دلشاد کو امید ہی نہیں تھی کہ وہ اپنے بھائی سے بڑے بیٹے کے بجائے چھوٹے بیٹے کے لیے ان کی بیٹی مانگیں گی۔ اور وہ فوراً رضامند ہو جائیں گے۔

وقار احمد کی طرف سے رشتے کی رضامندی سامنے آتے ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس رشتے پہ دل آویز اور دلنشین دونوں ہی بہت خوش تھیں اور بڑھ چڑھ کر ماموں کے ہاں جا رہی تھیں۔ انہیں اصباح پسند بھی بہت تھی۔ خوب صورت پھولی بھالی سی۔۔۔ دلنشین جو ہر وقت ولید سے خار کھائے رہتی تھی۔ اچانک۔۔۔ ولید کے قریب ہو گئی تھی۔

ولید بھی دونوں بہنوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دے رہا تھا۔ آئے دن شاپنگ کے سلسلے میں وہ ولید کے ہمراہ کہیں نہ کہیں نکل جاتیں۔ حیرت انگیز طور پر ولید کی سابقہ ساری سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔ طارق بخیدگی سے نہ صرف شادی کی تیاریوں میں منہمک تھا۔ بلکہ باپ کی روز بروز گرتی صحت بھی اسے پریشان کر رہی تھی۔

انہیں اچھے سے اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔ ان کی غذا اور دوائیوں کا خیال رکھنا۔ اس کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔

دل بی دل میں وہ حور کے لیے بھی پریشان تھا۔ وہ بالکل بچہ کر رہ گئی تھی۔ اب نہ اس میں پہلے کی طرح تیزی تھی۔۔۔ اور نہ ہی کام کاج کرنے کی لگن۔ گھر میں کیا ہو رہا تھا۔ اسے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ وہ جیسے لاطعلی سی ہو گئی تھی۔

وہ حور کو زندگی کی طرف نہیں لاسکتا تھا۔ اسے حور سے شکوہ تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا اس کی لاپرواہی کی بدولت ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی، ولید کس قسم کا شخص ہے۔ پھر اس پہ۔۔۔ اس نے اندھا اعتماد کیوں کیا؟

وہ دن رات ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔ جبکہ گھر میں اس واقعے کی اب کسی کو پرواہی نہیں تھی۔ سب ولید کی شادی میں لگن تھے۔

”ڈیٹ فلکینگ سے پہلے اگر منگنی کا چھوٹا سائنکشن ہو جاتا تو مزہ اور بھی دو بالا ہو جاتا۔ مگر نہ جانے ماما کو اتنی جلدی کیا تھی۔ ماموں جان سے ڈائریکٹ ہی تاریخ لے لی۔“

”منگنی کا سائنکشن میں نے تمہارے بابا کی رائے سے۔۔۔ ختم کیا ہے۔ اور وہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ خواجوا لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔ کون نہیں جانتا۔ اصباح طارق سے منسوب تھی۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ لوگوں کو ڈائریکٹ شادی کے کارڈ ہی دیں گے۔“

دلشاد بیگم نے سمجھایا۔

”ویسے ماما! اولید بہت خوش نظر آ رہا ہے اس رشتے سے۔“ دل آویز نے ماں کو جیسے نئی خوش خبری سنائی ہو۔

دلشاد بیٹی کی طرف دیکھ کر طمانیت سے مسکرائیں اور اس کا گال چھوتے ہوئے محبت سے بولیں۔
”وہی نہیں۔ تم بھی اس شادی سے بہت خوش نظر آ رہی ہو۔ ذرا آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو۔ کیسے گلاب کے پھول کی طرح گل رہا ہے۔“

ماں کی تعریف پر دل آویز جھینب گئی۔
”آہ۔۔۔ میں کبھی اتنی نادان تھی جھوٹی سی عمر میں تمہیں اس گدھے کے پلے باندھ بیٹھی۔۔۔ حقیقت میں شادی کی عمر تو تمہاری اب تھی۔“

شادی کے نام پر دل آویز کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہوئیں۔ اور جھٹ سے رمیض کا سراپا آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

وہ یک دم جھنجھلاہٹ سے بولی۔

”کیوں کرتی ہیں آپ بار بار ان منحوس لمحوں کا ذکر، جنہیں میں سوچنا نہیں چاہتی۔“

”کیسے نہ کروں۔“ دلشاد نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”تم سے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں ہوں گی تو لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوال نہ کریں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں ماما! مجھے لوگوں کے سوالوں کے جواب دینا آتے ہیں۔ دنیا والے کون ہوتے

ہیں میری طرف انگلی اٹھانے والے۔ یہ میری زندگی ہے۔ چاہے میں جیسے بھی گزاروں۔“

وہ گہڑے ہوئے موڈ میں بولی تو دلشاد نے نرمی سے اس کا گال تھپتھپایا۔

”گڈ۔۔۔ میں بھی تمہیں ایسا ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔“

یہ اعتماد اس نے حور سے چرایا تھا۔۔۔ اس کے دل نے خود ہی گواہی دی تھی۔

”وہ بیگم صاحبہ کتنے دن کے لیے گئی ہیں میکے؟“ حور کا خیال آتے ہی دل آویز نے ماں سے پوچھا

تھا۔

”کم آن۔ دل! یہ حور، دور ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ جائے یار ہے۔ تم لوگوں کو اپنی خوشیاں قائم

رکھنی ہیں۔“

”پھر بھی اگر وہ ہوتی تو ضرور جلن محسوس کرتی۔۔۔ کہاں وہ گھر بھر پر چھاتی جا رہی تھی۔ سمجھ رہی

تھی۔ وہی سب سے زیادہ سکھڑ اور خوب صورت ہے۔ چند ہی دن میں محترمہ کی چھٹی کرا دی۔“

وہ دل ہی دل میں مسکرائی تھی۔

”ماما! میں چاہتی ہوں۔ جب بری کی نمائش ہونا تو آپ سب کو یہ بتائیں کہ صرف یہ آپ کی بڑی

بیٹی کی پسند ہے۔“

”کیوں نہیں دل۔۔۔! مجھے تو اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔۔۔ میری بیٹی میں جینے کی

اتنی امنگ جاگ جائے گی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”کم آن ماما! آپ بار بار ایسا نہ کہا کریں۔ کیا میں پہلے مری پڑی تھی۔ بس اتنا ہی فرق ہے نا پہلے ان باتوں پہ توجہ نہیں دیتی تھی۔ اور اب توجہ دینے لگ گئی ہوں۔“

”وہ کون ہے جس نے تمہیں ان باتوں پہ توجہ دینا سکھایا ہے۔“

طارق کو بہن میں تبدیلی اچھی لگی تھی۔۔۔ سو سرا ہے بنانہ رہ سکا۔ لیکن دل آویز کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔ اس کا موڈ بگڑ گیا۔

”نہ جانے تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر مجھ سے یہ سوال کر رہے ہو۔۔۔ مگر اپنی خوش فہمی کو دور کر لینا۔ مجھے تمہاری بیوی سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

یعنی اس نے انکار کر کے اقرار ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی حورالعین سے ہی متاثر ہوئی ہے۔ طارق دل دہی دل میں ہنسا تھا۔ گویا اس نے اپنا بھی مذاق اڑایا ہو۔ ایسی لڑکی جو ایک بیمار ذہن کو صحت یابی کی طرف لے جاسکتی تھی۔ وہ کیونکر اپنی زندگی غلط سمت کی طرف لے کر جائے گی۔

وہ الجھتا تھا تب ہی دلشاد بیگم نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

”آؤ طارق! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ آج ہم نے جیولر کے پاس جانا ہے۔ تم کھانا دانا

کھالو۔ پھر ہم چلتے ہیں۔ دُشی اور دل آویز بھی اپنے لیے بھی کچھ شاپنگ کرنا چاہتی ہیں۔“

”کھانا پھر باہر ہی کھالیں گے۔ کیوں طارق بھائی؟“ دلشاد نے جوش کا اظہار کیا۔ اور طارق کی آمادگی پا کر دل آویز کو آوازیں دینے لگی۔



جیولر کی دکانوں پہ چکا چوند روشنیاں اور قیمتی جیولری نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔ طارق اور دلشاد بیگم دھن کے زیورات پسند کر چکے تھے۔ جبکہ دلشاد اور دل آویز کو کوئی ایک چیز بھی پسند نہیں آرہی تھی۔

تین گھنٹے سے پھر پھر کر دل آویز تھک چکی تھی۔ سو بے زار ہو کر دکان سے باہر نکل آئی اور گاڑی

میں آکر بیٹھ گئی۔ اسے بھوک ستا رہی تھی اور پیاس بھی۔ کیونکہ ان سب نے ہلکا پھلکا فاسٹ فوڈ اور سوپ

وغیرہ لے لیا تھا۔ جبکہ اپنے مزاج کے زیر اثر اس نے جیولر کی دکان پہ کولڈ ڈرنک تک نہیں لی تھی۔ اب

اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ سو چا منرل واٹر کی بوتل ہی خرید لے۔ کم از کم پیاس تو بجھے گی۔ اس

خیال کے تحت وہ گاڑی سے نکلی۔ ابھی دکان دار سے وہ منرل واٹر خرید کر مزی ہی تھی کہ اچانک بیٹھریں

ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ رمیض کو سامنے دیکھ کر وہ گنگ رہ گئی۔

رمیض بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر رمیض نے ہی بولنے میں پہل کی۔

”تم تو بالکل اچھی بھلی دکھائی دے رہی ہو۔ جبکہ تمہارے باپ نے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ تم بیمار ہو۔“

اور وہ تمہارا علاج کروا رہے ہیں۔“

”میرے راستے سے ہٹو۔“ دل آویز نے اس کی ساری بات بڑی برداشت سے نظر انداز کی تھی۔

”اوہ۔ اس کا مطلب ہے۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ویسے کس چیز کا علاج

کر وارہا ہے تمہارا باپ؟“ وہ سامنے ڈٹ کر کھڑا تھا۔
”میں تمہاری کوئی بکواس سننا نہیں چاہتی۔“

وہ دبے دبے لہجے میں غزائی تھی۔۔۔ ارد گرد لوگ رواں دواں تھے۔
”مگر میں اس بکواس کا جواب لوٹانا چاہتا ہوں۔ جو تم نے اور تمہاری ماں نے خاندان بھر میں میرے متعلق پھیلا رکھی ہے۔“

وہ بھی دبے دبے لہجے میں غزایا تھا۔ دونوں اپنی اپنی گاڑی کے درمیان میں کھڑے تھے۔
”کون سی بکواس؟“ دل آویز نے لائق کا اظہار کیا۔
”سب باتیں راہ چلتے نہیں ہوتیں دل آویز بیگم۔“

”تو ٹھیک ہے۔ پھر میرے راستے سے ہٹو۔ جو بات کرنی ہے، میرے گھر آ کر کرنا۔“
”بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کہ تم نے مجھے پہچان لیا۔ اور رہ گیا سوال تمہارے گھر کا۔۔۔ تو تمہارا گھر وہ ہے، جہاں میں رہتا ہوں۔ وہ نہیں جہاں تم رہ رہی ہو۔“
وہ غصے سے بولا تو دل آویز کو بھی غصہ آ گیا۔

”یاد کرو۔ تم نے ہی مجھے گھر سے نکالا تھا۔ یہ کہہ کر میں ڈھنی مریضہ ہوں۔ اب کیوں اس ڈھنی مریضہ کی ضرورت پڑ گئی تمہیں۔ رچا لیتے دوسرا بیابا۔ بہت زعم تھا تمہاری بہن کو کہ وہ تمہارا دوسرا بیابا کرے گی۔“

وہ جیسے اپنی جان چھڑا رہی تھی۔

مریض اس کی بات پہ ہنس پڑا۔

”دوسری شادی کرنا میرے لیے کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ ظاہر ہے، مجھے اپنا گھر بسانا ہے تو یہ کام تو کرنا پڑے گا۔۔۔ لیکن۔۔۔ اس سے پہلے تم میرے بچے کی ماں بنو گی۔ تب ہی میں دوسرا بیابا رچاؤں گا۔“

یہ کہہ کر مریض نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسے اندر دھکیل دیا۔ پھر فرنٹ سیٹ سنبھال لی۔

”شور مچا کر لوگوں کو تماشا دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ عرصہ سے نکاح نامہ ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔ میاں، بیوی میں سو جھگڑے ہوتے ہیں۔ یوں میکے میں جا کر بیٹھ جانے والی لڑکیاں عزت دار نہیں ہوتیں۔ لوگ اکٹھے ہوں گے تو انہیں یہی بتانا پڑے گا کہ تمہاری ماں تمہیں بسانا نہیں چاہتی۔ اس لیے زبردستی سر راہ پکڑ کر لے جانا پڑ رہا ہے تمہیں۔“

دل آویز کے لیے یہ عمل، یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ وہ شور کیا چلاتی۔ اس کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔
پانی کی بوتل ہاتھ سے چھٹی اور وہ ہوش سے بے گانہ ہو گئی۔



گاڑی رش سے نکالنے کے بعد مریض نے طارق کو فون ملایا تھا۔ وہ لوگ جیولر کا حساب کر کے ابھی دکان سے نکل ہی رہے تھے کہ مریض کا نمبر دیکھ کر طارق گنگ رہ گیا۔ جب سے ابراہیم صاحب اور

دلشاد بیگم نے اسے برا بھلا کہا تھا۔ تب سے اس نے رمیض سے تعلق ختم کر لیا تھا۔ لیکن آج رمیض کی کال اس کے لیے حیرانی کا باعث تھی۔ اچانک رمیض کو اس کی یاد کیسے آگئی۔

وہ دلشاد بیگم اور دلنشین کو گاڑی کی طرف جانے کا اشارہ کر کے سائیڈ پہ ہو گیا۔ اور فون اٹینڈ کیا۔

”ایسی بھی کیا مصروفیت طارق صاحب۔۔۔!“

”کیسے فون کیا؟“ طارق کا لہجہ روکھا تھا۔

”صرف یہ بتانے کے لیے کہ میں اپنی بیوی دل آویز بیگم کو اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں۔“

طارق کو یک دم شاک لگا تھا۔ ادھر دلنشین اور دلشاد بیگم دائیں بائیں متفکر اور ہراساں سی دل آویز کو دیکھ رہی تھیں۔ جو دور دور تک کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

”کیا۔۔۔ تم دل آویز کو۔۔۔ مانی گاڑی اس طرح اسے لے کر نہیں جاسکتے۔“ طارق کو اس کی حرکت یہ سخت غصہ آیا تھا۔

”کیوں نہیں لے کر جاسکتا؟“ وہ بھی کند ذہن، اڑیل شخص تھا۔۔۔ طارق کو اپنے رویے میں نرمی کرنا پڑی۔

”دیکھیں۔ ہمارے جو بھی معاملات ہیں۔ وہ بات چیت سے حل ہوں گے۔ پھر ہی تو آپ دل آویز کو لے جاسکیں گے۔“

”پہلی بات تو یہ کہ میرا تم لوگوں سے کوئی معاملہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں اپنی بیوی کو لے کر جا رہا ہوں۔ اس کے لیے مجھے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف بتانا تھا۔ کہیں تم لوگ پریشان نہ ہو جاؤ۔“

یہ کہہ کر رمیض نے فون بند کر دیا۔

طارق کا دماغ چکر اگیا۔

”طارق بھائی۔ دل آپی!“

دلنشین گھبرائی ہوئی طارق کی طرف بڑھی تھی۔ طارق نے دیکھا۔ دلشاد بیگم کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں اس نے خود کو سنبھالا۔ اور انہیں گاڑی کے قریب لے آیا۔ وہ پہلے ہی ذہنی اذیت کا شکار تھا۔ اس پر متزاد یہ واقعہ۔۔۔

”آپ لوگ گھر چلیں، میں بتاتا ہوں۔“

”مگر دل آویز کہاں گئی ہے؟“ دلشاد فکر مند ہونے لگیں۔ طارق کی سمجھ میں نہ آیا کہ ماں کو کیسے مطمئن کرے۔ اسے جھوٹ بولنا پڑا۔

”دل آویز گھر چلی گئی ہے۔ گھر سے ابھی ابھی فون آیا تھا اس کا۔ اس کی طبیعت صحیح نہیں تھی۔ شاید ٹیکسی وغیرہ میں چلی گئی ہو۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں، چل رہے ہیں نا گھر۔“

وہ راستہ بھر ماں کو مطمئن کرتا آیا تھا۔



”تم نے یہ بات مجھے وہیں کیوں نہیں بتائی۔“ دلشاد بیگم غصے و اشتعال میں طارق کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”میں آپ کو وہاں بتا بھی دیتا تو آپ کیا کر لیتیں؟“

”منہ توڑ دیتی اس کا۔ اس کینے کی مجال کیسے ہوئی یہ حرکت کرنے کی۔ وہ ہرگز میری بیٹی کے قابل نہیں ہے۔“

ماں کا اشتعال دیکھ کر طارق نے بے چارگی سے گہرا سانس کھینچا۔ ولنشین اطمینان سے صوفے پہ ایستادہ تھی۔

”اب اس ہنگامے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، جو ہونا تھا سو ہو چکا ہے۔ اب یہ سوچیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔“

دلشی کی بات سے طارق کو قدرے اطمینان ہوا۔ جبکہ دلشاد پھر کر بیٹی کے قریب آ بیٹھیں۔

”تم ابھی نا سمجھ ہو دلشی! تمہیں ان معاملات کا نہیں پتا۔ خواجہ اس معاملے میں نہ ہی بولو تو بہتر ہوگا۔“

”فارگا ڈسک ماما! دل آویزا اپنے گھر جا چکی ہے۔ وہ بھی اپنے شوہر کے ہمراہ۔ ہم یا آپ اب کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

”کیوں نہیں کر سکتے؟“ دلشاد کو بیٹی کی بات سخت بے حمیت لگی۔ ”تم مجھے ابھی فون ملا کر دو۔ ابھی بات کرتی ہوں اس سے۔“

”اس نے فون بند کیا ہوا ہے۔ کئی بار آپ کے سامنے ملا چکا ہوں۔“ طارق نے بے بسی ظاہر کی تو دلشاد تڑپ اٹھیں۔

”یا اللہ! میری بچی۔ نہ جانے کس حال میں ہوگی۔“

طارق کو ماں کا دواویلا عجیب لگ رہا تھا۔

دلشاد کھڑی ہو گئیں۔ ”مجھے اس کے گھر لے کر چلو، میں اسے ابھی لے کر آؤں گی۔“

طارق اچھٹے سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت ابراہیم صاحب کی کرخت آواز ابھری۔

”کوئی کہیں نہیں جائے گا۔ خواجہ اس معاملے کو تماشا بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ دلشاد نے بے بسی سے شوہر کی طرف دیکھا۔ ”حالانکہ سب کچھ جانتے بھی ہیں آپ۔“ دلشاد کا دبا دبا لہجہ کچھ جتا رہا تھا۔

”سب کچھ جانتا ہوں۔ تب ہی۔۔۔ اس ہنگامہ آرائی سے روک رہا ہوں۔۔۔ اور ہاں اسے فون کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ رمیض میں کتنی قوت برداشت ہے۔ ابھی تھوڑی دیر تک وہ خود ہی فون ملائے گا۔ یا ہو سکتا ہے دل آویز کو خود ہی پھینکنے آجائے۔“

ابراہیم صاحب کا لہجہ خشک اور سپاٹ تھا۔ سب لوگ گنگ رہ گئے۔

اور پھر اس کشمکش میں چار دن گزر گئے۔ رمیض نے فون ملایا۔ اور نہ ہی اس نے دل آویز کو بلا دیا۔ دلشاد دن رات پریشانی میں مبتلا تھیں۔

”دقار بھائی کا فون آیا تھا، وہ تاریخ رکھنا چاہ رہے تھے۔۔۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ اس جمعہ کو ہم فنکشن نہیں کر سکتے۔“ دلشاد بیگم نے ابراہیم صاحب کو بتایا۔
 ”اس جمعہ ہم فنکشن کیوں نہیں کر سکتے؟“ انہوں نے تعجب سے دلشاد کی طرف دیکھا۔
 ”کمال کرتے ہیں آپ!“ دلشاد بھٹکتا اٹھیں۔

”میری بیٹی گھر پر نہیں ہے اور میں تاریخ لینے چل پڑوں گی۔“
 ”یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، ہمیں اس شادی میں رمیض کو بھی انوائٹ کرنا پڑے گا۔“
 دلشاد چھل پڑیں۔ ”کیا وہ یہاں آئے گا، کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ ابھی کل ہی طارق کی شادی میں، میں نے سب کو بتایا تھا کہ دل آویزان میرڈ ہے۔ لوگ اسے دیکھ کر کیا کیا نہ سوال کریں گے مجھ سے۔“
 ”اوہ! تو یہ پراہلم ہے تمہیں۔ آپ سے کس نے کہا تھا کہ آپ دل آویز کو ان میرڈ ظاہر کریں اور ایسا کرنے سے آپ کا مقصد کیا تھا؟“

دلشاد کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دل ہی دل میں تلملا کر رہ گئیں۔ ابراہیم صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
 ”ابھی وقار کو فون ملائیں۔ میں ایک دن تو کیا ایک گھنٹہ بھی ولید کی شادی لیٹ نہیں کرنا چاہتا۔“



گھر برقی قہقہوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ لان میں فنکشن کا اہتمام تھا۔ جو بہت خوب صورتی سے کیا گیا تھا۔ ہر ایک چیز مکمل تھی۔ کمی تھی تو صرف دل آویز کی۔ وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ یادامی رنگ کی قیمتی ساڑھی میں دلشاد بولائی بولائی پھر رہی تھیں۔ کئی بار دل آویز کو فون کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کا فون مسلسل آف ہی تھا۔ دلشاد کی نگاہیں دروازے سے لگی تھیں کہ اچانک ان کی نگاہیں پلٹنا بھول گئیں۔ بلیوکلر کی شیفون ستاروں سے مزین ساڑھی میں سر کی مانگ سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک آراستہ حورالعین مسکراتے ہوئے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی ازلی اعتماد اور خوشی تھی۔ جو اس کی شخصیت کا خاصا ہوا کرتی تھی۔ وہ مہمان خواتین سے اس طرح مل رہی تھی جیسے وہی سب سے بڑی میزبان ہے۔

”بھئی۔ بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی تمہاری۔ میں ابھی مسز ابراہیم سے پوچھنے ہی والی تھی کہ دہن نظر نہیں آرہی۔“ دلشاد کی کولیگز حورالعین میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ دلشاد کو سخت کڑھن ہونے لگی۔
 دلنشین کے سرال والے بھی آگئے تھے ان کی خواہش تھی کہ اس تقریب میں چھوٹی سی رسم وہ لوگ بھی کر لیں۔ اسی مقصد کے تحت وہ پھولوں کا زبور اور کالج کی چوڑیاں لے کر آئے تھے۔ دلشاد فی الحال انہیں نالنا چاہتی تھیں۔ لیکن انہوں نے دلنشین کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ دلنشین کی ہم عمر کزنز ذومعنی جملوں سے اسے چھیڑ رہی تھیں۔ جنہیں دلنشین ہنس ہنس کر انجوائے کر رہی تھی۔

طارق کی نگاہ حورالعین پہ پڑی تو اسے ہوش اڑتے محسوس ہوئے۔ وہ پوری محفل پہ چھائی ہوئی تھی اور مہمانوں کو کولڈ ڈرنک پیش کر رہی تھی۔ طارق کو امید نہیں تھی کہ وہ اس کی ایک فون کال پہ اس فنکشن

میں شریک ہو جائے گی اور وہ بھی اس سچ دھج سے۔ اسے قدرے اطمینان ہوا تھا۔
 ”ابھی میری بیٹی آئی نہیں اور تم نے مہمانوں کی توضیح شروع کر دی۔“ دلشاد ملازم پہ بھٹائیں تو وہ
 شرمندہ سا ہو گیا۔

”چھوٹی بیگم صاحبہ نے کہا تھا۔“ وہ کہہ کر سائیڈ سے کھسک لیا۔ دلشاد کی نگاہیں حور العین پہ جا
 نکلیں۔ جو خواتین سے تعریفیں وصول کرتے کرتے خوشی سے پھولے نہ مار رہی تھی۔
 ”کیا بات ہے دلشاد! بہت پریشان نظر آرہی ہو، کب سے بچیاں بے چین ہو رہی ہیں کہ تم تھوڑا
 سا وقت دو تو ہم دلنشین کوچڑیاں پہنادیں۔“

”نہیں آیا! اس رسم کے لیے آج کا دن مناسب نہیں ہے۔“

”ہم دلنشین کی رسم اکیلے میں کریں گے۔“

”آپ لوگ بے شک کل ہی آکر رسم کر لیجیے گا۔ مگر آج نہیں۔ ابھی تک تو میری دل آویز بھی نہیں
 آئی۔“

دلشاد نے ایک بار پھر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا مطلب کہاں گئی ہے دل آویز؟“ دلشاد کے چہرے پہ پریشانی دکھ کر نسیم کو تشویش ہوئی تھی۔
 ”رمیض اسے زبردستی شاپنگ سینٹر سے لے گیا تھا۔ پورے چھ دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے۔
 رات طارق اور ولید خود گئے تھے اس کے گھر شادی کا سند یہ دینے۔“

”تم نے اسے بلوایا کیوں نہیں، بھلا بہنیں بھائیوں کی شادیوں میں وقت کے وقت مہمانوں کی
 طرح آیا کرتی ہیں۔“

”یہ سوچ بھی ہماری بھی۔ مگر اس ذلیل انسان نے نہ جانے کیا سوچ رکھا ہے۔ تین سال سے تو
 اسے ہوش نہیں تھا اور اب اچانک اسے ہوش آ گیا۔ عین خوشی کے موقع پہ نحوست ڈال دی۔ طارق سے
 لمبے چوڑے حساب لے کر بیٹھ گیا۔ شکوے تو سنو۔ ہم نے جو انکی راجہ کو طارق کی شادی پہ جھوٹے منہ بھی
 نہیں پوچھا۔“ دلشاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”بھلا بیٹی تو دہلیز پہ بیٹھی تھی اور ہم جاتے اس کی ہتھ جوڑیاں کرنے۔“ نسیم کو بھی افسوس ہونے
 لگا۔

”کیا اس نے کہا تھا کہ وہ دل آویز کو لے کر آجائے گا؟“

”کہا تو اس نے یہی تھا لیکن جانے کا وقت ہو رہا ہے۔ وقار بھائی کے فون پہ فون آرہے ہیں۔ کیا
 آدھی رات کو پہنچیں گے ہم وہاں۔“

تب ہی براہیم لان میں داخل ہوئے اور دلشاد کو اشارہ کیا کہ مہمان خواتین کو چلنے کا کہیں۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو، میں دل آویز کو چھوڑ کر کس طرح جاسکتی ہوں۔“

”دل آویز آگئی ہے۔ وہ گاڑی میں بیٹھی ہے، وقت کافی ہو گیا ہے تم دل آویز سے گاڑی میں ہی
 مل لینا۔“

دل آویز کے آنے کا سن کر دلشاد باہر کی طرف دوڑی تھیں۔

”نہ جانے میری بچی کس حال میں ہے جو گاڑی سے ہی نہیں اتری۔ کہیں دوسری جگہ جا کر تماشا ہی نہ بن جائے۔“ مہمان خواتین کو اٹھنے کا کہے بنا وہ عجلت میں باہر نکلی تھیں۔

حورالعین نے یہ ساری صورت حال دیکھی تو خود ہی مہمانوں کو چلنے کا کہا۔ ایک بیک کرسیاں خالی ہو گئیں، سب لوگ نکل گئے، وہ ملازموں کو کرسیاں سمیٹنے کی ہدایت کرتے ہوئے چادر سنبھالنے لگی۔

”ہمارے آنے تک یہ سب کچھ صاف کر دینا اور کمروں میں لاک تو لگے ہوئے ہیں نا۔۔۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند کر کے سونا۔“

”آپ فکر نہ کریں بیگم صاحبہ۔۔۔ ولید صاحب بھی گھر پر ہی ہیں، وہ ہمیں کہاں سونے دیں گے۔“

ولید کا نام سن کر حور کی رگ رگ میں بھونچال آ گیا۔ ”کہاں ہے وہ؟“ حور کا لہجہ عجیب سا تھا۔

”شاید اپنے کمرے میں ہوں۔“ حور چادر اوڑھ کر خود اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔

اپنے کمرے کے دروازے پر حور کو ایسا تادہ دیکھ کر ولید دنگ رہ گیا پھر تیزی سے سنبھلا۔

”بھابھی آپ۔۔۔!“ حور کے اندر نفرت کا طوفان ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

”جن رشتوں کی عزت نہیں کرنا جانتے۔ انہیں زبان سے دہراتے کیوں ہو؟“ وہ غصے سے پھنکاری تھی۔ ولید کا سر جھک گیا۔

”جو کچھ بھی ہوا، بہت برا ہوا۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“

”صرف تمہارے شرمندہ ہو جانے سے میری زندگی کی تکلیفیں کم ہو جائیں گی؟“ وہ طیش میں آ کر چلائی تھی۔

ولید کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔

”تم جانتے ہو۔ تمہارے اس فیصلے نے مجھے ہسپتال میں لاپھٹکا ہے۔“ وہ اس کے روبرو کھڑی تھی۔

”میں نے یہ فیصلہ آپ کی بھلائی کے لیے ہی کیا ہے۔“ اس کی آواز زندہ رہی تھی۔

حورالعین کے آگ لگ گئی۔ ”میری بھلائی! میری بھلائی کرو گے تم۔ جو شخص اپنا بھلا نہیں سوچ سکتا۔ وہ کسی کا بھلا کیا سوچے گا۔“

”بھابھی! آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔“

”مت کہو مجھے بھابھی، اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی تم مجھے جھٹلارہے ہو۔ یہ کہو کہ ہمارا مشترکہ وارکاری ثابت ہوا ہے۔“

”الزام ہے یہ مجھ پر۔“ وہ چلا یا تو حور کے تن بدن آگ لگ گئی۔

”آواز کو نیچا رکھو۔ اتنا بڑا دھوکا دیا تم نے مجھے۔“ اس نے ولید کو بے اختیار تھپڑ مار دیا۔

وہ سر جھکائے بنائپس و پیش کیے خاموش کھڑا رہا۔

”میں تمہیں قیامت تک معاف نہیں کروں گی ولید! کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آخر کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا۔“

وہ روتے ہوئے اس کے کمرے سے نکلی تو سامنے ہی طارق سے ٹکراؤ ہو گیا۔ طارق کی پیشانی پہ
تفکر اور پریشانی کی لکیریں تھیں۔ وہ طارق کو دیکھ کر ٹھکی ضرور مگر رک کی نہیں۔ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکلتی چلی
گئی۔ جہاں طارق کی ہی واحد گاڑی اس کی منتظر تھی۔ وہ گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔

نہ جانے وہ ابھی اور کتنا رونی۔۔۔ کہ طارق نے ٹٹو اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔
”اگر یہی ماتم کرنا تھا تو آنے کی کیا ضرورت تھی“ وہ اسٹیئرنگ سنھال کر بولا۔

وہ ٹٹو سے آنکھیں اور ناک پونچھنے لگی، طارق نے شیشے کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

”اس طرح مار پٹائی کرنے سے تمہارا موقف صحیح ثابت ہو جائے گا؟“ وہ دانت پہ دانت جمائے

گاڑی چلا رہا تھا۔

حورالعین کے چہرہ صاف کرتے ہاتھ رک گئے گویا اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس نے ولید کے تھپڑ مارا
ہے۔ وہ کچھ نہیں بولی اور چپ چاپ اپنا میک اپ درست کرنے لگی۔ ولید پہ ہاتھ اٹھانے پر اسے کوئی
شرمندگی نہیں تھی۔ بلکہ دل کو سکون ہی ہوا تھا۔

”آج تم نے جو حرکت کی ہے نا۔۔۔ نہایت ہی نازیبا تھی۔۔۔ اگر جواب میں وہ بھی تم پر ہاتھ
اٹھا لیتا تو کیا عزت رہ جاتی تمہاری اور پھر میں کیا کھڑے ہو کر تماشا دیکھتا۔۔۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا
وہاں۔۔۔“ وہ سخت غصے میں تھا۔

”کیوں کی تم نے یہ حرکت؟“ اب اس کی برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ حور پر غزب رہا تھا۔
اس کی جواب طلبی پہ حور بھٹا اٹھی۔

”ہاں، وہ مجھ پہ ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ اگر وہ سچا ہوتا۔۔۔ وہ تو مجھ سے نظریں بھی نہیں ملا پایا اور آپ
طارق! آپ تماشا ہی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کسی کے لیے آواز اٹھائیں، آپ میں حوصلہ ہی نہیں ہے۔ اور
آخری بات اب مجھے آپ کے فیور کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں خود اپنا معاملہ کلیئر کروں گی۔ آپ
صرف یہ سوچیں کہ دل آویز کو اچانک رمیض کیوں لے گیا تھا اور اب وہ آئی ہے تو گاڑی سے اتر کر اندر
گھر میں کیوں نہیں آئی۔“

اپنے اس قدر حساس موضوع سے ہٹ کر اچانک حورالعین نے دل آویز کی بات شروع کر دی اور
اسے کیا پتا۔ دل آویز کب گئی ہے اور کیسے آئی ہے۔ ایک لمحے کے لیے طارق کا دماغ چکر اکر رہ گیا۔



”آپ یقین نہیں کریں گی ماما! یہ سب طارق کی سازش ہے۔ میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتی ہوں
طارق نے ہی اسے ٹائم دیا تھا کہ فلاں وقت ہم لوگ وہاں پہنچیں گے اور وہ وہاں پہنچ گیا۔“

”تم خواجواہ طارق سے بدگمان ہو رہی ہو دل! طارق بھلا ایسا کیوں کرنے لگا۔ شاپنگ کا
پروگرام تو ہمارا اپنا تھا۔ طارق کا تو ادھر دھیان بھی نہیں تھا۔ تم رو کر خود کو ہلکان مت کرو۔ دیکھو، اب
تک تو سب لوگ وہاں پہنچ بھی گئے ہوں گے۔ تم خود کو نارل کرنے کی کوشش کرو۔“

”میں ایب نارل نہیں ہوں ماما!“ وہ تقریباً چلا پڑی تھی۔ ”وہ بھی ہر وقت مجھے یہی کہتا ہے۔ کون

سی بات ہے مجھ میں ایب نارمل لوگوں والی، بتائیں مجھے۔“ وہ ماں سے الجھ پڑی تھی۔
 دلشاد کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ”ایب نارمل تم نہیں وہ ہے۔ اس طرح زبردستی کرنے سے
 گھر نہیں بستے۔ مگر وہ جاہل گنوار یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔“
 ”آخر میرے ساتھ ہی کیوں ماما! میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟ سب ہی لڑکیوں کی
 شادیاں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں ہنسی ہنسی ہیں، میں کیوں خوش نہیں ہوں ماما! کیوں مجھے اس شخص
 کی موجودگی میں ٹھن ہوتی ہے۔ میرا سانس رکنے لگتا ہے ماما۔ میں مر جاؤں گی۔“
 وہ سرخ سرخ کر بے بسی سے رو رہی تھی۔ دلشاد کا دل کٹنے لگا۔
 ”تم فکر نہیں کرو۔ میں اب تمہیں بالکل وہاں نہیں بھیجوں گی۔“ دلشاد بیٹی کو جھوٹے دلا سے دے
 رہی تھیں۔ یہاں تک کہ وقار کا گھر آ گیا۔



”جہیز بہت دیا ہے آپ کے سمدھیانے والوں نے۔ پورا دن نکل گیا مگر جہیز کے آنے کا سلسلہ ختم
 نہیں ہوا۔ میں تو سمجھا تھا۔ سب سے زیادہ اور عالی شان جہیز میرے گھر میں آیا تھا لیکن مجھے اندازہ ہوا،
 آپ کے ہاں تو یہ عام رواج ہے۔ ویسے میں نے طارق کا جہیز نہیں دیکھا۔ وہ بھی کم و بیش اس طرح ہی
 آیا ہوگا۔“
 رمیض ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنی جلی کٹی اور طنزیہ باتوں سے اپنے سرور سالوں کا دل خوش کر رہا
 تھا۔ دلشاد نے کاٹ دارنگا ہوں سے داماد کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے شوہر اور بیٹوں کی طرف جو اس کی
 بکواس خاموشی سے سن رہے تھے۔
 ”جب تم آئی گئے تھے تو دل آویز کو بھی ساتھ ہی لے آتے۔ اس روز بھی تم دل آویز کو اپنے ساتھ
 لائے اور ساتھ ہی لے کر چلے گئے۔“

ابراہیم صاحب نے بچے تلے انداز میں داماد سے شکوہ کیا تو وہ ڈھٹائی سے ہنس پڑا۔
 ”میں تو ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس لیے آگیا دل آویز کا ارادہ ہوتا تو وہ ضرور یہاں آنے کا کہتی۔
 مگر اس نے تو مجھ سے ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔“
 اس کے جھوٹ اور مکاری پہ دلشاد بیگم سے چپ نہ رہا گیا۔ ”کبھی ایسا ہوا ہے کہ شادی بیاہ کے موقع
 پہ بہنیں اس طرح الگ تھلگ بیٹھی رہیں۔ اور دل آویز تو پھر اس گھر کی بڑی بیٹی ہے۔“
 ”یہ تو اب آپ کی بیٹی ہی بتا سکتی ہیں۔ میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ اس کے مسلسل
 جھوٹ پہ دلشاد بری طرح تپ گئیں۔

”کس طرح پوچھیں ہم اس سے۔ موبائل تک تو چھین لیا ہے تم نے اس سے۔“
 ”ہاں میں نہیں چاہتا، میرے گھر یلو معاملات میں کوئی بلاوجہ مداخلت کرے۔۔۔“
 ”ان ہتھکنڈوں سے تم دل آویز کا دل نہیں جیت سکتے۔“ وہ داماد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
 کہہ رہی تھیں۔

”یہ تو آپ کی بیٹی پہ منحصر ہے۔“ رمیض لا پرواہی سے مسکرا کر بولا تو ابراہیم صاحب نے پہلو بدلا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ موضوع مزید طول پکڑے، اس لیے اپنے بیٹوں سے مخاطب ہو کر بولے۔
 ”طارق! ولید کے کمرے کی سیٹنگ ڈھنگ سے کر دینا۔ سامان بہت زیادہ ہے کہیں ایک ہی جگہ بھرتی کر کے بیدروم کو اسٹور نہ بنا دینا۔“

طارق باپ کی بات پہ ہنس پڑا۔
 ”آپ فکر نہ کریں۔ ماما نے ولید کے لیے دو کمرے سیٹ کرائے ہیں اور اسٹور تو ہے ہی علیحدہ۔ ماماں نے اتنی چاہت سے جہیز دیا ہے تو کیا ہم ناقدری کریں گے؟“

طارق کی چچھتی نگاہیں بے ساختہ رمیض کی طرف اٹھی تھیں۔ جس نے ایک کمرے میں سارا سامان ٹھونس کر دل آویز کے جہیز کی ناقدری کی تھی۔ رمیض پہلو بدل کر رہ گیا۔ اچانک اس کی نگاہ درالعین پر پڑی جو بھری ہوئی ٹرائی لے کر آرہی تھی۔
 ”اور طارق کو کتنے کمرے دے رکھے ہیں آپ نے؟“

”یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے جس طرح آپ اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے، اسی طرح میں بھی اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔“
 حور نے باری باری چائے سب کی طرف بڑھائی تو رمیض حور کو تو صافی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے

۱۱۱

”طارق صاحب! شریک سفر سمجھ دار ہو تو مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو بھابھی جیسی شریک سفر ملی۔“ اس کی تعریف پہ دلشاد بیگم کو شدید ہچکا لگا تھا۔
 ”آخر یہ مراد ایسا ہی کیوں سوچتے ہیں کہ خواتین کو زیادہ سمجھ دار اور ذمے دار ہونا چاہیے۔ کسی مشکل پہ یہ فرض خود کیوں نہیں بنا لیتے۔“

حور نے شائستگی سے مداخلت کی تو رمیض لا جواب سا ہو گیا۔ طارق کو بھی دل ہی دل میں شرمندگی ملی تھی۔

”اس کی وجہ میں بتاتی ہوں۔ بہت سے لوگ سطحی سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔ ان میں قوت داشت بھی کم ہوتی ہے۔ وہ تعاون ہی نہیں کرنا چاہتے انہیں صرف خوشیاں اور سکون لینا آتا ہے دینا نہیں۔ اسی وجہ سے ہزاروں مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر ایک ساتھی شخصی لحاظ سے کمزور ہے تو اس کا اعتماد اور حوصلہ بن سکتا ہے۔ مگر اتنی قربانی دینے کا حوصلہ کم از کم مردوں میں نہیں ہوتا۔ عورت میں ذرا سی کمی یا خامی ہو تو وہ اسے پاتال میں اتار دیتے ہیں۔ سہارا تو دینا درکنار۔“

وہ طارق کو جتنا ہی بھی یار رمیض کو؟ ابراہیم صاحب نے بچے تلے انداز میں بولتی حور العین کو بغور دیکھا تھا۔ دلشاد بیگم کو برا لگ رہا تھا۔ وہ کیوں خواجواہ ان کے نجی معاملات میں دخل دے رہی تھی۔

”طارق! سارا وقت یہیں بیٹھ کر گزار دو گے۔ تو ولید کا فرنچیز کب سیٹ کراؤ گے اور پھر بارات لیے کنوینس کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ کیا یہ سارے کام ایک ہی دن میں ہوں گے؟“

”آئی جی نے تو موضوع ہی بدل دیا۔ ورنہ بات چیت کرنے میں تو اب مزا آیا تھا۔ خیر چلتا

ہوں، آپ لوگوں نے اپنے کام سمیٹنے ہیں، زندگی رہی تو پھر ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گیا تو دلشاد نے ایک کڑوا سا ہنکارا بھرا۔

”احساس کمتری کا مارا شخص۔ اپنے عیب چھپانے کے چکر میں ہمارے گھر کی ٹوہ لینے آ رہا ہے اور کان کھول کر سن لو طارق! آئندہ اس جانور کو اتنی عزت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک یہ دل آویز سے رو بہ دور ست نہیں کرے گا۔ یہ میرے گھر میں آ کر اس طرح نہیں بیٹھے گا۔“ انہوں نے جھپتی نگاہ حور یہ بھی ڈالی تھی۔ ان تنبیہی نگاہوں کو طارق نے بخوبی سمجھ لیا تھا جبکہ حور مزے سے بیٹھی چائے کی چسکیاں بھر رہی تھی۔



”شادی میں صرف چند ہی دن باقی ہیں۔ تم نے اپنی جو تیاری کرنی ہے۔ ابھی کر لیا پھر مجھے بتا دو کہ تمہیں کیا کچھ چاہیے۔ میں لا دوں گا۔“ طارق نے بستر میں لیٹے لیٹے نگاہ غلط حور پہ ڈال کر پوچھا تھا۔ جو اپنی وارڈروب میں اسی معاملے کو سلجھانے کے لیے الجھ رہی تھی۔

”میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے میرے پاس ہر چیز ان سچ پڑی ہے اور شادو کے بعد میں نے پہنا ہی کیا ہے۔ اب سب کچھ شادی میں استعمال ہو جائے گا۔“

دہ وارڈروب سے کپڑے نکال نکال کر ایک جانب رکھ رہی تھی۔

”شادی اور ولیمہ کے روز تم ان میں سے کچھ نہیں پہنوں گی۔ انڈرا سٹینڈ۔ میرے ساتھ بازار چلنا شاپنگ کرنی ہے۔“ اس مہربانی پہ حور العین نے حیرت سے طارق کی طرف دیکھا۔ جو دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

”اس مہربانی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟“ طارق نے جواب نہیں دیا۔ ٹی وی کی طرف ہی متوجہ رہا۔

”تم اس گھر کی بڑی بہو ہو، ہر لحاظ سے تمہیں شان دار نظر آنا چاہیے اور بس۔“

طارق کی رکھائی اور گریز پہ حور کس کر رہ گئی اور جلتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تو گویا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہاری سابقہ منگیتر سے کم تر نظر آؤں۔“

”اوہ شٹ اپ۔۔۔!“ طارق نے غصے سے ریموٹ پھینک مارا۔۔۔ ”وہ کبھی بھی میری منگیترا نہیں تھی۔ انڈرا سٹینڈ۔ صرف ماما چاہتی تھیں اور ان کی چاہت پوری نہیں ہو سکی۔ آج کے بعد تم مجھ۔ ایسی بات نہیں کرو گی۔ کیونکہ وہ میرے بھائی کی عزت بن کر آ رہی ہے۔ جو میرے لیے قابلِ احترام ہو گی۔“ اس کے غصہ اور اشتعال کو حور نے بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔

”وہ تمہارے لیے قابلِ احترام ہے تو کیا میں ولید کے لیے قابلِ احترام نہیں تھی۔“ حور کی آنکھیں نمی سے چمکنے لگی تھیں۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ اپنے کام میں مگن ہو گئی، طارق بھی غصے میں بستر میں پڑ گیا۔



”کم آن دلشی! اب تو کم از کم یونیورسٹی کو خیر باد کہہ دو عین فٹنشن کے روز بھی تم پڑھنے جا رہی ہو،

ہے کتنے کام ہیں کرنے کو۔ دل آویز ہوتی تو کچھ نہ کچھ ہاتھ تو بٹا رہتا۔ نہ مجھے پارلر جانے کا وقت مل رہا ہے اور نہ ہی ٹیئر کے پاس سے میرے کپڑے آئے ہیں اور تم ہو کہ اس ساری افراتفری سے بے نیاز پڑھائی میں جتی ہو، اس سے پہلے تو تم اتنی پڑھا کہ نہیں تھیں۔“

ماں کے شکوے پہ دلنشین کو ہنسی آگئی۔ وہ ماں کو کیا بتاتی کہ زندگی کے حسین دن تو وہ اب گزر رہی ہے۔ پڑھائی وڑھائی تو صرف ایک بہانا ہے۔ وہ تو یونیورسٹی انجوائے کرنے جاتی ہے۔

”آپ تو ماما! خواجواہ ہی پریشان ہو رہی ہیں۔ فکشن تو لیسٹ ٹائٹ ہی ہوگا اور میں تو ابھی دو پریڈ لے کر دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔ آتے ہوئے ٹیئر سے آپ کے کپڑے بھی لیتی آؤں گی۔ آپ کیوں اس ہلدی اور تیل سے اپنی انگلیاں خراب کر رہی ہیں۔ آپ اطمینان سے پارلر جائیں۔ یہ کام تو یہاں کوئی بھی ملازمہ کر دے گی اور کوئی نہیں تو حور تو ہے نا۔“ دلنشین نے چپکتے ہوئے کہا۔ ”ایسے کام تو وہ منٹوں میں نمٹا لیتی ہے۔ آپ بے کار کی ٹینشن بے رہی ہیں۔“ وہ کہہ کر بجلیت میں باہر نکل گئی۔

دلشاد نے شکوہ کناں نگاہوں سے بیٹی کی طرف دیکھا تھا۔ اس میں تو کچھ شک نہیں تھا کہ حور ہی ان کے کام آ رہی تھی۔ دلنشین کو یونیورسٹی سے فرصت نہیں تھی اور دل آویز اپنے گھر جا کر بیٹھ گئی تھی۔۔۔ دل آویز کا خیال آتے ہی ان کا دل پھر سے بچھ گیا۔ اس روز گاڑی میں دل آویز نے کوئی ایک بات ایسی نہیں کہی جو ماں سے چھپائی ہو۔۔۔ دلشاد کو خود حیرت ہو رہی تھی کہ یہ بات کس نے پھیلانی کہ رمیض مارل نہیں ہے۔ یہ پروپیگنڈہ تو اس نے اپنی بیٹی کی جان چھڑانے کے لیے سوچا تھا۔ الٹا ہی پھندہ گلے میں پڑ جائے گا۔ نہ دلشاد کو تو قہقہہ آ رہی تھی اور نہ دل آویز کو۔۔۔

دل آویز نے ماں کو بتایا تھا کہ اس نے اپنی بہن کلثوم کو اسی گھر میں علیحدہ پورشن بنا کر دے دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اب رمیض کے سارے کام کاج اسے خود کرنے پڑ رہے ہیں۔ پہلے کلثوم اور بچوں کے لحاظ کی وجہ سے وہ اس کے گریز سے خاموشی اختیار کر لیتا تھا مگر اب اس کیلئے پن کی وجہ سے وہ کسی بات کا لحاظ نہیں کرتا۔ کلثوم اور اس کے بچوں کا بیرونی راستہ بھی دوسری طرف ہو گیا ہے۔ اب سے وہ گئی ہے، کلثوم اس سے ملنے نہیں آئی۔ البتہ بچے کبھی کبھار کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز لے آتے ہیں۔ جو ان کی ماں اپنے بھائی کے لیے بھیجتی ہے۔ رمیض کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی کبھی بچوں کے لیے کچھ بنا کر بھیجے کیونکہ اسے اپنے بھانجا، بھانجی سے بہت پیار ہے۔ جبکہ بچوں کے حلیے دیکھ کر ہی اسے کراہیت آتی ہے۔ وہ رمیض کے ساتھ بالکل نہیں رہ سکتی۔

یہ بات دل آویز نے کئی بار دہرائی تھی۔ جبکہ دلشاد کو پہلے ہی پتا تھا کہ رمیض جیسا شخص اس کی بیٹی کو ٹائٹ نہیں رکھ سکتا اور یہ بات دلشاد بیگم نے دل آویز کے جانے کے بعد ابراہیم صاحب کو بتائی تھی تو ابراہیم کا حیرت انگیز رویہ سامنے آیا تھا۔ انہوں نے بڑے اطمینان و سکون سے کہا تھا۔

”دلشاد بیگم! اب دل آویز کی پروا کرنا چھوڑ دیجیے کیونکہ جس وقت اسے آپ کی ضرورت تھی۔ آپ نے اس پہ توجہ نہیں دی۔ اب جبکہ جسمانی اور ذہنی صحت کے لحاظ سے وہ کافی بہتر ہے تو آپ اسے اپنے پیروں پہ کھڑا ہی نہیں ہونے دے رہیں۔“

”آپ کی سوچ کی اچانک تبدیلی مجھے حیران ہی نہیں پریشان بھی کر رہی ہے۔ چند ماہ ڈاکٹر

عبداللہ کا علاج کرا کر آپ سمجھ رہے ہیں کہ آپ کی بیٹی تندرست ہو گئی ہے۔ جب تک کوئی نئی مصیبت آپ کے سر پر نہیں آئے گی، تب تک آپ اس معاملے کی گہرائی کو نہیں سمجھیں گے۔“

”میں نے معاملے کی گہرائی کو سمجھا تھا تو بیٹی کو سائیکا ٹرسٹ کے پاس لے گیا تھا اور تب بھی آپ نے واویلا مچایا تھا۔ لیکن بعد میں آپ نے خود ہی تسلیم کر لیا کہ واقعی ہماری بیٹی بیمار تھی۔۔۔ اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ پہلے کی نسبت بہتر ہے۔ آپ کس لیے فکر مند ہو رہی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ رمیض نے اپنی ذمہ داری کو سمجھا اور دل آویز کے ساتھ ہی گھر بسانے کو ترجیح دی۔ ٹھیک ہے۔ دل آویز کو لے جانے کا طریقہ اس کا غلط تھا لیکن ہم اس غلطی اور صحیح کے چکر میں پھنس گئے تو یہ معاملات خراب ہی ہوں گے اور آپ سے بھی گزارش ہے کہ بیٹی کے معاملات میں زیادہ مداخلت نہ کریں۔ آپ کی مداخلت کی وجہ سے وہ کبھی بھی رمیض اور اس کے ماحول کو قبول نہیں کر پائے گی۔“

دلشاد دل ہی دل میں پتچا دلتا کہ خاموش تو ہو گئیں مگر اپنے دل کو باز نہ رکھ سکیں۔
”کل ولید کی بارات ہے۔ کیا دل آویز مہمانوں کی طرح بھائی کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے آئے گی۔ ابن کی رسم میں وہ سرے سے آئی ہی نہیں۔ میں بول بول کر تھک گئی مگر آپ کے کان پر جوں تک نہیں رہے گی۔ کیا وہ اس طرح الگ تھلگ خوشی سے بیٹھی ہوگی۔ نہ جانے اس سمجھت نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہوا ہے۔ کوئی نہیں ایسا جو اس کا حال ہی پوچھ آئے۔“ یہ کہہ کر دلشاد رونے لگیں ابراہیم صاحب کو بھی تشویش نے آن گھیرا۔

طارق جواب تک چپ چاپ بیٹھا تھا بول اٹھا اگر آپ کہیں تو میں چلا جاتا ہوں اس کے گھر لیکر مجھ سے تو بدگمان ہی بہت ہے میری بہن، جب سے گئی ہے۔ اس کی زبان پر یہی بات ہے کہ میری دم سے ہوا ہے یہ سب کچھ۔“ طارق نے شکوہ کیا تو دلشاد نے آنسو پونچھتے ہوئے طارق کی طرف دیکھا۔
”چاہوں تو میں خود بھی چلی جاؤں۔ مگر اس ذلیل شخص نے مجھے بے عزت کیا تھا اپنے گھر پر اب بھی مجھے اس سے کوئی اچھی کی توقع نہیں ہے۔ کل پھر وہ اسے مہمانوں کی طرح لائے گا اور اسے ساتھ لے جائے گا۔ ہائے میری بچی کس مصیبت میں پھنس گئی۔“ دلشاد نے پھر رونا شروع کر دیا۔

”معجز چھوٹا ہے اور ولید جذباتی ہے۔۔۔ آخر کس کو دل آویز کے گھر بھیجوں۔۔۔ کم از کم کوئی ہا خبر لے آئے کہ میری بچی ہے کیسی؟“ پھر یک دم ہی انہیں حور کا خیال آیا۔ کیوں نہ حور کو ہی وہ دل آویز کے گھر بھیجیں۔ رمیض بے عزتی کرے گا تو حور کی ہی ہوگی نا۔

”مگر حور کیوں جائے گی۔ کیا اس سے ہم نے ایسا تعلق رکھا ہوا ہے۔ وہ صاف انکار کر دے گی اگر چلی بھی گئی تو کہیں کچھ گڑبڑ ہی نہ کر دے۔ نہیں طارق کے ہوتے ہوئے وہ کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتی مجھے کیا ضرورت ہے اس کے منہ لگنے کی، طارق سے ہی کہتی ہوں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“
دلشاد کو قدرے اطمینان ہوا تھا۔



”آپ نہیں آرہے اندر؟“ حور نے گاڑی سے اترتے ہوئے مڑ کر طارق کی طرف دیکھا تو طوار

نے نظریں چرائیں اور مصروف انداز میں بولا۔

”مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔ اتنے میں وہ نمٹا لیتا ہوں۔ تم اطمینان سے دل آویز سے مل لینا۔“
پھر اس نے گاڑی سے نکل کر پھلوں کے تھیلے حور العین کو پکڑائے۔

”یہ رمیض کی بہن کو دے دینا۔ اور ہاں، زیادہ بے کاری کا باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور رمیض کے منہ بھی نہیں لگنا۔ وہ بدتمیز اور منہ پھٹ شخص ہے۔ اس روز بھی تم خواجواہ ہی اس سے بحث لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس میں اتنا سنیں ہوتا تو وہ اپنے گھر کو جہنم ہی کیوں بناتا۔“

طارق قدرے پریشان اور جھنجھلایا ہوا تھا۔ حور نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”مانڈاٹ مسٹر طارق! یہ باتیں آپ مجھے سارے راستے سمجھاتے آئے ہیں۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تھا تو مجھے لانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔“ طارق نے لب بھینچ لیے اور غصے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال تھا کہ تم جانے سے انکار کر دو گی اور میں ماما سے صاف کہہ دوں گا لیکن تمہیں تو جیسے۔۔۔“ اس کی بے بسی پر حور کے چہرے پر معنی خیز ہنس بکھر گیا، وہ لطف لیتے ہوئے بولی۔

”مجھے تو رمیض میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔۔۔ اگر وہ دل آویز کی خامیاں گنوائے گا تو میں ضرور سنوں گی۔۔۔ آخر اچھے یا برے کا فرق بھی تو محسوس کرنا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اندر بڑھتی چلی گئی۔ طارق تمللا کر رہ گیا۔ اس کا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ یہ غلط ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح ماں کے حکم کو وہ نال نہیں سکتا تھا۔



گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے متلاشی نظروں سے دیکھتی وہ اندر بڑھتی چلی گئی۔ گھر میں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے تو سنا تھا بے ہنگم بچے ہر وقت یہاں ادھم مچائے رکھتے ہیں۔ مگر یہاں تو چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ ایک کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا اور باہر روشنی آرہی تھی۔ وہ اس دروازے کے سامنے رک گئی۔ ہمت ہی نہ ہوئی کہ سیدھی اندر گھس جائے۔ دل آویز اندر صوفے پہ نیم دراز تھی۔۔۔ اچانک آہٹ اور سایہ سا محسوس کر کے چونک گئی۔

”کون ہے؟“ اس کی کرخت آواز ابھری تو حور کو حوصلہ ہوا۔ اور دروازے پہ دستک دیتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ حور کو دیکھ کر دل آویز گنگ رہ گئی۔

”تم یہاں؟“ بہت دیر کے بعد اس نے خشک ہونٹوں اور اجنبی آنکھوں نے کہا تو حور خفت سے مسکرا دی۔ اپنائیت سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”کیسی ہو دل۔۔۔؟“

دل آویز نے خشک سے انداز میں اسے بیٹھنے کو کہا۔

”مجھے ماما نے بھیجا ہے تمہاری خبر گیری کے لیے۔“ حور اطمینان اور اعتماد سے صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔ پھلوں کے تھیلے اس نے میز پر رکھ دیے۔

”بڑی جلدی خیال آگیا ماما کو میرا۔“
 ”تمہارا شکوہ جائز تو ہے مگر بر محل نہیں ہے۔“ حور اطمینان سے اس کے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے
 بولی تو دل آویز ٹھنک گئی۔

”تمہیں کیسے بھیج دیا ماما نے۔۔۔؟“ دل آویز نے چھتی نگاہیں اس کے چہرے پر ڈالیں، جس کی
 شگفتگی پہلے دن سے اس کے لیے جلن کا سبب تھی۔
 ”ہاں۔ یہ بات عجیب ہے، مجھے خود بھی سمجھ میں نہیں آئی۔“

وہ اس کے کمرے کی ایک ایک چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ اس کمرے میں
 کسی عورت کا وجود ہے۔ ہر چیز دھول مٹی سے اپنی پڑی تھی، حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے جہیز کی کئی
 چیزیں ابھی تک ڈٹوں میں بند ادھر ادھر پڑی تھیں۔ جس کی وجہ سے بیڈروم اسٹور کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔
 رمیض کے میلے کپڑے کھوٹی سے فرش تک لٹک رہے تھے۔ کہیں گندا تولیہ پڑا تھا اور کہیں جرابیں اور
 جوتے۔ خود دل آویز کے کپڑے بھی جگہ جگہ بکھرے نظر آ رہے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر گردانی
 پڑی تھی پردے بے ترتیبی سے لٹک رہے تھے۔ حور کو چند ہی منٹ میں اندازہ ہو گیا کہ یہاں کام کرنے
 والی نہیں آتی ہوگی۔ جب ہی سب کچھ بھرا پڑا ہے تو کیا دل آویز ذرا سی ڈسٹنگ بھی نہیں کر سکتی۔ بہت
 صفائی کا خطبہ تھا اسے تو۔ کس طرح رہ رہی ہے اسی حال میں، خود اس کا اپنا حلیہ بھی بس ٹھیک ہی تھا دل
 آویز خود اپنے اس حلیے پر دل ہی دل میں شرمندہ تھی۔ اس کے بیڈروم کا نقشہ دیکھ کر حور اپنے شاندار بیڈ
 روم پر فخر کر رہی ہوگی۔

ہونہہ! مگر یہ تو قسمت کی بات ہے۔ راجہ کے گھر باندی۔۔۔ اور فقیر کے گھر رانی۔۔۔

”ماما تمہیں نہیں بھیج سکتیں۔ ضرور تمہیں طارق ہی لے کر آیا ہوگا۔ خوب دونوں میاں بیوی نے
 دونوں ہاتھوں میں لڈور کھے ہوئے ہیں۔ طارق کیا سمجھ رہا تھا میں روتی بیٹی واپس آ جاؤں گی۔۔۔ اس
 سے کہنا جس شخص کے ساتھ میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ میرے والدین کی اولاد میں سے ایسے شخص
 کے ساتھ کوئی ایک دن بھی نہیں گزار سکتا۔“
 یہ کہہ کر دل آویز رو پڑی۔

حور اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔۔۔ فی الحال اس کا دل آویز سے ہمدردی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
 ”دیکھ لیا تم نے تماشا میرے گھر کا، یہ پیلی دیواریں اور جا بجا اکھڑا پلستر، یہ کون کمر تھا اس
 لاکھوں کے فرنیچر کے لائق۔ کس قدر ناقدری سے اس نے میرے سامان کو پھینک رکھا ہے۔“

اس کے خیالات یہ حور کو افسوس ہوا۔

”خوش قسمت ہو تم حور! جو تمہیں طارق جیسا ویل میز ڈشوہر اور میرے پیرٹس کا گھر ملا۔ جہاں
 تمہارا معمولی سا سامان بھی عیش بہا، قیمتی لگتا ہے اور پھر ملازموں کی لمبی قطار۔ یہاں، یہاں کیا ہے وہ کیا
 سمجھتا ہے اس کے بدبودار کپڑے میں سمیٹوں گی۔ اس کے جوتے صاف کروں گی۔ اس کے گھر میں
 پونچھا ماروں گی۔ مائی فٹ! میں ان معمولی کاموں کے لیے پیدا نہیں ہوئی تھی۔“ حور خاموشی سے سنتی
 رہی۔ یک دم دل آویز رو پڑی۔

”تمہیں پتا ہے۔ تمہیں پتا ہے حور! اچانک اس میں باپ بننے کی خواہش جاگ گئی ہے۔ وہ انتقام لے رہا ہے مجھ سے۔ وہ میری تکلیف کو نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے، میں مغرور ہوں۔۔۔ جان بوجھ کر اس سے دور بھاگتی ہوں۔۔۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ میں خود تھک چکی ہوں۔ اب اپنی زندگی میں آسانی چاہتی ہوں۔“

حور کو پہلی بار اس کی بے بسی پر ترس آیا۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔ (شاید وہ ایسا نہ کرتا اگر تم اس کی مردانگی کو پہنچ نہ کرتیں۔) ”میں تمہیں لینے کے لیے آئی ہوں دل۔۔۔! کل ولید کی بارات ہے۔ اور تمہیں بارات میں گھر سے شامل ہونا ہے۔۔۔ یہ ہم سب کی خواہش ہے۔“ حور نے نرم اور دھیمے لہجے میں کہا تو دل آویز نے آنسو صاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

دل آویز کو حیرانی تھی کہ اس نے اس کی کس بات میں دلچسپی نہیں لی تھی۔

”یہ اختیار میرے پاس ہوتا تو میں یہاں بیٹھی ہوتی۔“

وہ قدرے چڑچڑے سے انداز میں بولی تو حور ہلکا سا مسکرا دی۔ ”میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتی تھی۔ تم بھی اندر سے وہی بھیگی ملی نکلیں۔ خیر میں آئی ہوں تو تمہیں لے کر ہی جاؤں گی۔ کہاں ہوتی ہے تمہاری نند۔۔۔؟“

”اس کا پورشن دوسرا ہے۔ وہ یہاں آتی ہے نہ میں اس کی طرف جاتی ہوں۔ میں یہاں اکیلی ہوتی ہوں، جہاں چاہوں جا سکتی ہوں۔“ وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

”یہ تو خوشی کی بات ہے دل!“ حور نرمی سے بولی۔

”مگر میں کیوں جاؤں بار بار تماشا بننے کے لیے۔“ وہ چڑچڑے سے انداز میں بولی تو حور بالکل نہیں سمجھی۔

”جس طریقے سے وہ مجھے لے کر آیا اور میرے ماں باپ اور بھائیوں نے اس پر خاموشی اختیار کی، اس سے اس کی ہمت اور بڑھ گئی ہے۔ زندگی حرام کر دی ہے اس نے میری۔۔۔ اتنی غیر اہم تو نہیں تھی میں ماما اور بابا کے لیے کہ وہ ولید کی شادی کی خوشی میں مجھے فراموش ہی کر بیٹھے۔“

”کہاں فراموش کیا ہے انہوں نے تمہیں۔۔۔ رمیض سے بات ہوئی تھی تو اس نے کہہ دیا تھا کہ تم خود آنا نہیں چاہتیں۔“

”اور انہوں نے یقین کر لیا۔ ہاں ایک بات کان کھول کر سن لو حور! میں ایک دفعہ یہاں سے چلی گئی تو زندگی بھر لوٹ کر نہیں آؤں گی اور اس خوش فہمی میں کبھی نہ رہنا کہ باپ کی دہلیز پر بیٹھوں گی۔ پھر میرا کوئی تیسرا ہی ٹھکانا ہوگا۔“

”سن لیے اس کے خیالات آپ نے؟“ رمیض کی غیر متوقع آمد نے دونوں کو چکرا دیا۔ ”اس کے ایسے نادر خیالات جانتے ہوئے بھی میں اسے تنہا گھر میں چھوڑ کر جاتا ہوں۔ دروازے پہ باہر سے تالا لگا کر نہیں جاتا۔“

”وہ ایسا کہہ رہی ہے۔ کر تو نہیں دیا اس نے۔ کرنا چاہتی تو اب تک کر چکی ہوتی، تب تم کیا کر

لیتے؟“

”کیا مطلب؟“ اب کی بار رمیض چکرا رہا تھا۔
”سیدھے اور واضح لفظوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔“ حور کا لہجہ پر اعتماد اور چبھتا ہوا تھا۔
”دن بھر گھر میں اکیلے بیٹھے بیٹھے وہ کیا کرے۔“

”اس اکیلے پن کو اس نے خود پسند کیا تھا اور اپنے گھر میں دل لگانے کے لیے سینکڑوں کام ہوتے ہیں۔ یہ دیکھیں اس گھر کا حلیہ۔ تین کمروں کا یہ چھوٹا سا گھر یہ عورت صاف نہیں رکھ سکتی۔ حتیٰ کہ اپنا بیڈ روم بھی اس نے کس قدر گندا کر رکھا ہوا ہے اور تو یہ میری کیا خدمت کرے گی۔۔۔ کچن میں جا کر دیکھیں۔ کیسا اجاڑ پڑا ہے۔ دونوں وقت کا کھانا میں بازار سے لے کر آتا ہوں یا میری بہن پکا کر بھیجتی ہے، کون سی ذمہ داری ہے میری جو اس نے اٹھا رکھی ہے۔ کیا ایسی ہوتی ہیں بیویاں، کوئی ایک کام سلیقے سے نہیں کر سکتی ہے۔ بیوی کے آنے کے بعد گھر کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ جبکہ اس کے آنے سے میرے گھر کی بد رونق میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔“

”تو پھر کیوں لے کر آئے تھے مجھے؟“ دل آویز دوبدو چلائی تھی۔
”اگر میں تمہارے منہ لگوں تا تو دن رات تماشے ہوں لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں تمہاری ماں نے تمہیں سوائے زبان چلانے کے اور کچھ نہیں سکھایا۔ ہاتھ پاؤں تو تمہارے جیسے گردی رکھے ہوئے ہیں۔“

یہ کہہ کر رمیض صوفے پر بیٹھ گیا۔ دل آویز تنقیدی ہوئی باہر چلی گئی۔۔۔
”لے جائیں آپ اسے، طارق کا فون آیا تھا مجھے اور میں نے تب بھی انکار نہیں کیا تھا۔ مگر جب وہ خود ہی جانا نہیں چاہتی تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ رمیض غصہ ضبط کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
”نہ ہی وہ میرا گھر بسائے گی اور نہ ہی آپ لوگوں سے تعلق رکھے گی۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔
حور نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ ذمہ داری آپ پہ عائد ہوتی تھی۔ مگر آپ نے سمجھنا ہی نہیں چاہا۔۔۔“

”میں نے۔۔۔“ رمیض کو اچھٹا ہوا۔

”ہاں آپ نے۔“ حور کا لہجہ تلخ تھا۔

”رشتے داری کرتے ہوئے آپ نے اونچی فصیلیں تو دیکھیں مگر اپنے قد کو فراموش کر دیا اور آج آپ کو صرف اپنا قد نظر آ رہا ہے۔ وہ اونچی فصیلیں بھول گئے ہیں جہاں سے دل آویز کو بیاہ کر لائے تھے۔“

رمیض حور کی بات کا مطلب پوری گہرائی سے سمجھ گیا تھا۔ تنک کر بولا۔

”ہر لڑکی اپنے گھر میں عیش و آرام کی زندگی گزارتی ہے۔ لیکن شوہر کے گھر میں آ کر اسے سب کچھ

کرنا پڑتا ہے۔“

”یہ سوچ ہمیں چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم رکھتی ہے۔“ حور نے تاسف سے اس کی طرف

دیکھا۔

”ایک دوسرے کا خیال رکھنے سے محبت بڑھتی ہے اگر آپ ایک معمولی ملازمہ کا انتظام کر دیتے جو آپ کے لیے مشکل بھی نہیں تھا تو دل آویز کے دل میں آپ کے لیے جگہ بنتی کہ اس کے شوہر کو اس کا خیال ہے۔ لیکن آپ اپنی سوچ سے کیونکر ہٹ سکتے تھے۔“

”فقط وہی توجی ہیں گھر میں۔“ وہ کمزور آواز میں بولا۔

”کیا دوجی ایک دوسرے کے لیے قربانیاں نہیں دے سکتے۔۔۔ رمیض بھائی! سب سے پہلی چیز ایک دوسرے کے دل میں جگہ بنانا ہے۔ گھر سانا اور نسل بڑھانا یہ بعد کی باتیں ہیں۔ جب آپ اس کے دل میں جگہ ہی نہیں بنا سکے۔۔۔۔“

”بات صرف ایک ملازمہ تک کی ہی نہیں ہے۔“ رمیض دل ہی دل میں سوچ کر رہ گیا۔

”آپ مجھ سے ناواقف بحث کر رہی ہیں۔ جتنی قربانی میں اس کے لیے دے رہا ہوں۔ شاید ہی کوئی مرد دے سکتا ہوں۔“

”کیا قربانی دے رہے ہیں آپ۔۔۔! ماں باپ، بہن بھائی، عیش و عشرت وہ چھوڑ کر آئی ہے آپ کے پاس نہ کہ آپ اس کے پاس گئے ہیں۔“ اس کی خرابی منطق پر رمیض حیران رہ گیا۔

”یقیناً آپ کو میری باتیں عجیب لگ رہی ہوں گی۔ لیکن میں آپ سے اتنا ہی کہوں گی۔ بہت سے لوگ عام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں سمجھ لیا جائے تو ان کے اندر ایک بہت پیارا انسان چھپا ہوتا ہے۔ زندگی کا سکون ذہنی ملاپ میں ہے۔ اور وہ ذہنی ملاپ تب ہی ممکن ہے۔ جب آپ دل آویز کو، اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسے محبت اور توجہ دیں۔ آپ اپنا رویہ تبدیل کریں، دل آویز میں خود بخود تبدیلی آجائے گی۔ دل آویز بری نہیں ہے آپ خود جان لیں گے۔“

دل آویز دروازے کے باہر کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ حور اس کے متعلق ایسی سوچ رکھتی ہے۔

”میں آپ کی رضامندی سے دل آویز کو لے کر جا رہی ہوں۔ مجھے امید ہے، کچھ دن آپ اسے شادی انجوائے کرنے کا موقع فراہم کریں گے۔“ تب ہی دل آویز کمرے میں داخل ہوئی۔

”دل! سامان لے لو۔ ہم چل رہے ہیں۔“ دل آویز نے رمیض کی طرف دیکھا وہ چپ چاپ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب کسی بھی قسم کی ناراضی نہیں تھی۔

دل آویز کو پہلی بار حور سے اپنائیت کا احساس ہوا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے وہ حور سے کہنے لگی۔

”میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم میرے شوہر کے منہ سے میری برائیاں سن کر بہت خوش ہوگی اور کچھ بعد نہیں کہ مجھے ہی نصیحتیں کرنے بیٹھ جاؤ لیکن تمہارے رویے نے تو مجھے حیران کر دیا۔ اور اس سے زیادہ حیرانی مجھے تب ہوئی، جب رمیض تمہاری کڑوی کیسی سن کر چپ رہا۔“ حور خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ نہیں بولی۔ تو دل آویز کہنے لگی۔

”مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔۔۔ ابھی کچھ دیر قبل تم جس شخص کو لیکچر سنا کر آ رہی ہو، وہ واقعی رمیض تھا۔ جو ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔“

دل آویز نے کانڈھے اچکائے۔

”ویسے صحیح بتاؤ حور! رمیض سے تمہارا کوئی تعلق تو نہیں؟“
 ”واٹ ڈیو مین!“ حور نے آنکھیں پھاڑ کر دل آویز کی طرف دیکھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور کنپٹیاں سلگ گئی تھیں۔
 ”حور اتنی گئی گزری نہیں ہے کہ ایسوں سے تعلق رکھے گی۔“ حور نے چبا کر کہا اور اپنا اشتعال کم کرنے کے لیے گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔
 دل آویز کو اس کے غصے پہ حیرانی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی دانست میں کوئی بڑی بات نہیں کہی تھی، وہ بھی دوسری جانب سے باہر دیکھنے لگی تھی۔



بارات تیار تھیں۔ سب مہمان اکٹھے ہو گئے تھے۔ دل آویز اور دلنشین کی سچ دھج پوری محفل پہ چھائی ہوئی تھی۔ دلشاد بھی خوشی سے دمکتی یہاں وہاں پھر رہی تھیں۔ سہرا بندی کا وقت قریب آ گیا تھا۔ دل آویز اور دلنشین کو آوازیں بڑ رہی تھیں۔ ولید گولڈن کا مدانی اطلس کی شیر وانی اور کلاہ میں خوب سچ رہا تھا۔ اس کے سہرا بندی سے پہلے شگن کی چند رسیں ہونا تھیں۔ مودی کیمرے کی چکا چوندر روشنی اور ڈیک پہ چلتے سریلے گیت شادی کی خوشی کو دوبالا کر رہے تھے۔ اتنی خوشی اس کی شادی پہ تو نہیں تھی۔ یہ اتنے مہمان اور رشتے دار کہاں سے آ گئے۔ اس کی شادی پہ تو بس چند ایک مہمان تھے۔ اس نے ماں کے دکتے چہرے کو دیکھا۔ جو ولید پہ صدمے والی جارہی تھیں۔ بہنیں علیحدہ اس پر سے نوٹ دار وار کر ملازموں کو دے رہی تھیں۔ اس کی دفعہ سہرا بندی کس طرح ہوئی تھی وہ سادگی سے اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلا تھا صرف بابا ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔

”تمہاری ماں اور بہنیں باہر گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی ہیں۔ بہت مشکل سے رضامند کیا ہے انہیں چلنے کے لیے۔ تم بھی بس نکلنے کی کرو۔“

اور وہ حق دق رہ گیا تھا، دو روپے بھی ماں نے سر پر سے وار کر کسی ملازم کو نہ دیے تھے۔ وہ ٹوٹے دل سے گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔ گاڑیوں کے ہمراہ ہینڈ بیجتا ہوا چل رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بالکل سناٹا تھا۔ آج بھی اس کے اندر وہی سناٹا، وہی خاموشی آن بیٹھی تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر سے نکلنا چاہا تب ہی بڑی پھپھوسانے آ گئیں۔

”طارق بیٹا! حور نظر نہیں آرہی۔ سرمہ ڈلوائی کی رسم کرنا ہے اور یہ شگن تو بھابیاں ہی ادا کرتی ہیں۔“

”طارق بھائی! آپ کی دفعہ میں تو سنا ہے، شادی بالکل ہی بورنگ ہوئی تھی۔ ڈھنگ سے رسمیں بھی نہ ہو سکی تھیں۔ حور بھابھی کو بلائیں نا۔ ہم بھی دیکھیں، سرمہ ڈلوائی کی رسم کیسی ہوتی ہے۔“
 راحت کی بیٹی رمشانے کہا تو راحت مسکرا کر بولیں۔

”طارق کی کوئی بھابھی ہی نہیں تھی۔ اس لیے وہ رسمیں نہیں ہوئیں اور طارق کی شادی بورنگ کیوں ہونے لگی۔ حور اعین جیسی بہن نہیں آ سکتی، دلشاد بھابھی کے گھر میں۔“ یہ بات راحت نے اپنی

بہنوں کے بیچ میں کبھی تو سب ہی ہنسنے لگیں۔ اب ادھر ادھر سے حور کو آوازیں پڑ رہی تھیں۔ طارق نے دیکھا، یہاں سے وہاں تک خواتین کا جم غفیر تھا لیکن ان میں حور نہیں تھی۔
 ”شاید وہ پار لگنی ہوئی ہیں۔“

”ارے کوئی اور تو جا کر دیکھو۔ یا یہیں سے قیاس آرائیاں ہوتی رہیں گی۔“ دلشاد نے کہا، دل آویز اور دلنشین مودی بنوانے میں محو تھیں۔ جبکہ ولید کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ حور العین ہرگز یہ رسم ادا کرنے نہیں آئے گی اسی وجہ سے کئی بار وہ بیچ میں جھنجھلایا تھا۔
 ”کم آن ماما! کون کرتا ہے اب یہ رسمیں۔“

”بڑی جلدی ہو رہی ہے دو لہے میاں، بنو کے پاس جانے کی۔“
 شازیہ چچی نے کان مروڑا تو وہ نام سا ہو گیا۔ مگر اس کو ڈرتھا۔ کہیں سر محفل آج پھر تماشا نہ ہو جائے۔

اور ایسا ہی ڈر طارق کو بھی تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ماما نہ جانے کیوں مزے لے رہی ہیں۔ وہ جھنجھلایا تھا۔

”طارق بیٹا! ذرا جانا، دیکھنا تو حور اب تک تیار نہیں ہوئی کیا؟ سب انتظار کر رہے ہیں اس کا۔“
 وہ بہ عجلت سیڑھیاں چڑھتا اور پہنچا تو حور ڈرینگ ٹیبل کے سامنے سنگھار سے آراستہ اطمینان سے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے اطمینان پہ جھنجھلاتا۔ لیکن گنگ رہ گیا۔ آج اس نے اپنا وہی عروسی جوڑا پہن رکھا تھا جو اسٹیشنل بابا نے ملتان سے بنوایا تھا۔ قوس قزح کے رنگوں پہ بخشی دیکے کا لہنگا چولی اور دوپٹہ۔ ہم رنگ گولڈ کی جیولری اور میک اپ حور واقعی حور لگ رہی تھی۔ یہ سوٹ جب بن کر آیا تھا تو اس کو بے حد پسند آیا تھا اور اس کے باوجود جب حور اسے پہن کر اس کے پاس آئی تھی تو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔
 لیکن آج وہ اس پہ سے نظریں نہ ہٹا پارہا تھا۔ حور نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا تو اسے بھی جیسے ہوش سا آ گیا۔

”تم یہاں سب سنو کر بیٹھی ہو۔ اور نیچے سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“
 حور کو لون کھول کر اپنی گردن پہ چھڑکتے ہوئے لاپرواہی سے بولی۔ ”باقی سب لوگ بیٹھ گئے گاڑیوں میں؟“
 ”فار گاڈ سیک!“ طارق کو غصہ آ گیا۔ ”ابھی رسمیں ہو رہی ہیں اور خصوصی طور پر تمہیں بلایا جا رہا ہے۔“

حور کے قیامت خیز حسن کو نظر انداز کرنا طارق کے لیے محال تھا۔ حور جانتی تھی۔ وہ کون سی رسم ہو سکتی ہے۔
 ”مجھے کسی رسم کا حصہ نہیں بننا۔“ وہ زروٹھے سے انداز میں کہہ کر اپنی لپ اسٹک پہ پنسل پھیرنے لگی۔

”تو میں جا کر کیا کہوں کہ تم نہیں آرہیں؟“
 ”ایز یوش۔“ اس نے کاندھے اچکائے۔ طارق نے اسے غصے سے دیکھا۔

”کل تک تو تم بڑھ چڑھ کر ہر چیز میں آگے آگے تھیں۔ اب اچانک تم نے بائیکاٹ کر دیا۔ اور پھر یہ اتنی جھجک کیا کرے میں بیٹھنے کے لیے کی ہے۔“ طارق کو اس کی ڈھٹائی سے چڑھائی تھی۔

”جھجک تو لوگ میری دیکھ ہی لیں گے جب اسٹیج پہنچی تو فیملی دہن کے ہمراہ میں بیٹھوں گی۔ لوگوں کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا۔ طارق کی بیوی زیادہ خوب صورت ہے یا منگیترا۔“

”شٹ اپ!“ طارق غصے سے چلایا۔

”میں یہ فضول باتیں نہیں سننا چاہتا۔۔۔ چلو میرے ساتھ۔ اس وقت خواہ مخواہ میں اپنا تماشائیں بنوا سکتا۔“ یہ کہہ کر طارق آگے بڑھا اور اس کی چوڑیوں سے بھری کلائی تھام لی۔

”اپنی عزت کا کتنا خیال ہے طارق آپ کو۔“ اس نے طارق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”اس میں تمہاری بھی عزت ہے۔“ وہ اس پہ غرایا۔ ”اگر تم سمجھو تو۔“ وہ حور پہ تقریباً جھکا ہوا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اسے اٹھالیا۔

”طارق! یہ آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔“ وہ گھسٹتی ہوئی تقریباً کمرے کے وسط تک آگئی تھی، اس کی آواز گھٹ رہی تھی اور آنکھوں میں پانی تھا۔

”جس شخص نے میرے ساتھ اتنی زیادتی کی، میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی اور آپ کہتے ہیں میں اس کے شکن پورے کروں گی۔ میرے دل سے تو اس کے لیے بددعا ہی نکلے گی۔۔۔ کیوں اپنے بھائی کے لیے بددعا کا بندوبست کر رہے ہیں آپ۔“

طارق کو کرٹ سا لگا اور اس نے حور کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کی پھوپھیاں اور کزنز اندر آ گئیں۔

”اتنی زبردست تیاری اور یوں چھپ کر بیٹھی ہو اور یہ طارق بے وقوف تمہیں لینے آیا تھا یا آنکھوں میں اتارنے۔“

طارق کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ اب سب کے سامنے حور بے بس تھی۔ انکار کرنے کا مطلب جگ ہنسائی اور رسوائی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ ان کے ہمراہ نیچے آگئی۔ وہ محفل میں کیا آئی کہ سب کی نظروں کا مرکز بن گئی۔ ہر نگاہ میں اس کے لیے ستائش تھی۔ اس کے آنے سے ہر چہرہ ماند پڑ گیا تھا۔

”آ جاؤ حور! پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔“ وہ دکھے دل کے ساتھ کچھ کچھ نروس سی آگے بڑھ رہی تھی۔ ولید کو اپنی ہتھیلیوں میں پسینہ محسوس ہونے لگا تھا۔ بظاہر وہ دوستوں میں مگن تھا۔ مگر اس کا سارا دھیان اپنی طرف بڑھتی حور کی طرف تھا۔ بڑی پھپھونے چاندی کی سرمہ دانی حور کے ہاتھ میں تھائی۔

”تمکڑا سانیک لینا۔ آخر کو اکلوتی بھابھو۔ معیز کی دفعہ میں تو حصہ دار بھی شامل ہو جائے گی۔“

طارق نے دیکھا۔ حور کے قدموں میں کپکپاہٹ اور آنکھوں میں نمی تھی سی۔ وہ ولید کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”پہلے نیگ لینا ہے یا سرمہ ڈالنا ہے؟“ اس کے دوست اور کزنز حور سے براہ راست مذاق کر رہے تھے۔ نہ جانے حور کے دل کو کیا ہو رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دل چاہتا

تھا، سب کچھ پھینک کر یہاں سے غائب ہو جائے۔ اور پھر بہت سارے۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا اور زبان کچھ بولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ لڑکیاں کہہ رہی تھیں۔

”ایک لاکھ روپے لینے ہیں۔“

”نہیں آنکھیں دو ہیں۔ دو لاکھ روپے۔“

”ہم نے نہیں ڈلوانا سرمہ، اپنا سرمہ اپنی آنکھوں میں رکھیں۔“

چاروں طرف اتنا شور تھا۔ اسے اس وقت کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔

”مدعی ست، گواہ چست۔“ لڑکے اور لڑکیوں میں براہ راست مکالمہ ہونے لگا تھا، سب لطف

لے رہے تھے اور وہ اس لطف سے کوسوں دور کسی اندھیرے میں جا رہی تھی۔ اچانک اسے اپنے عقب

میں مانوس سی خوشبو محسوس ہوئی۔ پھر اپنے داہنے ہاتھ میں ایک مضبوط ہاتھ کا لکڑی۔ طارق اس کے شانے

پہ جھکا کہہ رہا تھا۔

”ہیلپ نیک۔ پھر سرمہ۔“

”یہ چیٹنگ ہے طارق بھائی! فاول ہے۔ آپ خواتین کا ساتھ دے رہے ہیں۔“

حور کو لگا اس کی شریانوں میں رکنا خون گردش کرنے لگا ہے اور سانس لینے کے لیے کھلی ہوا میسر

آگئی ہے۔ وہ مکمل طارق کے حصار میں تھی۔ اب اسے کوئی ڈر نہیں تھا۔ طارق نے اس کا سرمہ دانی والا

بازو بھی تھام لیا۔

”میں خواتین کا ساتھ کہاں دے رہا ہوں۔ میں تو صرف اپنی مسز کی ہیلپ کر رہا ہوں۔“

لڑکوں میں شیم کے نعرے لگنے لگے۔

”ولید! سوچ لو سرمہ لگوانا ہے۔ ورنہ اسی ہڑ بونگ میں بیٹھے رہنا۔ کیونکہ دل آویز اور دلنشین سہرا

ہاتھ میں اٹھائے اٹھائے سخت تھک چکی ہیں اور جب تک سرمہ نہیں لگے گا سہرا انہیں بندھے گا اور سہرا انہیں

بندھے گا تو بات بھی نہیں چلے گی۔ کیوں دل آویز اور دلنشین؟“

طارق نے بہنوں کو پکارا، دل آویز کو تو حور کو دیکھ کر نئے سرے سے اپنی جیولری اور بال سیٹ

کرنے کا خیال آ گیا تھا۔ جبکہ دلنشین نے طارق کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”بھابھی جو نیک چاہے مانگ لیں۔ میں انکار نہیں کروں گا۔“ ولید کے چہرے اور آنکھوں میں

اپنائیت اور رشتوں کے تقدس کا احترام تھا۔ حور کی آنکھیں چار ہوئی تھیں۔ ”جو کہہ رہی تھیں۔ تم مجھے

اب کچھ نہیں دے سکتے ولید! جو دینا تھا وہ دے چکے ہو۔“

”چلو حور! جلدی سے۔“ شور مچنے لگا۔

”ولید! دھیان سے، جتنا بھادج کو دو گے۔ اس سے ڈبل بہنوں کو دینا پڑے گا۔“ کوئی شور میں

چلا رہا تھا۔

”مجھے کیا فکر ہے۔ میرا بینک تو سامنے کھڑا ہے۔“ بہت دیر کے بعد ولید کے چہرے پہ بھی

مسکراہٹ آئی تھی۔ حور نے طارق کی مدد سے سرمہ ولید کی آنکھوں میں لگایا تو خوب ہلچلا۔ سب ہی

پجوشن سے لطف لے رہے تھے۔ حور وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ لیکن طارق زبردستی اسے لیے کھڑا

رہا۔

دلشاد جھنجھکیا کیا بیانیہ جاری تھیں۔۔۔ جیسے ہر چیز سے بے نیاز ہو گئی تھیں۔ انہیں طارق اور حور کی بے تکلفی پہ غور کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اب دل آویز کو آوازیں پڑنے لگی تھیں۔

”ماما! دیکھنا میں ٹھیک لگ رہی ہوں۔“ بھری محفل میں اپنے بارے میں پوچھنے پہ دلشاد بیٹی سے تقریباً چڑ گئی تھیں۔

”کم آن دل! سب تمہیں بلارہے ہیں اور تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ چلو وہاں چلو۔ دیکھو حور نے کیسے محفل لوٹ رکھی ہے۔“

وہ اپنی کولیگز کی طرف دیکھتے ہوئے جبراً مسکراتی، دل آویز کو گھسیٹتی ولید کی جانب بڑھی تھیں۔ جہاں دلنشین ان کی منتظر تھی۔

دونوں بہنوں نے ولید کے سہرا باندھ دیا تو طارق نے جیب سے پیسے نکالے اور پچاس، پچاس ہزار دونوں بہنوں کو دے دیے۔

”حور کو کیا دیا ہے!“ چاروں جانب سے شورا اٹھا۔

”یہ بندہ سالم کا سالم۔“ طارق نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو حور کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ طارق کے اس منافقانہ رویے سے باہر نکلتا چاہتی تھی۔ جبکہ لڑکیاں اور خواتین شور مچانے لگیں۔

”شرم کرو ولید! پیسے بچانے کے لیے بھائی کو ہی ٹیگ میں دے دیا۔“

”میں اس قابل کہاں تھا۔“ ولید کو طارق کے رویے سے خاصی تقویت ملی تھی۔

جبکہ حور۔۔۔ طارق کے پہلو سے نکل کر دور جا بیٹھی تھی۔ لڑکیاں طارق اور ولید کی درگت بنا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ بارات چل پڑی۔



ڈنر کے بعد رخصتی کا شور پڑ گیا اور پھر جلد ہی رخصتی بھی ہو گئی۔۔۔ دل آویز اور دلنشین دولہا، دلہن کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھی تھیں۔ جبکہ دلشاد اور ابراہیم، وقار احمد اور ان کے عزیز واقارب سے مل کر پیچھے گاڑی میں آرہے تھے۔ زیادہ تر مہمان اپنے گھر چلے گئے تھے۔ صرف چند ایک مہمان تھے جو دلہن کے ہمراہ گھر تک جا رہے تھے۔ باری باری گاڑیاں گھر کے آگے رکیں۔ دلشاد کو سخت قلق تھا کہ دلہن کے استقبال کے لیے گھر پر کوئی نہیں ہے۔ اس کا اظہار انہوں نے گاڑی سے نکلنے ہی کیا تو طارق کو سخت حیرت کا جھٹکا لگا، اس کی شادی پر تو کسی نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی۔ دلشاد پیگم جب دلہن کے ہمراہ گیٹ پر اتریں تو ششدر رہ گئیں۔ پھولوں کے تھال لیے خورالعین سامنے کھڑی تھی۔ ان لوگوں کو دیکھ کر حور نے ساری لائسنس آن کر دیں۔ حور کے ہمراہ طارق کی کزنز بھی تھیں۔ جن کی مدد سے روش پر دیوں کی قطاریں بنا کر روشن کر رکھی تھیں۔۔۔ دلشاد چاہ کر بھی اپنے تاثرات چھپانہ سکیں۔۔۔ انہیں سخت ندامت و خفت کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسے ہی کچھ حالات دل آویز اور دلنشین کے بھی تھے۔

ولید اصباح کے ہمراہ اندر آ گیا۔۔۔ جس صوفے پہ انہیں لا کر بٹھایا گیا تھا۔ وہ بھی گلاب کے

پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ تھوری دیر لاؤنچ میں گہما گہما رہی۔ پھر ایک ایک کر کے سب مہمان رخصت ہو گئے۔ جو بھی سخت تھک چکی تھی۔ وہ بھی چھینچ کر کے آرام کرنا چاہتی تھی۔ دلشاد نے دل آویز سے کہا کہ صبح کو اس کے کمرے میں بٹھا آئے۔

تب ہی اچانک ولید کمرے سے نمودار ہوا۔ وہ بالکل سادہ سے لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابیاں تھیں۔

”اوکے ماما۔۔۔ شب بخیر۔ ہم لوگ جارہے ہیں۔ چلو صبح میرے ساتھ چلو۔“

”مگر کہاں؟“ دلشاد کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”ایسے ہی گھومنے پھرنے اور کہاں۔“ اس کا سابقہ انداز لوٹ آیا جو اس کی شخصیت کا خاصا تھا۔

”یہ کون سا وقت ہے گھومنے پھرنے کا؟“ دل آویز نے اچنبھے سے کہا۔ نئی دہلی جوں کی توں بیٹھی تھی۔

”کم آن ماما۔۔۔ آپ کو پتا ہے، میں اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔“
 ”واٹ ڈو یو مین؟“ دل آویز کو غصہ آ گیا۔ ”تم ہمیں ”کسی“ کہہ رہے ہو، جنہوں نے دن رات محنت سے تمہاری بری بنائی اور تمہاری خوشیوں کو دبوچا لیا۔“

ولید قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ”میری خوشیوں کو نہیں اپنی خوشیوں کو دبوچا لیا۔ اب سب خوش ہیں تو مجھے بھی خوش ہونے کا حق ہونا چاہیے۔“
 ولید کے چہرے پر اپنی سنجیدگی تھی کہ دلشاد چونک گئیں۔

”تم نے سنا نہیں صبح! میں کیا کہہ رہا ہوں۔“
 نوخیز دہلی اس حکم پر تھوڑا سا شیشائی تو دلشاد لپک کر بھتیجی کے پہلو میں آ بیٹھیں اور اپنا غصہ دبا کر نرمی سے بولیں۔

”گھومنے پھرنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے ولید! تم دونوں ہی تھکے ہوئے ہو۔ آرام کرو۔“
 ”ماما! میں بچہ نہیں ہوں۔ سب کچھ جانتا ہوں۔ اٹھو صبح۔“ اس کے لہجے کے محکم سے ڈر کر صبح کھڑی ہو گئی۔

”اس صبحے میں رات کے تین بجے تم اسے کہاں لے کر جاؤ گے۔“ دلشاد کی گھبراہٹ ان کے پہرے سے ہوید اٹھی۔

”کم آن ماما! میں اس کا شوہر ہوں۔ اس قابل تھا تو ماموں میاں نے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تھا۔ آپ کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف بڑھا۔ صبح اپنی جگہ پر کھڑی رہی تو ولید نے مڑ کر نئی نویلی دہلی کی طرف دیکھا۔ شاید وہ دلشاد کی طرف سے کسی حکم کی منتظر تھی۔

”تم نے زندگی میرے ساتھ گزارنی ہے۔ یا میرے گھر والوں کے ساتھ؟“ صبح سادہ طبیعت لڑکی تھی اور ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو وہ اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی، یہ تک نہیں جانتی تھی کہ وہ کس ان کا بندہ ہے۔ امی، ابو کے منہ سے تو صرف طارق کی تعریفیں سن رہی تھیں۔ ولید کے مزاج کے

بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

وہ خوف زدہ سی چڑیا کی طرح لرزتی کانپتی ناگوں سے ولید کے پیچھے پیچھے چلی پڑی۔ اس وقت یہ تماشا دیکھنے کے لیے صرف دل آویز اور دلشاد ہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ یہاں تک کہ گاڑی کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔

”آپ بھی حد کرتی ہیں ماما۔ نہ بابا کو اٹھایا اور نہ ہی طارق کو۔۔۔ نہ جانے کہاں لے کر جائے گا وہ اسے۔۔۔“

”تمہارے بابا کافی دیر پہلے میڈیسن لے کر لیٹ گئے تھے۔ طارق بھی اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ کیا اب میں اسے کمرے سے بلوائی تاکہ آکر اس کی بیوی بھی تماشا دیکھتی۔“

”اور اب اگر کچھ اور بڑا تماشا ہو گیا۔ تو کیا کریں گی آپ؟“ دلشاد سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

”تم جا کر سو جاؤ۔ میں یہاں لیٹی ہوئی ہوں۔ وہ لوگ آئیں گے تو میں دروازہ کھول دوں گی۔ اور یہ ساری لائسنس آف کرتی چلی جانا۔ مجھے ڈر ہے کہیں تمہارے بابا کی آنکھ نہ کھل جائے۔“

دل آویز نے ماں کے متفکر چہرے کی طرف دیکھا اور طنز سے بولی۔

”یہ اچھی سہاگ رات ہے جو سڑکوں پہ منائی جائے گی۔“



”آں ہاں!“ حور العین نے کمرے میں آکر اپنے بھاری بھر کم زیورات اتارنے شروع کیے تو طارق نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”مجھے پتا تھا۔ تم میرے ساتھ یہی سلوک کرو گی۔ اسی لیے میں جلدی جلدی اوپر آیا ہوں۔“

حور حیرانی سے طارق کی طرف دیکھنے لگی۔

”اس میں اتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے۔“

وہ اس کی بندیا کو داپس مانگ میں ٹکاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ پھر اسے شانوں سے تھام کر آئینے کے سامنے لے آیا۔

”تمہیں پتا ہے۔ آج پورے فنکشن میں تم سب سے خوب صورت لگ رہی تھیں۔ اور یہ بات صرف میں ہی نہیں مودی میکر بھی کہہ رہا تھا۔ جب ہی کیمراتمہارے اوپر سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔“

”آپ نے شاید صبح کو نہیں دیکھا؟“ حور نے جان بوجھ کر کہا تو طارق ہنس پڑا۔

”مجھے ضرورت بھی کیا ہے، کسی اور کی طرف دیکھوں۔“

حور نے محسوس کیا کہ طارق کو اب غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ اس کے آویزے کو چھیڑ رہا تھا

”یہ چوہری صرف میری پسند سے بابا نے خریدی تھی۔ تمہاری دفعہ میں صرف میں نے اور بابا نے خریداری کی تھی۔ ولید خوش قسمت ہے۔ اس کی شادی میں سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہاں تک کہ دل آویز نے بھی اور مزے کی بات تو یہ کہ رمیض نے بھی شادی انینڈ کی اور کچھ بد مزگی بھی نہیں ہوئی۔“

وہ جیسے بہت ہی ترنگ میں تھا خود سے باتیں کر رہا تھا۔

”تم نے ولید سے نیگ کیوں نہیں مانگا۔ یہ تو خوشی کی بات ہوتی ہے۔۔۔ بس تھوڑا سا رنگ میلے۔“

وہ بہت ہی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس خوشی کی وجہ کیا تھی۔ حور سمجھ ہی نہ پا رہی تھی۔
 ”اگر میں نیگ میں رانی اور شیر خان کو مالکتی تو کیا عزت رہ جاتی آپ لوگوں کی۔ کیا آپ کا بھائی یہ نیگ مجھے ادا کر دیتا اگر میں اپنا ہاتھ ہی کاٹ لیتی اور اس رسم میں شرکت ہی نہ کرتی۔ تب آپ میرے ساتھ کیسے زبردستی کر سکتے تھے۔۔۔؟ میری بددعا ہے طارق! ولید ان خوشیوں کو ترسے جن سے اس نے مجھے محروم کیا ہے۔“

وہ اچانک رو پڑی تھی۔۔۔ طارق کے اندر سناٹا سا چھا گیا تھا۔
 ”میں جتنا اس واقعے کو بھلانا چاہتا ہوں۔ تم اتنی ہی شدت سے مجھے یاد دلاتی ہو۔۔۔ اس طرح بے کار میں اپنی اور میری زندگی اجیرن بنا رہی ہوں۔“
 ”اس لیے کہ آپ نے اس واقعہ پر کوئی ردِ عمل نہیں ظاہر کیا اور مجھے ساری عمر اسی بات کا قلق رہے گا۔“

یہ کہہ کر حور ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔
 طارق ابھی مزید بحث کرنا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ نمبر دیکھا ولید کا تھا۔ طارق کو حیرانی ہوئی۔۔۔ اس نے پریشانی سے فون اٹینڈ کیا۔۔۔ ولید کا لہجہ بوجھل اور نشیلا تھا۔
 ”طارق۔۔۔ میں اصباح کو لے کر اپنے آبائی گھر میں آ گیا ہوں، ہو سکتا ہے ماما ہمارا انتظار کر رہی ہوں۔ ان سے کہہ دینا۔ سو جائیں اب ولید بھی گھر نہیں آئے گا۔“
 ولید نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔ طارق بھونچکا رہ گیا۔ رات کے چار بجے وہ کہاں چلا گیا تھا، جب اوپر آیا تھا تب تو وہ دونوں نیچے ہی تھے۔ کہیں ولید نے زیادہ ڈرنک تو نہیں کر لی۔ جس کی وجہ سے بہک رہا ہو۔ طارق چمک سا گیا تھا۔ سوچا نیچے جائے اور صورت حال معلوم کرے۔
 فجر کی اذانیں ہونے لگی تھیں اور دلشاد کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ تب ہی طارق کو نیچے آتا دیکھ کر وہ بے چینی سے اس کی طرف بڑھیں۔ طارق خود سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔



”بہی میرا اصل گھر ہے اور یہی میرا ٹھکانا ہے۔ میں آوارہ پنچھی ہوں۔ زیادہ قید و بند برداشت نہیں کرتا۔ یہ نہ کرو یہ نہ کھاؤ۔ یوں نہ چلو۔ یوں اٹھو، یوں بیٹھو مجھے بچپن سے ایسے نظروں سے جڑ ہے۔ اس لیے میری علیحدہ ہی دنیا ہے۔ آج ہماری نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا تمہیں آج ہی سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ یوں تو تم میری کزن تھیں لیکن میں نے خاندان کی لڑکیوں پہ کبھی غور نہیں کیا۔۔۔ یہ شادی سراسر ماما کو خوش کرنے کے لیے ہوئی ہے۔۔۔ تاکہ طارق کا گھر بسا رہ سکے۔ مجھے اس بدھن کی کوئی خوشی نہیں۔ خیر اب تم میری زندگی میں شامل ہو گئی ہو تو میں اب اتنا بھی بد ذوق نہیں کہ تمہارا یہ مقدم نہیں کروں گا۔ لیکن تم میرے ساتھ تب ہی خوش رہ سکتی ہو۔ جب میرے معاملات میں مداخلت

نہیں کرو گی۔“

اس نے اصباح کے معصوم چہرے کو انگلیوں کی پوروں سے چھوا تھا۔
 ”تم واقعی خوب صورت ہو۔ لیکن۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ اس کے پاس سے اٹھ گیا۔
 ”خوب صورتی ولید کے لیے کبھی اہم نہیں رہی۔ ڈرائنگ روم میں میرے دوست بیٹھے ہیں۔
 میری شادی کی خوشی میں انہوں نے مجھے کا اہتمام کر رکھا ہے۔ آج یہاں دن چڑھے تک رقص و سرور
 کی محفل بجی رہے گی۔ تم سکون سے سو جانا۔ میرا انتظار نہ کرنا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اصباح کے لیے یہ
 سب حالات غیر متوقع اور حیران کن تھے۔ نئی اور ویران جگہ یہ اکیلے سونے کا تصور اس کے لیے سواہنا
 روح تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے قریب آگئی۔ وہ گھر کی بالائی منزل پر تھی۔ نیچے بڑا سا صحن تھا اور
 دونوں اطراف پر برآمدے، برآمدے کے پیچھے سے گھنگھر دوؤں کی آوازیں آرہی تھیں۔ محفل عروج پر
 تھی۔ اصباح نے کھڑکی کی چوکھٹ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



دن نکل آیا تھا۔ سارا گھر خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ سوائے طارق اور دلشاد بیگم کے
 دونوں فکر مند کی میں مبتلا سر جوڑے بیٹھے تھے۔
 ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے یہ گھٹیا حرکت آخر کیوں کی ہے؟ ابھی بھابھی بیگم کی طرف
 سے کوئی ناشتا لے کر آ گیا تو میں کیا کہوں گی کہ میرا بیٹا اصباح کو لے کر بھاگ گیا ہے۔ اور اس نے فون
 نہ کہا ہے کہ وہ کبھی نہیں آئے گا۔ اگر اس نے یہی چھن کرنا تھا تو خاندان کی لڑکی سے شادی ہی کیوں کی۔
 اچھی جان مصیبت میں آئی ہے میری۔۔۔ میں تو سوچ رہی ہوں طارق! یہ بات تمہارے بابا سے
 چھپانے کی نہیں ہے۔ وہ اٹھتے ہیں تو بتا دیتی ہوں۔“
 ”ظاہر ہے، بابا سے چھپائی تو نہیں جاسکتی یہ بات۔“
 طارق نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”تم خود وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟“ دلشاد نے بے چارگی سے کہا۔
 ”وہ چھوٹا سا بچہ تو نہیں ہے جسے کان سے پکڑ کر لے آؤں گا اور آپ کو پتا ہے جب وہ نشے میں
 ہے تو کسی کا لپکا نہیں کرتا۔ خواخواہ میں اپنا تماشا نہیں بنوا سکتا۔“ طارق صبح کھڑ ہوا تھا۔
 ”لیکن اصباح، وہ بچی پتا نہیں کس حال میں ہوگی۔ یا اللہ! میری عزت رکھ لینا۔ اس بچی کے مرنے
 میں تو زبان بھی نہیں ہے۔ اور وقار بھائی کو ان سب حالات کا پتا چل گیا تو الگ قیامت آجائے گی۔
 دلشاد نے رونا شروع کیا۔

”آپ ایسا کریں تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ اصباح کے گھر سے کوئی آئے تو یہ کہہ کر ٹال دیجئے گا کہ
 وہ سو رہی ہے۔ اصباح کو لینے کے لیے تو شام تک ہی آئیں گے۔ تب تک صاحب بہادر کا نشہ بھی
 ہو جائے گا۔ پھر ہی کوئی راہ نکالی جاسکتی ہے۔“

”بھاڑ میں جائے وہ۔۔۔ میں اصباح کو لے آؤں۔۔۔ پھر دیکھ لوں گی اسے۔“ ابھی دلشاد

ارادے ہی باندھ رہی تھیں کہ ان کا سیل فون بج اٹھا۔۔۔ نمبر دیکھ کر دلشاد کا رنگ اڑ گیا۔
 ”بھائی جان کا فون ہے۔۔۔ وہ اصباح سے بات کرنا چاہیں گے تو کس طرح کراؤں گی؟“
 ”آپ گھبرا کیوں رہی ہیں۔ اصباح ہے تو ولید کے ساتھ ہی نا۔ اس گھر میں نہیں تو اس گھر میں،
 آپ بات کریں ماموں سے اور انہیں ٹال دیں کہ فی الحال وہ لوگ سو رہے ہیں۔“
 دلشاد نے ڈرتے بھجکتے فون اٹینڈ کیا۔ دوسری طرف وقار سخت پرہم تھے۔
 ”دلشاد اصباح کہاں ہے۔ کیا آپ اسے اس لیے بیاہ کر لے گئی تھیں کہ وہ مجرے دیکھے اور شراب
 لی بدبو سے اپنا دماغ خراب کرے۔“

وقار احمد کے الفاظ تھے باہم۔ دلشاد کے ہاتھ سے فون چھوٹا اور وہ صوفے پہ ڈھے گئیں۔
 اصباح نے باپ کو خود فون کیا تھا۔ جب محفل چھٹ گئی تھی اور سناٹا چھا گیا تھا۔ تو وہ نیچے آئی تھی۔
 پھر اس نے صحن اور برآمدہ عبور کیا اور دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ ولید آڑا تر چھا بستر پر پڑا تھا۔ وہ
 بالکل ہوش سے بیگانہ تھا۔ کمرے کا حلیہ ناگفتہ بہ تھا۔ الکل کی بدبو سے اصباح کا دماغ چکرانے لگا۔
 اچانک اس کی نگاہ کمرے کے وسط میں پڑی میز پر پڑی جس پر ولید کا فون پڑا تھا۔ اس نے وہ فون اٹھا لیا
 اور بے قدموں سے باہر نکل آئی۔ اس نے اپنے کھر فون ملایا۔ فون اس کی امی نے اٹھایا تھا۔ اصباح
 رو نہ لگی۔ پھر اس نے روتے روتے سارے حالات بتا دیے۔

دلشاد بیگم سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وقار سگے بھائی ہو کر اتنی بے عزتی کریں گے۔ وہ بضد تھے کہ
 اصباح کو ساتھ لے کر جائیں گے۔ بیٹے کی وجہ سے بھائی بھادج کے سامنے دلشاد کو بے حد سبکی محسوس
 ہو رہی تھی۔ ادھر ابراہیم سخت خفت اور غصے میں مبتلا تھے۔ طارق خود اس صورت حال کو کنٹرول کرنے سے
 قاصر تھا۔ ابراہیم کو دلشاد اور طارق دونوں پر ہی غصہ تھا کہ انہوں نے انہیں پہلے آگاہ کیوں نہیں کیا اور اس
 معاملے میں اتنی دیر ہی کیوں لگائی۔ دوپہر تک گھر بھر میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ ولید، اصباح کو لے کر
 رات سے غائب ہے۔ ابراہیم صاحب گاڑی کی چابی لے کر گھر سے باہر نکلے اور سیدھا اپنے آبائی گھر
 پہنچے۔ بہت دیر تک ڈور نیل بجانے پر دروازہ نہ کھلا وہ دروازہ بجاتے رہے۔ اور دل ہی دل میں بیچ و
 تاب کھاتے رہے۔ آخر کار دروازہ اصباح نے ہی کھولا تھا۔ ولید ہوش میں کہاں تھا۔ وہ اندر آ گئے اصباح
 ان حلیے میں کھڑی تھی جس میں رات آئی تھی۔

”میرے ساتھ چلو۔“ انہوں نے نظریں جراتے ہوئے کہا اور اصباح کو لے کر گھر آ گئے۔ وقار اور
 اسفہ ہی نہیں گھروالے بھی اصباح کو دیکھ کر گنگ رہ گئے۔

دلشاد نے اصباح کو سینے سے لگا لیا۔
 ”تم فکر نہیں کرو۔ جو کچھ بھی ہوا ہے۔ بس آج تک ہی تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا تم یہیں رہو گی۔
 اے پاس اسی گھر میں، منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لیے ناشتا بنواتی ہوں۔“
 ”ناشتا اصباح گھر جا کر کرے گی۔۔۔“

پھر انہوں نے سر جھکائے بیٹھے طارق کی طرف دیکھا۔ ”بھول ہو گئی ہم سے۔ طارق اور ولید میں
 نے فرق ہی محسوس نہیں کیا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں بھائی جان آپ۔۔۔! ہمیں تھوڑا سا وقت تو دیں۔“ دلشاد شرمندگی لباجت سے بات بنا رہی تھیں۔

”دلشاد! اصباح ہماری اکلوتی بچی ہے۔ یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ غیروں سے بھی ایسی توقع نہیں کی جاسکتی۔ جیسی۔۔۔ خیر چھوڑیں۔۔۔ اچھا ہوا ہمیں جلد ہی ولید کی نیچر کا پتا چل گیا۔۔۔ عمر بھر کے فیصلے ہوتے ہیں یہ۔ معمولی بات نہیں ہے۔ بیٹے کی بری عادتیں چھوٹ جائیں تو اصباح کو آکر لے جائیے گا۔ بصورت دیگر ہم سمجھیں گے ہم نے اصباح کو بیاہا ہی نہیں۔“

وقار اور آصفہ بیٹی کو لے کر نکلے تو دلشاد نے کلیجہ تھام لیا۔

ادھر ابراہیم برہم ہو رہے تھے۔ ”زندگی تماشا بن کر رہ گئی ہے۔ حد ہوتی ہے پاگل پن کی بھی۔ ایک مسئلے سے جان چھوٹی کہ دوسرا گلے آن پڑتا ہے۔ شوٹ کر دوں گا میں اسے، ایسی اولاد دل کر دینے کے لائق ہے۔“

ابراہیم اپنا فون ملانے لگے۔ وہ کسی اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کر رہے تھے۔ ذکر گھر کو فروخت کرنے کا تھا۔

”ادریس صاحب! آپ جگہ دیکھ لیں، میں آج ہی اس گھر کو بیچ دینا چاہتا ہوں۔“

”نہیں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ادائیگی دستاویزات پہ ہوجائے۔ کیش پے منٹ بھلے بعد میں ہوتی رہے میں، دستاویزات پہ ہی مالکانہ حقوق دے دوں گا۔ آپ رجسٹری کی تیاری کرائیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ دلشاد اور طارق گنگ ہو گئے۔ دلشاد ہی نہیں طارق بھی جانتا تھا اس گھر سے ابراہیم کو کتنی محبت تھی وہ اسی غصے میں کمرے سے نکل گئے تھے۔ طارق بھی بوجھل قدموں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کا بھی دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ حورالعین ساری صورت حال سے باخبر تھی۔ لیکن اس نے اس موضوع پہ طارق سے کوئی بات نہیں کی۔ طارق آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر لیٹ گیا۔ اسے ولید سے ایسی ہی اوٹ پٹانگ حرکتوں کی توقع تھی۔ حورالعین سوچتے ہوئے چپ چاپ بیچے آ گئی۔ دل آویز اور دلشاد آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

”ماما! آپ کی بیٹیجی سے کہیں بہتر تو بابا کی بھانجی تھی۔ جس نے آج تک اپنے گھر کی کوئی بات کسی سے نہیں کی۔ اصباح نے تو ایک رات بھی برداشت نہیں کیا اور فوراً اپنے ماں باپ کو بلا لیا۔“

”ہاں۔۔۔ مجھے بھی اس بات کا دکھ ہے۔ کم از کم اصباح ایک رات تو برداشت کر لیتی۔ اس طرح گھر کی بات گھر میں ہی رہ جاتی۔ کیا ہم ولید کو ایسے ہی بے مہار چھوڑ دیتے۔“

”اور پھر ایسی بھی کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ سچی تو وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہی نا۔“

”سچ بچو چھو تو دل! مجھے بھی اصباح کا یہ اتالا پرن بالکل نہیں بھایا۔ حورالعین کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا۔ مگر اس کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ مانا کہ ماں سوتیلی ہے مگر باپ تو سگا ہے اور اپنی اولاد کے ساتھ زیادتی کوئی بھی برداشت نہیں کرتا۔ پہلی رات تو طارق اپنے کمرے میں گیا ہی نہیں تھا۔ یہ میں اچھی طرح سے جانتی ہوں اور یہ بات گھر کی چار دیواری میں ہی ختم ہو گئی۔ اصباح نے تو پہلے دن ہی پیشی لگوا دی۔ حالانکہ ہم نے اصباح کو حورالعین سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ پورے تین کمروں میں تو اس کا

جہیز لگوایا ہے۔ سونا بھی زیادہ چڑھایا اور کپڑے بھی ایک سے ایک۔ طارق میرا کتنا اچھا بیٹا ہے۔ اسے میں نے چند تولے سونا دیا اور بس چند کپڑے۔ ایسے بیٹے کو تو میں سونے میں بھی تول دیتی جب بھی کم تھا۔“

دلشاد کو رہ کر ملال ہوا۔

”نہ صرف بیٹا، بہو بھی اصباح سے بہتر ہے۔“

دل آویز نے تعریف کی تو پھر بھی بجل سے کام لیا۔ حورالعین نے اپنے متعلق یہ گفتگو سنی تھی، وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

شام تک گھر میں سناٹا رہا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کل یہاں شادی ہوئی ہے اور دلہن بیاہ کر آئی ہے۔ کیونکہ سوائے حورالعین کے گھر پر کوئی نہیں تھا۔ سب ہی ولید کے پاس پہنچے ہوئے تھے۔



”میری مرضی کے بغیر اصباح اپنے پرنس کے ہاں ایک رات بھی نہیں رکے گی۔“

ولید کی ڈھٹائی اور بدتمیزی پر ابراہیم صاحب کو اشتعال آگیا۔ ”سن رہی ہو تم اس کی باتیں۔“

ولید پر ماں باپ کے کسی لکچر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور نہ ہی یہ احساس جاگا تھا کہ اس کی وجہ سے اصباح کے والد اس کے ماں باپ کی تنہی بے عزت کر کے گئے ہیں۔ وہ اپنے غیر ذمہ دارانہ رویے پر مطمئن تھا۔

”اصباح تب تک نہیں آئے گی۔ جب تک تم نہیں سدھرو گے۔“ دلشاد نے ابراہیم کا غصہ دیکھتے ہوئے بیٹے کو دھکی دی۔

”واٹ یو مین ماما! یہ اصلاح آپ کو میری پہلے کرنا چاہیے تھی۔ اب میں جیسا تھا ویسا ہی رہوں گا۔“

ابراہیم کا ضبط جواب دے گیا۔ انہوں نے اس کی بے غیرتی پر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پہ دے مارا۔

”ابھی اور اسی وقت اس گھر کو خالی کر دو۔۔۔ کیونکہ تمہاری وجہ سے میں اس گھر کو بیچ چکا ہوں۔“

اب اس جگہ کو تم اپنی عیاشی کا اذہ نہیں بنا سکتے۔“

ولید کے لیے یہ جھکا بھی تھپڑ سے کم نہیں تھا۔

”آپ یہ گھر نہیں بیچ سکتے۔“ ولید نے باپ کو تنبیہ کی تھی۔

”میں یہ گھر بیچ چکا ہوں۔“ وہ دودھ بولے تھے۔

”میں آپ کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ مجھے علیحدہ رہائش چاہیے۔“ اس کے مطالبے پہ دلشاد کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”اتنے بڑے گھر میں کس چیز کی کمی ہے تمہیں؟“

”وہاں کا ماحول میری پسند کے مطابق نہیں ہے۔“ وہ ہٹیلے پن پہ قائم تھا۔

”میں بھی تمہیں رکھنا نہیں چاہتا کیونکہ تمہارا چال چلن مجھے پسند نہیں ہے۔“ ابراہیم صاحب غصے سے پھنکارے تھے۔

طارق درمیان میں بول پڑا۔ ”اگر یہ میری وجہ سے وہاں رہنا نہیں چاہتا۔ تو میں جلد ہی رہائش تبدیل کر لوں گا۔ لیکن دلشیں کی شادی تک میں وقت چاہتا ہوں۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“ دلشاد اور ابراہیم بیک وقت بولے تھے۔ ”نہ اب نہ دلشی کی شادی کے بعد، اسے اگر ہم سے تکلیف ہے تو یہ اپنی شکل و فغان کرے۔ ایک دفعہ ہی ہماری جان چھوڑ دے۔ ہمیں بھی ضرورت نہیں ایسی اولاد کی۔“ ابراہیم صاحب کا اشتعال تھا کہ کم ہونے یہ ہی نہیں آ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ آج کے بعد میرے معاملات میں آپ میں سے کسی کو مداخلت کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“

ولید نے یہ کہا اور ان کے درمیان سے نکل کر باہر چلا گیا۔ دلشاد بے چارگی سے شوہر اور بیٹے کا منہ دیکھنے لگیں۔



دو دن اسی خاموشی سے گزر گئے۔ رمیض، دل آویز کو لینے آیا تھا۔ اب ولیمہ کا تو کوئی تصور ہی نہیں رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس گھر میں شادی نہیں موت واقع ہوئی ہے۔ دل آویز جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

گھر میں تین شادیاں ہوئی تھیں اور تینوں ہی خوشیوں سے خالی۔ دل آویز کو ولید کے رویے کا گہرا دکھ تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے ماں باپ اس وقت بہت پریشان ہیں۔ سو اسے اپنی طرف سے انہیں پریشانی دینا اچھا نہیں لگا اور اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا اور ایسا اس نے پہلی بار سوچا تھا۔ کسی بڑے غم کے سامنے اپنے دکھ کو چھوٹا سمجھا تھا اور نہ آج تک تو وہ ماں باپ کو ہی الزام دیتی آئی تھی کہ اس کی زندگی برباد کرنے والے وہی ہیں۔ وہ چپ چاپ تیار ہو کر باہر نکلے۔

دلشاد نے حیرانی سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ پھر چپ چاپ بیٹی کو رخصت کر دیا۔ رمیض کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دل آویز سوچ رہی تھی۔

”ولید کتنا خراب ہے۔ اس کی ناقابل برداشت عادتوں کے باوجود ماما نے یہ کہا اگر اصباح ایک رات برداشت کر لیتی تو کون سا قیامت آ جاتی۔ مجھے کبھی ماما نے برداشت کرنے کو نہیں کہا، ہمیشہ یہی کہتی تھیں۔ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ لیکن یہ ہنر مجھے حور العین نے سکھایا۔ ناقابل برداشت عادتوں کو برداشت کرنا اور اپنی جگہ پہ ڈیے رہنا۔ اس صبر اور استقامت نے آج حور العین کو اصباح پہ سبقت دلائی تھی۔“ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ رمیض کے اور اس کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن آج اس نے یہ عزم کیا تھا کہ اپنے حصے کے دکھ اپنے ماں باپ کو نہیں دے گی۔



عورت کے حقوق و سالمیت کا آج عالمی دن تھا۔ بہت دن کے بعد دلشاد بیگم نے اپنی تنظیم کے دفتر

میں جانے کا ارادہ کیا تھا۔ ویسے بھی وہ گھر میں پڑے پڑے سوچوں سے ہلکان ہو رہی تھیں۔ یہ بات کتنی شرمندگی کا سبب تھی کہ ولید نے اپنے سسرال میں ہی پڑاؤ ڈال لیا تھا اور وہیں رہ رہا تھا اور یہ بات وقار احمد نے دلشاد کو خود بتائی تھی۔ دلشاد کیا کہتیں کہ دھکے دے کر نکال دو یا یہ کہ ہم تو ولید کو ناخلف قرار دے چکے ہیں۔ دلشاد کے لب سل گئے تھے اس کے پاس کوئی معقول بات نہیں تھی، وہ صرف عاجزانہ سے لہجے میں کہہ سکتی تھیں۔

”میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں بھائی جان!“
 ”شرمندگی تو ہمیں بھی ہے اپنی بیٹی سے اور دکھ بھی لیکن اگر وہ ہمارے پاس آ گیا ہے تو اچھی ہی صحبت لے کر جائے گا۔“
 ان کو بھائی کا انداز برا لگا تھا۔ مگر کیا کہتیں بیٹے نے یہ وقت دکھلایا تھا۔ ضبط سے پی گئیں۔



لنٹین یونیورسٹی جانے لگی تھی۔ دل آویزا نے گھر چلی گئی تھی۔ اور دلشاد کی مصروفیات پھر سے رواں دواں ہو گئی تھیں۔ فقط حور ہی گھر میں رہ جاتی تھی۔ آج بہت دنوں کے بعد اسے لان کی صفائی کا خیال آیا تھا۔ وہ مالی بابا سے جنگلی گھاس صاف کر رہی تھی کہ اچانک طارق کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ طارق کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ دلشاد کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ملازم نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی اپنے آفس گئی ہیں تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اندر چلا گیا۔

حور العین بھی ہاتھوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ وہ ولید کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ حور العین باہر ہی رک گئی۔ دروازہ چونکہ کھلا ہوا تھا اس لیے وہ طارق کی سرگرمی دیکھ سکتی تھی۔ طارق، ولید کی وارڈ روب سے اس کے کپڑے نکال رہا تھا۔ اب حور سے رہا نہ گیا وہ بھی اندر آ گئی۔
 ”کیا بات ہے کچھ بتائیں گے بھی؟“ طارق نے کچھ جواب نہیں دیا، اس کی درازیں کھول کر کچھ ڈھونڈنے لگا۔ پھر ولید کے کپڑے لے کر باہر نکل گیا اور ڈرائیور کو آواز دے کر کہا کہ وہ گاڑی لے کر جائے اور ماما کو فوراً اپنے ساتھ لے کر آئے۔

”طارق کچھ بتائیں تو کیا ہوا ہے؟“ وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ حور کا دل ڈوبنے لگا، وہ اس کے پیچھے پیچھے اپنے کمرے تک آ گئی۔ طارق لاک اپ میں سے پیسے نکال رہا تھا۔
 ”ولید کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔“ طارق کی آواز گھٹ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے ولید کو؟“ حور کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا تھا۔ طارق نے مڑ کر حور کی طرف دیکھا۔ وہ شاید ضبط کر رہا تھا۔ تب ہی یکا یک بول نہ پایا۔ حور نے دیکھا اس کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔

”ولید کو اس کے دوستوں نے زہریلی شراب پلا دی ہے۔ وہ سٹی ہسپتال میں آئی سی یو میں ہے۔“
 کہتے کہتے طارق کی آواز رندہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو رہے تھے۔ ”شاید تمہاری بد ما۔۔۔“

حور نے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔ غم سے اس کا دل پھٹنے لگا تھا۔

”ولید کو معاف کر دینا حور! اس وقت اسے صرف دعاؤں کی ضرورت ہے۔“

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے اور پھر گھر سے باہر نکلتا چلا گیا حور جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

دن گزر گیا اور پھر پوری رات گھر میں کوئی نہیں تھا۔ سب اسپتال میں ولید کے پاس تھے۔ گو کہ وہ ہسپتال میں نہیں تھی۔ مگر گھر میں رات بھر سو بھی نہ پائی تھی۔

اس نے طارق کی آنکھوں میں بھائی کے لیے محبت کا الاؤ دیکھتے دیکھا تھا۔ اس نے ولید کی زندگی کی دعائیں مانگی تھیں۔

نماز فجر کے بعد اس نے طارق کے پاس فون کیا۔ تو طارق نے بتایا کہ ابھی اسے ہوش نہیں آیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر زکیر ہے ہیں کہ وہ خطرے سے باہر ہے۔

صبح وہ اسپتال میں سب کے لیے ناشتا بنا کر لے گئی۔

ولید ابھی آئی سی یو میں ہی تھا۔ لیکن خطرے سے باہر تھا۔ اس نے زبردستی سب کو ناشتا کرایا۔ دلشاد نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ جبکہ ابراہیم سکتے کی سی حالت میں تھے۔ ابھی وہ لوگ ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ وقار اور آصف آ گئے۔ وقار احمد کو دیکھ کر دلشاد ان پر برس پڑیں۔

”انتنا ظلم تو نہیں کیا تھا میرے بیٹے نے کہ آپ نے اسے زہر پلا کر مار ہی ڈالنے کا سوچ لیا۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو دلشاد تم!“ وقار احمد خود دل گرفتہ تھے۔

”ولید آپ کے ہاں ہی رہ رہا تھا نا۔ پھر اس کی یہ حالت کیسے ہوئی؟“ انہوں نے بھائی کا گریبان پکڑ کر سسریائی انداز میں پوچھا تو وقار احمد نے دلشاد کے ہاتھ جھٹک دیے۔

”اصباح کو اپنے ساتھ ہی منوں پہ لے جانے کی ضد باندھ لی تھی اس نے، میں نے انکار کر دیا تھا۔

اس بات پہ وہ اشتعال میں آ گیا اور میرے گھر میں توڑ پھوڑ کی۔۔۔ تو میں نے غصے میں برا بھلا کہہ دیا۔

جو اس سے برداشت نہ ہوا اور میرے گھر سے نکل گیا۔ دو روز سے وہ میرے پاس نہیں تھا۔ میں سمجھا شاید

آپ کی طرف چلا گیا ہو۔ مجھے کیا معلوم تھا، یہ اپنے دوستوں میں چلا جائے گا۔“

”اگر ذرا سی اور دیر ہو جاتی۔ تو جانتے ہیں، آپ کیا ہو سکتا تھا۔“ دلشاد رو رہی تھیں۔ وقار احمد نے

سر جھکا لیا۔

جواں سال بھائی کو بستر مرگ پہ پڑا دیکھ کر دل آویز اور دلنشین ایک کونے میں بیٹھی سسک رہی

تھیں۔ غم و فکر سے نڈھال حور بھی ان کے پاس بیٹھی تھی۔

تین روز اسی پریشانی میں گزر گئے۔ رفتہ رفتہ ولید کی طبیعت بحال ہو رہی تھی۔

آج شام کو ولید کی چھٹی ہونامی اور اسے گھر آنا تھا۔ وہ سوپ بنا کر ڈرائیو کے ہمراہ اسپتال پہنچی تو

کمرے میں صرف ولید اور طارق تھے۔ طارق نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ اس پہ جھکا ہوا تھا۔

”مجھے بتاؤ ولید! وہ لوگ کون تھے۔ جنہوں نے ہمیں اس حال تک پہنچایا؟“ طارق جذباتی ہو رہا

تھا۔ ولید کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

”تم جانتے ہو طارق! ماموں نے مجھے طعنہ دیا۔ گھر داماد بن کر عمر بھر میں ان کے ٹکڑوں پہ پلنے کے لیے آن پڑا ہوں۔“

”تم وہاں گئے ہی کیوں تھے؟“ طارق کو گہرا رخ تھا۔ ولید کو کوئی جواب نہیں دیا۔

”بتاؤ ولید! جب تم نے شادی خوشی خوشی کی تو پھر ایسا رویہ کیوں اختیار کیا۔ کیوں تم اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی اجیرن کر رہے ہو؟“

”میں ماما کو اتنا ہی دکھ دینا چاہتا تھا جتنا انہوں نے مجھے دیا۔“ یہ کہتے ہوئے ولید رو رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے طارق! ماما نے جان بوجھ کر مجھے اور حور بھانجھی کو اسکیئنڈلائز کیا تھا۔ کیا یہ بات معمولی تھی؟ ماما نے یہ تک نہ سوچا کہ وہ اپنے ہی بچوں پر گندگی اچھال رہی ہیں۔ شیر خان نمک حرام نہیں تھا۔ اس نے ذریعہ اسماعیل خان سے مجھے ٹون کیا اور مجھ سے معافیاں مانگنے لگا۔ پھر بتا ہے طارق اس نے مجھے کیا بتایا۔ انہیں ماما نے حکم دیا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جائیں اور زندگی بھر کبھی ادھر کا رخ نہ کریں۔ یہ راز کبھی نہیں کھلنا چاہیے کہ حور العین یہاں کب سے آئی ہوئی تھی۔ اور کیوں آئی تھی۔ یہاں وہی کچھ ہوا ہے جو میں نے کہا ہے۔ میں شیر خان کے منہ سے یہ سب سن کر گنگ رہ گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ مجھ سے معافیاں مانگ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کیا میں ایسی بھی ہوتی ہیں۔“

پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور غم سے نڈھال بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا ماں اپنی معمولی سی خواہش پوری کرنے کے لیے کسی اولاد کے گھر میں آگ لگا سکتی ہے۔۔۔ تمہارا گھر بچانے کے لیے طارق میں نے اس آگ کو گلے لگا لیا ہے۔۔۔ میں اس آگ میں خود جل جاؤں گا۔ لیکن تمہاری گہستی پر آج نہیں آنے دوں گا۔“ ولید رو رہا تھا۔

طارق نے ضبط غم سے بھائی کے آنسو پونچھے اور دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

”تم کیا سمجھتے ہو۔ کیا میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ حور بے گناہ ہے۔ مجھے اس کی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔ میری حور ایسا گناہ کر ہی نہیں سکتی۔ مجھے حور سے شکایت تھی تو بس اتنی کہ اس نے ایسا موقع فراہم ہی کیوں کیا۔ ہم سب ہی جانتے ہیں ماما اول روز سے حور سے نفرت کرتی ہیں۔ مگر ماما کی نفرت سے حور میری زندگی سے بے دخل تو نہیں ہو جائے گی۔ دیکھو ولید! تمہیں اپنا رویہ بدلنا ہوگا۔۔۔ جب میں سب کچھ بھلا سکتا ہوں۔ تو تم کیوں نہیں؟

تم ماما سے کوئی انتقام نہیں لو گے۔ وہ ہماری ماں ہیں ولید! ذرا سوچو تو ہڈی دیر کے لیے سوچو۔ یہ بات حور کو پتا چل گئی تو ماما کا کتنا امیج خراب ہوگا۔ اس لیے شیر خان والی بات تم کبھی کسی سے نہیں کرو گے۔ تم سن رہے ہو نا ولید میری بات۔ میں اپنی محبت سے حور کے دل سے ساری تلخ باتیں مٹا دوں گا۔ لیکن ماما کا امیج خراب ہو، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔“

طارق کے چہرے پر رنج و غم کی پرچھائیاں تھیں۔ ولید حیرت سے طارق کو دیکھ رہا تھا۔ شدت غم سے حور کا دل پھٹ گیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلی۔ دروازے کی آہٹ نے دونوں نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ حور تیزی سے نکل کر جا رہی تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے اور قدم ڈنگا رہے تھے۔ طارق تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

ہسپتال کے کوریڈور میں حور تیز تیز قدم اٹھاتی جا رہی تھی۔
 ”حور! کو تو سہی۔ میری بات تو سنو۔“ طارق اس کے پیچھے تھا۔ مگر حور العین رکنا تو درکنار سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آنسو اتر سس اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔
 ”میں جانتا ہوں ولید! سب کچھ۔۔۔ مگر میں مانا کو بے عزت نہیں کر سکتا۔۔۔ ولید! وہ ہماری ماں ہیں۔۔۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا۔۔۔ بہت برا کیا۔۔۔ لیکن وہ میرے لیے اب بھی محترم ہیں۔۔۔ اور تم۔۔۔ تم بھی۔۔۔ اس جنگ سے دست بردار ہو جاؤ۔ ہمارا وقار اسی میں ہے۔“
 اس کے اعصاب پہ طارق کے الفاظ ہتھوڑے بن کر برس رہے تھے۔ وہ ہتھیلیوں سے آنسو گر گئی تھی۔

”حور پلیز رکو تو سہی۔ میری بات سنو۔“ طارق اس کے قریب پہنچ گیا۔
 یک دم ہی اس کے قدم رک گئے۔ طارق کے چہرے پہ ملال ضرور تھا۔ لیکن پشیمانی ہرگز نہیں تھی۔ حور نے سرخ آنکھوں سے طارق کی طرف دیکھا۔
 ”میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تب تک۔۔۔“ اس نے آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے ریلے کو ہتھیلی سے رگڑا۔ ”جب تک تمہاری ماں۔۔۔ اپنے اس گھناؤنے فعل کی مجھ سے معافی نہیں مانگے گی۔“
 اس کی آواز پست ضرور تھی لیکن لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ طارق چونک گیا۔
 ”سناتم نے طارق! تمہاری ماں سب کے سامنے میری بے گناہی کا اعتراف کریں گی، تب ہی میرے زخم کا مداوا ہوگا۔“ وہ تیزی سے کہہ کر ہسپتال سے نکل گئی۔
 طارق حق دق کھڑا رہ گیا۔



آج پورے گروپ میں ہر ایک کی توجہ کا مرکز ڈنشین ابراہیم تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کی منگنی تھی۔ اس کے قریبی دوست اس خوشی کے موقع پر اس سے دعوت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ اس سارے ماحول سے خوب انجوائے کر رہی تھی۔۔۔ جبکہ راحیل کو گہرا اچھا لگا تھا اور اس نے راحیل کو تو بچا دکھانے کے لیے ہی اپنی منگنی کا اعلان کیا تھا۔ انگوٹھی بھی خود ہی خریدی تھی۔
 راحیل کے تاثرات اس کے لیے تسکین کا سبب تھے۔۔۔ آج اس نے راحیل سے بدلہ لے لیا تھا۔



”آخر یہ خاموشی کب ٹوٹے گی؟“ طارق حور کی بے رخی سے زچ ہو چکا تھا۔ حور کچھ نہیں بولی اور چپ چاپ لحاف کھول کر خود پہ پھیلائے گی۔
 ”ولید گھر آ گیا ہے۔ تم سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ تمہاری بدگمانی دور کرنا چاہتا ہے۔“
 ”اس نے آپ کی بدگمانی دور کر دی۔ میرے اوپر یہ احسان ہی بہت ہے۔“

حور کا لہجہ تلخ اور رنجیدہ تھا۔ ”اس سے کہنا، میں اب کسی سے بدگمان نہیں ہوں۔ میں نے آپ سے محبت کی تھی۔ اس کی سزا تو ملنا ہی تھی۔ آپ کی بے اعتنائیاں اور سرد مہری پھر یک دم کرم نوازی اور التفات مجھے تو بس اسی میں خوش ہو جانا چاہیے کہ آپ کی نظر کرم تو ہوئی۔۔۔ اور مجھے کیا چاہیے۔ نہ عزت، نہ وقار۔“

حور کا لہجہ آنسوؤں کی آمیزش سے بوجھل ہو رہا تھا۔ طارق چپ چاپ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ پہ اپنائیت و محبت سے ہاتھ رکھا تو چونک گیا۔ ”مہیں تو ٹھیک ٹھاک نمبر پچر ہے۔“ وہ اس کی پیشانی کو چھو کر بولا۔ حور نے کوئی جواب نہیں دیا لحاف خود پہ پھیلا کر سر بند کے سر ہانے پہ نکالیا اور چپ چاپ آنکھیں موند لیں۔ ”چلو اٹھو، میں مہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں۔“

”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔“ اس کی تھکی تھکی آواز ابھری تو طارق نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں جانتا ہوں۔ تم کتنی ضدی ہو۔“

”کیسی ضد اور کہاں کی ضد۔ جب لاڈ اٹھانے والے چلے جائیں تو ضد بھی ان کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔“ اس کی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو رہے تھے۔ اسے شدت سے نا نوایا آ رہی تھیں۔

اس کے آنسوؤں سے طارق کے دل پہ بوجھ سا پڑا۔ وہ نادم تھا۔ مگر مجبور بھی۔ ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کی غرض سے مسکرا کر بولا۔

”میں ہوں نا تمہارے لاڈ اٹھانے کے لیے۔“ حور نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے طارق کے منافقانہ رویے کا گہرا رنج تھا۔

طارق نے محبت سے اس کے آنسو اپنی انگلیوں سے سمیٹے اور گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں ماما کی طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں۔ حور! ہمیں معاف کر دو۔“ حور کی سماعتوں میں طارق کے لفظ کسی سیسے کی طرح پڑے تھے۔ وہ بلک بلک کر رو پڑی۔ طارق نے بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا۔

”مجھے ماما کے رویے کا تم سے زیادہ رنج ہے حور۔۔۔! اس لیے نہیں کہ میں نے کبھی اپنی طرف سے انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی بلکہ اس لیے کہ وہ میری ماں تھیں۔ ماں کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ ان کا ظرف تھا۔۔۔ مگر میرا ظرف گوارا نہیں کرتا کہ اپنی ماں کو پیشیمان ہوتا دیکھوں۔ زندگی کا ایک براسا ختم سمجھ کر ہمیں اس واقعہ کو بھلانا ہوگا۔“

حور، طارق کے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رو پڑی۔



”چار دن ہو گئے ہیں ولید کو گھر آئے ہوئے، اس سے پہلے چار دن وہ اسپتال میں رہا۔ تب بھی

آپ اصباح کو لے کر نہیں آئے اور آج گھر پر بھی آئے تو اکیلے ہی چلے آئے۔“
 ”کیا کرے گی اصباح اس وقت آکر۔ ولید کو آرام کی ضرورت ہے۔“ وقار کی لاپرواہی پہ دلشاد کو دکھ ہوا۔

”مانا کہ ولید نے اصباح کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ لیکن اصباح کا بھی تو کچھ فرض بنتا تھا۔ اس وقت اسے ولید کے پاس ہونا چاہیے تھا۔“
 ”دیکھو۔۔۔ دلشاد! تمہیں پتا ہے اصباح بہت نازک احساسات کی مالک ہے۔ وہ بہت ناز و نعم میں پلی ہے۔ ولید کے رویے سے اسے شدید دھچکا لگا ہے۔ فی الحال تم اصباح کا ذکر نہ ہی چھیڑو تو اچھا ہے۔“

”صاف کہوں بھائی جان! آپ نہیں چاہتے اصباح، ولید کی خدمت کرے۔ کیونکہ آپ ولید کو اس لائق ہی نہیں جانتے کہ اصباح اس کی ناز برداریاں کرے۔“
 (یہ تو میری غلط فہمی تھی کہ میں نے ولید کو اصباح کے لائق جان لیا تھا۔) وقار کی چبھتی نگاہیں دلشاد سے چھپی نہ رہ سکیں۔

”کاش! مجھے پہلے پتا ہوتا تو میں ہرگز۔۔۔ بھی۔۔۔ یہ رشتہ نہ جوڑتا۔“
 وقار نے پچھتاوے سے مکا تھیلی پہ مارا۔ دلشاد سے برداشت نہ ہوا۔
 ”ایسی کون سی قسمت آگئی بھائی جان! لڑکیوں کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ میری دل آویز کو لے لیں۔ کتنے ناز و نعم میں پلی تھی۔۔۔ مگر سسرال میں کیا کچھ نہیں سہ رہی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسے یہیں بٹھالیں۔ آپ نے تو حد کر دی۔ ابراہیم کیا کیا طعنے نہ دیں گے۔ آپ خود سوچیں۔ کس قدر شرمندگی کا سامنا ہے مجھے۔“ دلشاد رونے لگیں۔ وہ جذباتی بلیک میلنگ سے بھائی کو قابو میں کرنا چاہ رہی تھیں۔
 وقار بخیرگی و متانت سے بولے۔

”پورے تین سال سے بیٹھی ہے دل آویز آپ کی چوکھٹ پر۔ کسی بھی بات سے بے خبر نہیں ہوں میں اور جب اس کے گھر کے حالات سدھر گئے تب ہی آپ نے اسے بھیجا۔ اصباح بھی آجائے گی۔ ہماری تو آپس کی ہی بات ہے۔ آپ اصباح کی فکر چھوڑیں۔ ولید کی عادتوں پہ توجہ دیں۔“
 وقار خشک سے انداز میں کہہ کر اٹھ گئے تو دلشاد کا منہ کھلے کا ٹھلارہ گیا۔

کتنا ارمان تھا انہیں اصباح کو بیاہ کر لانے کا۔ ولید تو تھا ہی برا، آوارہ اور غیر ذمہ دار۔ لیکن تھوڑا سا صبر کر لیتی تو کون سا عذاب آجاتا۔ آخر ہم بڑے بیٹھے ہی تھے۔ اصباح سے کئی درجہ بہتر تو حور ہے، جس نے بھی گھر کی چار دیواری سے باہر بات نہیں نکالی۔ کیا کچھ نہیں ہوا اس کے ساتھ۔ مگر اس کے قدم اس گھر سے باہر نہیں نکلے۔ حالانکہ اس کا بھی باپ زندہ ہے۔ اس کے والد بھی اسپتال میں ولید کی احوال پر سی کر نے آئے تھے۔ پھر شادی میں بھی شریک ہوئے ہیں۔ ان کے کسی بھی عمل سے کوئی رنجش ظاہر نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب ہے کہ حور نے انہیں اس گھر کی کوئی بات نہیں بتائی۔ اسے میرے طارق سے اتنی محبت ہے کہ وہ اس کے لیے زہر کا پیالہ بھی چپ چاپ پی جائے گی۔

دلشاد کو دل ہی دل میں اس کی محبت پہ رشک آیا تھا۔۔۔

جبکہ اصباح۔۔۔ اصباح نے ہماری محبت کو محسوس ہی نہیں کیا۔ کتنا جاہلی تھی میں اصباح کو۔۔۔ صرف اصباح کی وجہ سے طارق سے زیادہ ولید کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ کیا یہ نمایاں تبدیلی بھائی جان اور بھابھی کو نظر نہیں آئی۔ کیسے طعنہ دے گئے بھائی جان کہ میری بیٹی تین سال میری چوکھٹ پہ بیٹھی رہی ہے۔ آہ! غیروں نے طعنے نہ دے پر اپنوں نے۔۔۔ روح لہو لہان کر دی۔ دلشاد پچھتاؤں کا شکار ہو رہی تھیں تب ہی دل آویز اور دلنشین کمرے میں داخل ہوئیں۔ طارق بھی پیچھے آگیا۔

”ماما! ہم سوچ رہے تھے ہم اصباح سے ملنے چلے جائیں۔“

”کیوں؟“ دلشاد کی یک دم تیوریاں چڑھ گئیں۔

”ماما! ایسے ہی۔“ دلنشین نے بے نیازی سے کا ندھے اچکائے۔

”کوئی نہیں جائے گا، اس سے ملنے، اسے تو پروا نہ ہوئی کہ آکر شوہر کی خبر گیری کرے کیا ہوا ہے اسے جو تم اسے پوچھنے جا رہی ہو۔“ دلشاد کا رویہ دونوں بہنوں کے لیے حیران کن تھا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما! انہیں ماموں کے گھر جانے دیں۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے طارق تمہارا۔۔۔ میں نے وہاں بیٹا بیابا ہے بیٹی نہیں۔ شوق سے رکھیں بھائی جان اپنی بیٹی کو۔۔۔ اب میں بھی بھی۔۔۔“

”ماما پلیز۔“ طارق نے احتجاج کیا۔ پھر جھجلا کر بولا۔

”پلیز ماما! ہم نے ولید کا نام ماموں کے گھر نبھانے کے لیے جوڑا تھا۔ توڑنے کے لیے نہیں۔۔۔ جب تک ولید کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو جاتی یہ لوگ ادھر آئی جاتی رہیں تو اچھا ہے۔ اس طرح اصباح کو احساس ہوگا کہ ہم اس کے ساتھ ہیں۔“

طارق کی بات پہ دلشاد سنج پا ہو گئیں۔ ”اصباح کو ہماری کون سی پروا ہے۔ ولید کی تو وہ شکل ہی نہیں دیکھنا چاہتی۔ میرا ہی بیٹا نالائق تھا جو مجھے سر جھکا نا پڑ رہا ہے۔ ورنہ بھائی جان کی کتنی خواہش تھی میرے گھر رشتہ کرنے کی کیا میں جانتی نہیں۔“

”آپ اس طرح جذباتی ہوں گی تو ولید اور بھی بدظن ہو جائے گا۔“ طارق ماں کو سمجھا رہا تھا۔ ”ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں۔ آپس کی رشتہ داری میں تنازعہ ہوگا تو پورے خاندان میں بات پھیلے گی۔ آپ انہیں اصباح سے ملنے جانے دیں۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں کے آنے جانے سے ماموں، اور ممانی کے خیالات تبدیل ہو جائیں۔“

طارق نے بالکل صحیح مشورہ دیا تھا۔ لیکن دلشاد کے دل سے بھائی کا وہ رویہ نہیں مٹ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے ولید اس حالت کا شکار ہوا تھا۔۔۔ انہوں نے ولید کو بے عزت کر کے گھر سے نکالا تھا۔ اگر ولید کو زیادہ نقصان پہنچ جاتا تو اس کا ذمہ دار کون ہوتا؟ وہ طارق پہ بگڑ گئیں۔

”طارق! تم ہر ایک کی وکالت نہ کرو۔۔۔ مجھ میں بھی عقل ہے۔۔۔ میں خوب جانتی ہوں اپنے بھائی کو۔ دیکھ لوں گی۔“

طارق زچ سا ہو کر کمرے سے نکل گیا۔ باہر نکلا تو باپ سے ٹکراؤ ہو گیا۔
 ابراہیم صاحب کے چہرے پہ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اپنی اسٹڈی میں چلے گئے تو طارق بھی
 الجھتا ہوا سالان کے پیچھے پیچھے آ گیا۔
 ”کیوں خواخواہ اپنا وقت اور انرجی ضائع کر رہے ہو طارق!“

ابراہیم صاحب نے لا پرواہی سے کتاب کھولی اور راکنگ چیئر سے ٹیک لگالی۔
 ”یہ سب کچھ تو ہوتا تھا اور ایسا ہوا۔ چلو ہو گیا۔ تمہاری ماں کی سمجھ میں سیاہ و سفید کا فرق تو آئے گا۔
 کچھ ان کے بھائی صاحب سمجھا دیں گے۔ اور کچھ بیٹا۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ سچی میں بھی گن ہیں۔۔۔ ذرا
 اسے یہاں آ کر بیٹے تو دو۔۔۔ حور کی قدر آ جائے گی ان لوگوں کو۔“ باپ کے خیالات پہ طارق گم صم سا
 رہ گیا۔

”حور العین میرا انتخاب تھی نا۔ اس لیے بری تھی۔ وہ سر کے بل بھی کھڑی ہو جاتی تو تا عمر بری ہی
 رہتی۔ اس لیے میں نے تمہاری ماں کو موقع دیا کہ وہ بھی اپنا انتخاب آزمائیں۔ دو ہی دن میں مزا چکھ لیا
 ہے نا۔“

ابراہیم صاحب نے کتاب میز پہ ڈال دی اور پشت سے ٹیک لگا کر بولے۔
 ”میں اس معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا۔ اس مسئلہ کو تمہاری ماں ہی حل کریں گی اور تم طارق
 درمیان میں نہیں بڑو گے۔“

ان کا لہجہ جتنی تھا۔ طارق حیرانی سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔
 ”کم آن طارق مطمئن رہو۔ اب میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ حور اب کبھی کسی سازش کا شکار نہیں
 ہوگی۔“

ان کے الفاظ تھے یا حور کی گواہی کا پروانہ۔۔۔ طارق کے حواس گم ہونے لگے۔
 ”میں کبھی حور العین نے بدگمان نہیں ہوا۔ اب مجھے دکھ ہے حور اس سازش کا شکار ہوئی۔ صرف
 اپنی نادانی کی وجہ سے۔۔۔ خیر۔۔۔ یہ ایک بھیانک خواب تھا۔ جسے ہم بھلا چکے ہیں۔۔۔ اور تم بھی
 بھلانے کی کوشش کرو۔“

انہوں نے طارق کا کندھا تھپتھپایا تو طارق پہلی بار بولا تھا۔
 ”مگر اس بھیانک خواب کو وہ تو نہیں بھولتی۔“
 ”بھول جائے گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ۔۔۔ تمہاری محبت اور توجہ۔ اسے یہ سب کچھ بھلا دے
 گی۔“

ابراہیم صاحب نے اطمینان سے بیٹے کو یقین دلایا۔۔۔ تو طارق۔۔۔ پوچھے بنا رہ سکا۔
 ”کیا سچائی آپ یہ بھی کھل گئی ہے؟“ بیٹے کی بات پہ ابراہیم صاحب کے چہرے پہ پُر تاسف سی
 مسکراہٹ آئی اور معدوم ہو گئی۔
 ”کسی بھی سچائی اور گواہی کی ضرورت تمہیں ہوگی طارق! مگر مجھے نہیں۔ مجھے حور پہ مکمل بھروسہ تھا۔
 ہے اور رہے گا۔ اس کے باوجود میں نے خاموشی صرف اس لیے اختیار کی۔۔۔ کہ مجھے تمہاری ماں کے

رویے نے گہرے رنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر میں حور کے کردار کی صفائی دیتا تو تمہارے اس کے درمیان شاید اختلافات نہ ہوتے۔ البتہ تمہاری ماں کی حور سے دشمنی بڑھ جاتی۔“ وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولے۔ طارق آہستگی سے بولا۔

”مگر حور کہتی ہے کہ ماما اس کی بے گناہی کا اعتراف کریں گی۔ وہ تب ہی اس گناہوں نے واقعے کو بھلا سکے گی۔ اب آپ ہی بتائیں، میں ماما کو کیسے ڈیفینڈ کروں۔“

طارق کی بات پہ ابراہیم گہری سوچ میں مبتلا ہو گئے۔

ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔



”آئے دن اخبارات ایسی خبروں سے بھرے پڑے رہتے ہیں نہ جانے والدین اور خصوصاً مائیں اس قدر غافل کیوں ہیں اپنی اولاد سے۔ جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تب واویلا مچانے لگتے ہیں۔ یہ دیکھیں یہ لڑکی۔۔۔ معمولی خاندان کی نہیں ہے۔ اب گھر بیٹھے بٹھائے تو گینگ ریپ نہیں ہو گیا اس کے ساتھ۔۔۔ لڑکی کے برے لوگوں کے ساتھ تعلقات ہوں گے تو یہ معاملہ اس سطح پہ پہنچا ہے۔ اخبار والوں کو موضوع مل جاتا ہے بیٹی کی آبرو تو واپس نہیں آ سکتی۔“

مسز باسط نے غیر دلچسپی سے اخبار ایک طرف پھینک دیا۔ پھر گرم صم بیٹھی دلشاد کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔

”کیا بات ہے مسز ابراہیم! آپ آج بہت چپ چپ سی لگ رہی ہیں۔“

دلشاد نے سرسری سی نگاہ مسز باسط پر ڈالی۔ پھر کہنے لگیں۔ ”میں اپنے بیٹے کی وجہ سے ڈسٹرب ہوں۔“

”کیا ہوا اس کی طبیعت ابھی تک نہیں سنبھلی؟“

”طبیعت تو اس کی پہلے کی نسبت بہت بہتر ہے لیکن۔۔۔“ دلشاد نے بات ہونٹوں میں ہی روک لی۔ وہ اپنے گھر بیٹو افیئر ز اپنی کولیکز سے ڈسکس نہیں کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے کسی کو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ان کا بیٹا تو خود بے راہ رو کی کا شکار ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی نو بیاہتا بیوی میکے میں بیٹھی ہے۔ اس مسئلے کا حل دلشاد کو کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ طارق اور ابراہیم کی دلچسپی بھی اس معاملے میں صرف تھی۔

تب ہی تنظیم کی دوسری خواتین کمرے میں آ گئیں اور مسز باسط ان سے باتوں میں لگ گئیں۔

دلشاد ابھی ہوئی تھیں۔ ولید نے آج بات ہی ایسی کی تھی۔۔۔ جوان کے ہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

”یہ دیکھیں مسز ابراہیم! یہ ہے ہمارے سیمینار کا موضوع۔“ انہوں نے دلشاد کے سامنے ایک فائل رکھی۔

”آزاد میڈیا کے دور میں فلاحی تنظیموں کے کردار، مظلوم خواتین کو کمرشل زکر کے کچھ تنظیمیں خود کو اور میڈیا کو فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ ان ہی حالات کی حوصلہ شکنی کے لیے ہماری تنظیم گرلز اسکول و کالج اور

یونیورسٹیوں میں ایسے موضوعات پر پروگرام منعقد کرائے گی جس سے نوجوان نسل آگہی بھی حاصل کرے اور عبرت بھی۔ اپنے خیالات و افکار کے لحاظ سے یہ ملک کی واحد تنظیم ہوگی جو بگڑنے سے قبل اس قوم کی بیٹیوں کو سنوارے گی۔ اور ان چہروں کی نشان دہی کرے گی جو نئی نسل کو برائی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اور جن میں سرفہرست ہے لیبل، انٹرمیٹ اور موبائل فون۔“ مسز باسط نے فائل بند کر دی اور بولیں۔ ”آپ لوگ دیکھیے گا کتنی جلدی ہماری تنظیم ملک میں نمایاں مقام حاصل کرتی ہے اور کوئی بعید نہیں یہ سیمینار اس قدر پسند کیے جائیں گے کہ کئی وی چینل پر بھی ان کی کوریج ہونے لگے۔“

دشاد بھی اس حکمت عملی پہ مسکرائی تھیں۔
 مسز باسط اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت خاتون تھیں اور یہ تنظیم انہی کے سرپرستی میں چل رہی تھی۔
 ان کی حکمت عملیوں نے تنظیم کی خواہش کو ہمہ وقت سرگرم عمل کر دیا تھا۔



یونیورسٹی میں سالانہ تقریبات منعقد کی جا رہی تھیں۔ ملک کے معروف سنگرز گروپ کی آمد نے پوری یونیورسٹی میں کئی روز سے ہانچل مچا رکھی تھی۔
 آج اس تقریب میں ہر ایک کی تیاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دلنشین گھر سے تو قیص شلوار ہی پہن کر آئی تھی۔۔۔ لیکن یہاں آکر اس نے ٹاپ اور جینز پہن لی تھی۔ جو وہ اپنے مینڈیک میں رکھ کر لائی تھی۔

برہنہ بازوؤں پہ لڑکیاں بیٹھو بخوار ہی تھیں۔ وہ بھی اپنی دوستوں کے ہمراہ اس اسٹال پر آگئی تھیں، جہاں سب سے زیادہ رونق تھی۔ اس رونق میں دو آنکھیں اسے بڑی محویت سے تک رہی تھیں۔

یہ ٹکیل باجہ تھا۔۔۔ وہ نظر انداز کر کے وہاں سے نکل گئی اور یہ بھول گئی ٹکیل باجہ نے اسے قیص شلوار میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے کپڑے کہاں چنچ کیے اور اب وہ جائے گی تو اپنا لباس تبدیل کر کے جائے گی۔

ٹکیل نے اپنے ساتھیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ ٹکیل کا ایک ساتھی سائے کی طرح دلنشین کے گروپ کے ساتھ ساتھ تھا اور وہ صرف ٹکیل ہی نہیں، دلنشین کا بھی تو دوست تھا۔
 فنکشن کے اختتام پہ اس نے کپڑے ہر صورت میں بدلنا تھے اور وہ جگہ کون سی ہو سکتی تھی۔
 یونیورسٹی کے ہاتھ روم، آڈیٹوریم ہال کا ڈریسنگ روم یا کوئی بھی کلاس روم۔



رات دیر سے سونے کی وجہ سے وہ دوپہر میں سو کر ابھی تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ عباد کے گھر والے یعنی اس کی والدہ اور بہنیں آئی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں عباد کی دونوں بہنیں اس کے پاس آگئیں۔ وہ شرمندگی سے بستر سے اٹھ گئی۔ ان سے ملی اور منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے واش روم میں جانے لگی تو اس کے موبائل کی بیل بجی تھی۔

فون جو اٹھایا تو مس کال تھی۔ مس کال کے فوراً بعد اسے مسیج ریسیو ہوا۔ اور یہ مسیج دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ اور چھت سر بر آن پڑی۔ ٹاپ اور جینز میں اس کی تصویر موبائل اسکرین پر جگمگا رہی تھی۔ رات کا فنکشن اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ بہ دقت تمام خود کو سنبھالتے کپکپاتے وجود کے ہمراہ وہ واش روم میں کھس گئی۔ اور اس مسیج کو ڈیلیٹ کر دیا۔ فی الحال تو اسے بس یہی سوجھ سکا تھا۔ ابھی پیکچر مسیج ڈیلیٹ ہی کیا تھا کہ دوسری پیکچر اسکرین پہ چمکنے لگی۔ وہ تصویر بھی یا قیامت، اس کے ہاتھ سے موبائل چھوٹا لیکن پاش پاش نہ ہوا۔ اس کی برہنہ تصویر اسکرین پہ جگمگا رہی تھی۔ دلنشین نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا اور آنکھیں پچھی کی پچھی رہ گئیں۔

نہ جانے کتنی دیر وہ سکتے کی حالت میں رہتی کہ باہر سے دروازہ بجنے لگا۔ کوکب اور عمرانہ اس کی ہونے والی نندیں اسے ہاتھ روم میں دیر لگانے کو شرارت سمجھ رہی تھیں۔
 ”دلنشین! بھی یہ کیسا مذاق ہے۔ ہمیں کمرے میں بٹھا کر تم واش روم میں جا کر بیٹھ گئیں۔ اگر تمہارا وہاں دل لگ رہا ہے تو ہم بھی آ جاتے ہیں۔“ وہ دونوں ہنس رہی تھیں اور دلنشین کی جان پہ بن رہی تھی۔

کئی روز ہو گئے تھے۔ پھر اسے نہ کوئی مسیج اور نہ ہی کوئی مس کال آئی، وہ بہت پریشان تھی۔ آخر یہ حرکت کون کر سکتا ہے؟ وہ چاہتے ہوئے بھی اس واقعہ کو بھلا نہیں پارہی تھی۔ فنکشن کے بعد جب وہ پہلی بار یونیورسٹی گئی تو اسے لگا جیسے ساری آنکھیں اسے برہنہ دیکھ رہی ہیں۔ وہ ڈری ڈری نگاہوں سے چاروں جانب دیکھ رہی تھی کہ شکیل باجوه اس کے سامنے آ گیا۔
 ”بائے دلنشین!“ وہ اچھل پڑی۔ پھر خود کو سنبھال کر ایک طرف ہو گئی۔

”فنکشن والے روز تم بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ پھر نہ جانے بعد میں تم نے کپڑے کیوں تبدیل کر لیے تھے۔“ یہ کہہ کر شکیل نے تہقہہ لگایا اور اس کے سامنے سے چلا گیا۔ دلنشین جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔



”کہاں جا رہے ہو ولید؟“ اسے تیار ہو کر گھر سے نکلتا دیکھ کر دلشاد نے راستے میں روک لیا۔
 ”میں پہلے بھی بتاتا آتا جاتا تھا اور اب بھی آپ سے یہی گزارش کروں گا کہ میرا راستہ نہ روکا کریں۔“
 ”مجھے کیا ضرورت ہے۔ تمہارا راستہ روکوں۔ میں تو یہ جانا چاہتی تھی کہیں تم اصباح کو لینے تو نہیں جا رہے؟“

”ایک بات سے آپ مطمئن ہو جائیں۔ میری زندگی میں اصباح کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دلشاد کے مقابل کھڑا ہو گیا۔
 ”لیکن۔۔۔ وقار احمد۔۔۔ میری حیثیت اور اہمیت کو چیلنج کر چکے ہیں۔ اور اب مجھے انہیں۔۔۔ دواب لوٹانا ہے۔“ دلشاد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”تو تم بھائی جان کی طرف ہی جا رہے ہو؟“

”خدا کے واسطے ولید! میری عزت کا جنازہ مت نکالو۔ میں بھائی جان کی منت سماجت کر کے اصباح کو لے آؤں گی۔“

”میں بے وقوف نہیں ہوں ماما! اور آپ منت سماجت کیوں کریں گی۔ وقار احمد خود اپنی بیٹی کو چھوڑ کر جائیں گے۔“ وہ بے رحمی سے مسکرایا تو دلشاد اس کے پاگل پن پہ خوف زدہ ہو گئیں۔

”میں اپنے بھائی کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر تم نے ان سے بدتمیزی کی تو وہ اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیں گے۔“

”انا!“ ولید ہنس پڑا۔ (اصل میں یہ جنگ انا کی ہی تو ہے) ”آپ کیا سمجھتی ہیں۔ کیا اب انہوں نے اس معاملے کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ وہ کون ہوتے ہیں یہ بات کہنے والے، ولید سدھرے گا تو ان کی بیٹی ولید کے ساتھ زندگی گزارے گی ورنہ نہیں۔“

”ان کا مطالبہ ناجائز بھی نہیں ہے ولید! اگر تم نے یہ سب کچھ کرنا تھا تو مجھے دھوکے میں کیوں رکھا۔ ایک طرف تم اصباح کی زندگی سے کھیل رہے ہو اور دوسری طرف تم نے میری عزت کا جنازہ نکال رکھا ہے۔“

”عزت۔۔۔“ اس نے لفظ دانتوں میں چبایا۔ ”عزت۔۔۔ صرف آپ کی ہی ہے۔ میری عزت نہیں تھی۔“ ولید ہنرک گیا۔ ”کس طرح آپ نے ایک مقدس اور حساس رشتے کو گندگی میں لپیٹا اور آج تک آپ کو اپنے جرم کا، اپنے گناہ کا احساس بھی نہیں ہوا۔ آپ تو اپنی زندگی میں مگن ہو گئیں۔ مگر آپ کو احساس ہے کہ میں دن رات کیسے جلا ہوں۔ اس الزام پہ میری غلطی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر آپ زیادہ دیر اپنا چہرہ نہیں چھپا سکتیں ماما! رانی اور شیر خان نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے کہ آپ نے انہیں روپوش ہونے کا حکم دیا تھا۔“

دلشاد کے سر پر برم پھٹا تھا۔

”آپ کو حورائیں سے نفرت تھی۔ مجھ سے تو نہیں۔“

دلشاد دیک دم خجالت و خفت سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”میں طاری نہیں ہوں ماما! جو یہ سب کچھ بھول جاؤں گا۔ نہ میرے اندر اتنا ظرف ہے۔ میرا وقار احمد سے کوئی دشمنی نہیں۔۔۔ میں نے تو اصباح سے شادی ہی اس لیے کی تھی کہ آپ کو آپ کی غلطی کا احساس دلا سکوں۔“

وہ بے رحم انداز میں ماں کو جتا رہا تھا۔ پھر وہ ایک منٹ بھی دلشاد کے سامنے نہیں رکا اور وہاں سے باہر نکلتا چلا گیا۔ دلشاد کو لگا جیسے ان کے پورے وجود کا دم نکل گیا ہو۔ وہ بے جان ٹانگوں سے خود کو سنبھالتا وہیں صوفے پہ ڈھیر ہو گئیں۔ شرمندگی و ندامت کا پسینہ ان کی پیشانی پر چمک رہا تھا۔

ولید نے مجھ سے بہت بڑی چال چلی ہے۔ اگر اصباح درمیان میں نہ ہوتی تو یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ لیکن اب یہ کسی کی عزت کا خیال نہیں کرے گا۔

دلشاد کی تھیلیاں پسینے سے بھگ گئیں۔ تو گویا اس روز۔۔۔ ولید نے رانی اور شیر خان کا ذکر یوں

نہیں چھیڑا تھا۔ دلشاد نے ایک بار پھر پسینہ اپنے چہرے پہ سے صاف کیا تھا۔
 دلشین یونیورسٹی نہیں جا رہی تھی۔ وہ دوہری کیفیت کا شکار تھی۔ آیامام کو بتائے یا چھپائے، چھپانے سے مسئلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کئی دن تک فون آف کیے رکھا۔ لیکن جب کھولا تو پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور باقاعدہ دھمکیوں کے ساتھ، اگر اس نے فون یا اسم بند کر دی تو وہ یہ تصاویر اس کے گھر والوں تک پہنچا دے گا۔ اس بات سے وہ اس قدر خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اس کی راتوں کی نیندیں اور دن کا چین غارت ہو کر رہ گیا تھا اسے کوئی راستہ نہ بچھائی دیتا تھا۔ تب ہی دلشاد اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

”مجھے ولید نے دن رات کی اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ محال ہے جو کسی اور طرف دھیان بھی ہونے دے۔“

”باجی چاہ رہی تھیں تمہاری اور عباد کی ایک ملاقات ہو جائے۔“

”میری! دلشین کو تعجب ہوا۔“

”ہاں۔ تمہاری اور عباد کی ملاقات ہونا بھی چاہیے، میں نے تمہارے بابا سے ذکر کیا تھا۔ انہیں تو بہت اچھی لگی عباد کی ایسی سوچ۔۔۔ کہہ رہے تھے کوئی دن رکھ لیتے ہیں، عباد کو بھی ڈنر پر انوائٹ کرتے ہیں۔ میں نے کہا پہلے میں ڈشی سے پوچھوں گی۔ تم بتاؤ۔ تمہاری کیا رائے ہے؟“

”مم۔ میری رائے؟“ دلشین کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔

”ہاں۔ ڈشی! تمہاری رائے، کیونکہ زندگی تمہیں گزارنی ہے۔ ہم نے نہیں۔ عباد تمہاری رائے جانتا چاہتا ہے۔ پھر تم تو ایجوکیشن حاصل کر رہی ہو۔ وہ تمہارا کزن بھی ہے۔ تمہیں تو کسی بھی قسم کی گھبراہٹ نہیں ہونی چاہیے۔“

”مگر۔۔۔ ماما۔۔۔! دلشین کی گھٹن بڑھنے لگی۔

”ماما! فی الحال تو میں عباد سے نہیں مل سکتی۔“

”مگر۔۔۔ کیوں۔۔۔؟“

”پتا نہیں۔۔۔ فی الحال میں بہت ڈسٹرب ہوں۔ نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے۔“

دلشین کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ دلشاد نے چونک کر دیکھا اس کا چہرہ مرجھار ہا تھا اور آنکھیں بھی سوج رہی تھیں۔

دلشاد یہی نتیجہ اخذ کر سکیں۔ شاید ایگزیم کی وجہ سے وہ آج کل ڈسٹرب ہے۔ ”اس سے قبل تو تم نے بھی امتحانوں کو خود سوا نہیں کیا۔ تمہارا حلیہ کیسا عجیب ہو رہا ہے۔“

دلشین سوچنے لگی۔ اگر ماما نے زیادہ استفسار کیا تو انہیں ابھی بتا دے گی۔ لیکن جب معمول دلشاد کا فون بج گیا۔ اور وہ بات کرتے کرتے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ شاید فون ان کی کسی کو لیگ کا تھا۔ دلشین بے چینی سے انگلیاں مروڑنے لگی۔



اس کا سیل فون مسلسل بج رہا تھا۔ لیکن اس میں ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ اینڈ کر سکے۔ یہ وہی فون کا لٹھی جو اسے مسلسل پچھلے کئی روز سے بلک میل کر رہی تھی۔ تھک ہار کر اس نے فون اینڈ کر لیا۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم راحیل کے گھر آئی تھیں۔“
 دلشین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پھر بھی وہ ڈپٹ کر بولی۔
 ”تم کون ہوتے ہو، میری جاسوسی کرنے والے۔“

”راحیل ہمارا ہی کارندہ ہے۔ اور یہ جو سب کچھ ہم تک پہنچا، صرف راحیل کی مدد سے۔“
 اس انکشاف نے دلشین کے پیروں تلے زمین چٹخ لی۔
 ”وہ بھی بے چارہ کیا کرتا۔ خود جو پھنسا ہوا تھا۔“

یہ کہہ کر ٹکیل باجوه نے قہقہہ لگایا۔
 کل وہ راحیل سے سارا معاملہ ڈسکس کر کے آئی تھی۔

راحیل نے اسے تپلی دی تھی۔ وہ اسے اس مصیبت سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور اس کا صرف یہی حل ہے کہ اس شخص سے ملنا ہوگا اور وہ بھی اب یہی شرط رکھ رہا تھا۔
 ”آخر تم چاہتے کیا ہو مجھ سے؟“ وہ زچ ہو کر رو پڑی۔

”صرف ایک ملاقات، ایک بہت خاص ملاقات، بہت تنہا اور ساری عمر یاد رہ جانے والی ملاقات۔“
 دلشین اتنی نا سمجھ نہیں تھی کہ اس بات کا مطلب نہ سمجھتی۔

”دیکھو۔۔۔ میں تم سے اکیلے میں نہیں مل سکتی۔ تم میری تصویریں واپس کر دو۔۔۔ تم جانتے ہو میری ماما۔۔۔ ابن جی او میں ہیں۔ تمہیں پریس میڈیا میں لے آئیں گی۔۔۔ اور تمہارے عزائم دھرم کے دھرم رہ جائیں گے۔“

ٹکیل باجوه ہنس پڑا۔ ”بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا، میری فکر نہ کریں۔ محترمہ! کچھ اچھے بارے میں بھی سوچیں۔ کتنی شرمندگی ہوگی تمہاری مدد کو یہ جان کر۔ جس مشن یہ وہ کام کر رہی ہیں۔ وہ الہ کے گھر میں ہی ناکام ہو گیا ہے۔ کیا حیثیت رہ جائے گی اپنی کو لیگز اور پریس کی نظروں میں ان کو اور پھر آپ۔۔۔ آپ تو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گی۔ پتا ہے تمہارا ایک بھائی ہمارے جیسے شوق رکھتا ہے۔ اگر یہ تصویریں اڑ کر اس کے فون میں چلی گئیں۔ تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”شٹ اپ!“ کانپتی آواز سے چلائی۔ اس کی ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔ مگر ٹکیل باجوحاموش نہیں ہوا۔ اسے مسلسل ٹارچر کر رہا تھا۔

”اور تمہارا منگیتز جس کے نام کی تم انگوٹھی پہنے پھر رہی ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرے گا کہ تم۔۔۔ انگوٹھی واپس لے لے گا۔ البتہ خاندان میں بات ضرور پھیل جائے گی۔“

قتیبہ لگا کر اس نے فون بند کر دیا۔ دلنشین ستائے میں آگئی۔

”طارق۔۔۔ طارق بھائی!“ اس کے کپکپاتے ہونٹوں سے نکلا اور آنسو آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ طارق کی لہجہ میں اور پابندیاں یاد آرہی تھیں۔ پھر ماما، بابا کا طارق کے ساتھ زیادتی کرنا اور طارق کا اس سے لا پرواہو جانا اگر ایسا نہ ہوتا تو سب سے پہلے وہ طارق بھائی کا ہی دروازہ کھٹکھٹاتی۔ کیونکہ اس میں برداشت، دور اندیشی اور مصلحت سب سے زیادہ تھی۔۔۔ مگر اس نے اپنی ناعاقبت اندیشی ہے اپنے سب سے بڑے محسن کو خود سے دور کر دیا تھا۔ صرف آزادی کی خاطر اور آج وہی آزادی اسے زہریلے سانپ کی مانند ڈس رہی تھی۔

”میں اپنی پہلی پاپی اپنی عزت پہ آج نہیں آنے دوں گی۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ چپ چاپ جان دے دوں گی۔“ اسے اس کے علاوہ کوئی محفوظ راستہ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی ماں کے کمرے میں گئی۔ بیڈ کی سائیڈ کی ڈرائز کھولی اور خواب آور گولیاں اٹھالیں۔ ابھی اس نے دراز نجی بند نہیں کی تھی کہ دلشاد کمرے میں داخل ہوئیں۔ دلنشین حواس باختہ ہو کر مڑی۔

”تم۔۔۔ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“ دلشاد نے حیرانی سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ دلنشین نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ وہ چونک گئیں۔ دلنشین کا چہرہ، آنکھیں اور حرکات غیر معمولی نہیں تھیں۔ ”کیا بات ہے دیکھی؟“ وہ اس کی طرف بڑھیں۔

”پلیز ماما! وہیں رک جائیں۔“ دلنشین رو رہی تھی۔ ”میں اپنی جان دے دوں گی۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ اس کے عزائم پورے نہیں ہونے دوں گی۔ وہ مجھے بلک میل کر رہا ہے۔ مجھ سے کہتا ہے وہ یہ تصاویر میرے باپ، بھائیوں تک پہنچا دے گا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے ماما۔ میں تو اسے جانتی تک نہیں۔“ دلنشین ہسٹریائی انداز میں کہتے ہوئے شیشی سے ساری گولیاں پھیلی میں ڈالیں پھر منہ میں ڈال لیں۔ دلشاد حواس باختہ کھڑی تھیں۔ پھر جیسے ان کے حواس جاگے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پہ تھپڑ مارا اور اس کے بعد کئی تھپڑ۔ دلنشین کچھ گولیاں نگل چکی تھی اور کچھ دلشاد نے اگلا لیں۔



اگر دلنشین وہ ساری ٹیبلٹ کھا لیتی تو ممکن ہی نہیں تھا کہ بچ پاتی۔ پھر فوری طبی امداد نے اسے موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا۔

گھر میں ہر ایک سراپا سوال تھا۔ آخر دلنشین نے خودکشی کرنے کی کوشش کیوں کی۔ دلشاد سکتے ہی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ وہ ہر آنکھ میں سوال تو دیکھ رہی تھیں۔ مگر کبھی زبان نہیں کھول سکتی تھیں۔ اس واقعہ نے دلشاد کو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔

ابراہیم صاحب کو بیٹیوں سے بہت محبت تھی۔ وہ دلنشین کی اس حرکت کو بالکل نہیں سمجھ پائے تھے۔ دلشاد بیگم سے بار بار پوچھ چکے تھے مگر دلشاد کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آج دلشاد کو اس ذلت کا سامنا تھا۔ جو انہوں نے حورالعین پہ اچھالی تھی۔ رات کو نہیں بدل بدل

کر دلشاد کا جسم دکھ گیا۔ مگر آنکھوں میں نیند نہ آئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

درحقیقت آج ان کا دل اعتراف کر رہا تھا کہ وہ اچھی ماں ثابت نہیں ہوئیں۔ ساری اولاد میں طارق ان کا میرے جیسا بیٹا تھا۔ اگر وہ اس کی ایک خوشی کی خاطر اپنے نفرت کے جذبے پر قابو پا لیتیں تو گھر کے حالات اتنے ہولناک نہ ہوتے اور آج جو کچھ ہو رہا تھا صرف ان کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ تھا۔ وہ بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگیں۔

”یہ جو رالین کا ہی تو صبر ہے۔ جو مجھ پر پڑ رہا ہے۔“ دلشاد کا دل گواہی دے رہا تھا۔ وہ بے چین ہو کر پھر بستر پہ آ گئیں۔ دلنشین نے وہ تصاویر دلشاد کو دکھائی تھیں۔۔۔ اور ساری سچائی سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اب انہیں انہی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ طارق نے توجہ دلائی تھی مگر انہوں نے طارق کو ہی برا بھلا کہہ کر چپ کر دیا تھا۔ اس وقت۔۔۔ دلنشین کا نوٹس لے لیا جاتا تو پانی سر سے نہ گزرتا۔

پوری رات آنکھوں میں کئی تھی۔۔۔ صبح ہی صبح وہ دلنشین کے کمرے میں آ گئیں۔۔۔ دلنشین سو رہی تھی۔ وہ کتنی کمزور لگ رہی تھی۔۔۔ دل آویز کی طرح۔۔۔ جس کے چہرے پہ خوشیوں کے سارے رنگ پھیکے ہی دکھائی دیتے تھے۔ دلشاد بیٹی کے سر ہانے جا بیٹھیں۔

”اس طرح بلیک میل کرنے والے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ مجھے اس مصیبت کا کوئی حل بھائی نہیں دے رہا۔ ابراہیم، طارق یا عباد کو بتاؤں تو ان کی غیرت کیسے گوارا کرے گی۔“

انہیں مسز باسٹ کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ ”گھر بیٹھے بٹھائے تو گینگ ریپ نہیں ہو گیا۔ لڑکی کے برے لوگوں کے ساتھ تعلقات ہوں گے تو معاملہ یہاں تک پہنچا ہے۔ بعد میں پھر والدین واویلا مچاتے پھرتے ہیں۔“

”میں کس طرح اس واقعے کو اپنی کولیگ تک لے جاسکتی ہوں کتنی بدنامی ہوگی ابراہیم کی اور میری۔“

دلشاد کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔ آج وہ اپنی ہی نظروں میں خود ذلیل ہو گئی تھیں۔



رات پھر ولید گھر نہیں آیا۔

”نہ جانے رات اس نے کیسے لوگوں کے ساتھ گزاری ہوگی۔ ایک بار ٹھوکر کھانے کے بعد انسان ان لوگوں کو چھوڑ دیتا ہے جو اسے نقصان پہنچا رہے ہوں۔ لیکن جان بوجھ کر اب وہ انتقاماً اپنی زندگی تباہ کر رہا ہے۔ اس سے کہو گھر آ جائے۔ میں نے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔“

ستا ہوا چہرہ اور غم ناک آنکھیں۔ طارق نے فکر مندی سے ماں کی طرف دیکھا۔ اور اٹھ کر ان کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔

”میں جانتا ہوں۔ ولید آپ کو بہت تکلیف پہنچا رہا ہے۔ لیکن ایسا تو وہ ہمیشہ کرتا آیا ہے۔ آپ اتنا فکر مند کیوں ہو رہی ہیں۔۔۔ اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیں۔“

وہ کتنی محبت سے دل جوئی کر رہا تھا۔ دلشاد کا دل بھر آیا۔
”تمہیں بھی تو مجھ سے گلہ ہوگا طارق؟“

دلشاد کا دل پھٹ گیا۔ وہ رونے لگیں۔ طارق پریشان ہو گیا۔ ماں کی پریشانی بے وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ دلنشین کی خوشی کی کوشش کا عمل معمولی نہیں۔ لیکن جب بابا نے کہا کہ دلنشین شروع سے ہی اس رشتے کو پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ تمہاری ماں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہوا ہے تو وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا تھا۔ لیکن اب اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ لیکن فی الحال تو اسے دلشاد کو سنبھالنا تھا۔ جواز رو قطار رو رہی تھیں۔

”آپ خود کو سنبھالیں ماما! آخر کون سی چیز ہے جو آپ کو اتنا کمزور کر رہی ہے؟“
”حورالعین کہاں ہے۔ اسے بلاؤ طارق!“ دلشاد خود کو سنبھال نہیں پا رہی تھیں۔
طارق اٹھا اور پانی کا گلاس بھر لایا۔

”آپ پانی تو پیئیں۔ حور گھر میں ہی ہے۔“ وہ ماں کو پانی پلانے لگا۔ تو دلشاد نے ایک گھونٹ لے کر گلاس رکھ دیا۔ اور پھر کھڑی ہو گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل آئیں۔ طارق ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

”حور سے کوئی کام تھا آپ کو؟ میں اسے یہیں بلا لیتا ہوں۔“

طارق نے ماں کے کپکپاتے وجود کو اپنے بازوؤں کا سہارا دیا۔ تو دلشاد کچھ نہیں بولیں۔ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ لاؤنج میں ہی حورالعین نظر آ گئی۔ دلشاد نے ندامت سے حور کی طرف دیکھا۔ اور پست لہجے میں بولیں۔
”حورالعین! میری بات سنو۔“

آج تک دلشاد نے اسے اس طرح نہیں پکارا تھا۔ حور اپنی جگہ ٹھک گئی۔ پھر حیران ہوتی ان کے نزدیک آ گئی۔

دلشاد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ بے چارگی و خفت سے اپنے لب کاٹ رہی تھیں۔ حور سر پٹا سوال بنی ان کے نزدیک آ گئی تھی۔

”میں نے اس روز تمہارے ساتھ جو کچھ کیا۔ سراسر ظلم تھا۔ تہمت تھی۔ بہتان تھا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ حورالعین! مجھے معاف کر دو۔“

انہوں نے بے ساختہ دونوں ہاتھ حور کے سامنے جوڑ دیے۔ حور حق و کھڑی رہ گئی۔ طارق نے ایک دم ماں کے دونوں جڑے ہاتھ پکڑ لیے۔ دلشاد بری طرح کانپ رہی تھیں۔ اگر طارق ان کے پیچھے نہ ہوتا تو وہ شاید چکر اکر گر جاتیں۔

آج سے پہلے حورالعین کو دلشاد اتنی کمزور اتنی ٹوٹی ہوئی نہیں لگی تھیں۔

”مجھے معاف کر دو حور!“ دلشاد کے لفظ تھے یا ایک بھاری پتھر۔ اس کے حواس سلب ہو گئے تھے اور

سماعتیں ایک ہی لفظ کو بار بار دہرا رہی تھیں۔ ”مجھے معاف کر دو حور۔“ مجھے معاف کر دو۔“

حور پٹنی پٹنی آنکھوں سے دلشاد کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی زبان گونگی ہو گئی تھی۔

”میں تمہیں صرف اس گھر سے نکالنا چاہتی تھی۔ رسوا کر کے۔ طارق کی نظروں میں ذلیل کر کے۔ لیکن آج میں خود ذلیل ہو گئی ہوں۔ میں ولید کی اور تمہاری مجرم ہوں، مجھے معاف کر دینا۔“ یہ کہتے کہتے دلشاد، طارق کے بازوؤں میں ڈھیر ہو گئیں۔

ولید جو ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا۔ اسی صورت حال پہ دنگ رہ گیا۔ حور کے حلق سے چیخ سی نکلی تھی۔

”ماما! ماما!“ اس نے طارق کے بازوؤں میں ڈلوتی دلشاد کو سہارا دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ولید دوڑتا ہوا آیا اور اس نے طارق کے ساتھ ساتھ اپنی ماں کو بھی گرنے سے

بچا لیا۔



”نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے میرے گھر کو۔ ایک کے بعد ایک مصیبت دوڑے چلی آرہی ہے۔“

ابراہیم صاحب مضحل سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ولید، دلشاد کے بستر سے لگا بیٹھا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ ان کے چہرے پہ زردی کھنڈر ہی تھی۔ وہ اتنی لمول اور فکر مند صرف اس کی وجہ سے تھیں۔ وہ دلشین کے معاملے سے بے خبر تھا اس لئے خود کو موروہ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ اس نے محبت سے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔ تب ہی دلشاد کی آنکھ کھل گئی۔۔۔ ٹینشن کی وجہ سے ان کا پی پی شوٹ کر گیا تھا۔ ڈاکٹر احمد انہیں انجکشن دے کر گئے تھے۔ طارق ان کی دوائیں لینے گیا ہوا تھا۔ دلشاد نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ولید یہ نگاہ بڑی توان کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ وہ وہی لفظ دہرانا چاہتی تھیں جو انہوں نے حور سے کہے تھے۔ لیکن ولید نے ان کے ہونٹوں پہ انگلی رکھ دی۔

”آپ ٹھیک ہو جائیں۔ مجھے کچھ نہیں سننا۔“ وہ بچوں کی طرح کہہ رہا تھا۔

”دلشین کہاں ہے؟“ ان کی بے چین نگاہیں بیٹی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

”وہ تمہاری طبیعت کی وجہ سے بہت ڈپر ہیں ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اس کے کمرے میں بھیج دیا ہے۔ تمہاری طبیعت سنبھل جائے تو وہ یہیں آجائے گی۔“ ابراہیم صاحب آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

اتنے میں حور نیم گرم دودھ کا گلاس لے آئی۔ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے اپنائیت اور محبت کا رنگ دیکھا تو ان کا دل ایک بار پھر نرمی کے بوجھ تلے دب گیا۔

”ماما! یہ دودھ پی لیں۔ طارق ابھی دوائیں لے کر آ رہے ہیں۔ پھر دوا لے لیجیے گا۔“

وہ ایک ہاتھ کے سہارے سے ان کو اٹھانے لگی تو انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور نرمی سے اپنے سہارے پہ اٹھنے لگیں تو ولید نے انہیں سہارا دیا۔ وہ نیم دراز ہو کر بیٹھ گئیں۔

طارق کمرے میں داخل ہوا تو حور دودھ کا خالی گلاس لے کر کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ طارق چپ چاپ ماں کی طرف بڑھا۔ اور انہیں دوا دے کر لٹا دیا۔ دلشاد نے آنکھیں موند لیں۔ طارق نے فکر

مندى سے باپ كى طرف ديكاواہ خود دل كے مريض تھے۔ اتنا دباؤ اور ڈپریشن ان كے ليے بھی صبح نہیں تھا۔

”بابا۔ آپ بھی جا كر آرام كر لیں۔ ماما كے پاس ہم لوگ ہیں۔“ ابراہیم صاحب تھكے تھكے قدموں سے اپنے كمرے ميں چلے گئے۔

اس كے بعد پھر طارق نے وليد كو بھی آرام كى غرض سے كمرے سے بھیج ديا۔ اب طارق اور دلشاد كمرے ميں اكيلے تھے۔



طارق رات دير سے كمرے ميں آيا تو حور فكر مندى سے جاگ رہى تھی۔ حور نے طارق كو اس سے قبل اتنا ڈسٹرب نہیں ديكا تھا جتنا اب وہ دكھائی دے رہا تھا۔ ماں كے منہ سے سارے حالات سن كر وہ زمين ميں گر گيا تھا۔ اگر اس كى جگہ وليد ہوتا تو گھر ميں ايك نيا تماشا لگ جاتا۔ وہ دلشين كو جان سے مار ديتا اور بابا۔۔۔

”كيا ہم ان سے چھپا سكيں گے يہ سب كچھ۔“ دل پر ايك بوجھ سالے كر وہ چپ چاپ بستر پہ ليٹ گيا تھا۔

”ماما نے وليد كے رويے كا بہت صدمہ ليا ہے۔ پھر دلشين۔۔۔“ طارق نے چونك كر حور كى طرف ديكا۔

”كيا حوا ہے دلشين كو؟“ وہ پہلے ہی بہن كے بارے ميں فكر مند تھا۔ وہ اس راز كو بيوى سے بھی چھپالينا چاہتا تھا۔ نہ جانے حور، دلشين كے بارے ميں كيا کہنے جا رہى تھی۔

”وہ بھی تو اس رشتے سے انكارى ہو گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے دلشين كسى اور كو پسند كرتى ہے اگر ايسى بات ہے تو۔۔۔“

طارق نے تسمخرانہ سے انداز ميں سر جھٹك ديا۔ حور اپنے قياس پہ شرمندہ ہو گئی۔ پھر طارق كے نزديك بيٹھ كر کہنے لگی۔

”آج ماما نے جو كچھ بھی کہا۔ مجھے بالكل اچھا نہیں لگا۔ حالانكہ ايك وقت تھا۔ ميں ايسى چاہتى تھی۔ ليكن پتا نہیں كيوں جب ايسا ہوا تو مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگا۔“

وہ كھوئے كھوئے سے لہجے ميں وضاحت كر رہى تھی۔

طارق اپنى پریشانى ميں مبتلا تھا۔

اس سے بل يہ معاملہ زيادہ پھيلتا۔ صبح سب سے پہلے اسے انسپكر اياز سے مل كر اس بليك ميلنگ كى روك تھام كرنا تھا۔ جس نے پورے گھر كى عزت كو داؤ پہ لگا ديا تھا۔

”كيا سوچ رہے ہیں آپ؟“ حور، طارق كو كم صم پا كر پوچھنے لگی۔

طارق نے چپ چاپ كر وٹ بدل لى۔ حور نے بھی لائٹ آف كر دى۔



اس معاملے نے طارق کو ساری رات سونے نہیں دیا تھا۔ جب تک وہ انسپکٹر ایاز سے مل نہیں لیا۔ اس کی پریشانی دور نہ ہوئی۔ ایاز اس کا بچپن کا دوست بھی تھا جس کو سارا معاملہ بتانے کے بعد یہ بھی کہنے کی نوبت نہ آئی کہ یہ معاملہ جلد حل بھی ہو اور کسی پہ آشکار بھی نہ ہو۔ ایاز نے خود بخود ہی یقین دہانی کرادی تھی کہ وہ اس معاملے کو بذات خود ہینڈل کرے گا۔

”سب سے پہلے تو اس نمبر کی انکوائری کرنا ہوگی جہاں سے یہ میسج آرہے ہیں۔ پھر وہ سبم بند کرانا پڑے گی۔ پھر وہاں سے ایڈریس لے کر اس بندے تک پہنچا جائے گا۔“

”بالفرض وہ سبم کسی اور کے نام ہوئی تب؟“ طارق نے خدشہ ظاہر کیا۔ انسپکٹر ایاز ہنس پڑا۔

”سو فیصد ایسا ہی ہوتا ہے، یہ کوئی پہلا کیس نہیں ہے۔ جو تم لے کر آئے ہو۔ آئے دن ہمیں تو ایسے معاملات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ بار بار سبم بند کرنا بھی بلیک میلنگ کا سلسلہ بند نہیں ہوتا۔ لیکن تم فکر نہیں کرو۔ مجرم تک پہنچنا ہمارے لیے مشکل نہیں ہے۔“

”مجھے اس کا سامنا نہیں کرنا۔“ طارق نے بہت ضبط کیا تھا۔ ”کیونکہ اتنا تو میں جانتا ہوں ایسے مجرموں کو کوئی سزا نہیں ملتی۔“

ندامت و شرمندگی سے طارق نے ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست کر لیے۔

”میں تو بس یہ چاہتا ہوں، تم اپنے طور پر اس کے تمام ذرائع بند کرادو۔ تاکہ وہ اس شرک و ہماری فیملی میں نہ پھیلا سکے۔ میں پہلے ہی اپنی بہن کا فون بند کرچکا ہوں۔“

وہ شرمندگی سے بولا تو انسپکٹر ایاز نے اس کے کاندھے پر ہتھکی دی۔

”تم فکر نہیں کرو۔ جیسا تم چاہتے ہو۔ ویسا ہی ہوگا۔“



ڈاکٹر شگفتہ نے چند منٹ لکھ کر دیے تھے۔ جو فوری طور پر کرنا تھا۔ دل آویز کو نقاہت کی وجہ سے چکر آرہے تھے۔ اول تو وہ کچھ کھاتی نہیں تھی۔ اور کھا بھی لیتی تو التیاں لگ جاتیں۔ دن بھر نڈھال بستر میں پڑی رہتی۔ کھڑی ہوتی تو یوں لگتا کہ ابھی گر جائے گی۔

رمیض رپورٹس لے آیا تھا۔ جس میں اس کے پریکٹ ہونے کی تصدیق ہوگئی تھی۔ لیکن دل آویز میں ہموگلوبین کی مقدار اتنی کم تھی کہ اسے کوئی بھی نقصان اٹھانا پڑسکتا تھا۔

ڈاکٹر شگفتہ نے آرام اور خوراک کا خاص خیال رکھنے کو کہا تھا۔ اس خبر پہ جہاں رمیض بہت خوش تھا۔ وہیں دل آویز بالکل گم صم ہو کر کے رہ گئی تھی۔

دل آویز اور اس کی ماں نے رمیض کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آج رمیض سرخرو ہوا تھا۔ وہ دل آویز کو طعنہ دینے سے باز نہیں آیا تھا، اس کی ماں نے اور اس نے اس کے متعلق کیسی کیسی افواہیں پھیلائی تھیں۔ رمیض چاہتا تھا کہ وہ یہ خبر دلشاد بیگم کو بھی جا کر دے تاکہ انہیں بھی اتنی ہی شرمندگی ہو۔ ہتھن دل آویز کو ہر ہی تھی۔

دل آویز اس خبر پہ خوش نہیں تھی۔ کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے اس میں چڑچڑاپن مزید بڑھ گیا

تھا۔ اس نے فون پر دلشاد کو یہ خبر سنائی تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ دلشاد کا رویہ، دل آویز کے لیے حیرت انگیز تھا۔ دلشاد پہلی بار دل آویز کے گھر ملنے آئی تھیں۔ لیکن دل آویز کو بچوں کے مسائل کا سوچ کر ہی اباکیاں آ رہی تھیں۔

دل آویز چاہتی تھی کہ خود بخود ایسا کچھ ہو جائے کہ وہ ماں بننے کے عمل سے نجات حاصل کر سکے۔ اور پھر ایک دن کسی بے احتیاطی کی وجہ سے اچانک دل آویز کی طبیعت خراب ہو گئی تو رمیض کو بہت تشویش ہوئی۔ وہ فوری طور پر دل آویز کو اسپتال لے گیا۔ اسپتال کا کوریڈور عبور کرتے ہوئے دل آویز کی نگاہ دو معذور بچوں پر پڑی۔ جن میں سے ایک کی عمر تقریباً چھ سال اور دوسرے کی عمر نو سال تھی۔ بچے ذہنی طور پر معذور تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی حرکات و سکنات بھی عجیب و غریب تھیں۔ اور ہاتھ پاؤں بھی بالکل پتلے پتلے اور کمزور تھے البتہ ان بچوں کے سر اور منہ جسم کی نسبت بڑے تھے۔ ان بچوں کی ماں انہیں ویننگ روم میں لے کر بیٹھی تھی۔ دل آویز کی نگاہ ان بچوں پر پڑی تو پلٹنا بھول گئی۔

بچوں کی ماں بڑے پیار سے کبھی اپنے ایک بچے کے منہ سے نکلتا لعاب صاف کرتی اور کبھی دوسرے بچے کی آنکھوں سے آتا پانی۔ وہ عورت مدلل کلاس سے لگتی تھی مگر اس کی پیشانی پر نہ تو بل تھے اور نہ ہی الجھن۔ وہ بڑی مامتا سے اپنے دونوں بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔
دل آویز کے دل کو یک دم کچھ ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کیسی کیفیت تھی۔ وہ لوگ وہیں ویننگ روم میں بیٹھ گئے اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ دل آویز سے رہانہ گیا اور وہ عورت سے پوچھنے لگی۔
”کیا مرض ہے ان بچوں کو؟“

اس عورت نے بڑی عجیب نگاہوں سے دل آویز کی طرف دیکھا اور اپنا دوپٹہ اپنے بچوں کے اوپر ڈال لیا۔ دل آویز نے رمیض کی طرف دیکھا۔
”کوئی مرض نہیں ہے بچوں کو۔ یہ اللہ لوک ہیں۔“
وہ عورت سخت لہجے میں بولی تب ہی اس کا شوہر آ گیا۔ اور وہ دونوں میاں بیوی اپنے بچے لے کر وہاں سے نکل گئے۔

”مامتا اسی چیز کا نام ہے۔“ رمیض نے رشک سے اس عورت کی محبت کو سراہا تھا۔ دل آویز کو بھی بڑا اچنکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر شگفتہ نے چیک اپ کے بعد اپنا پن ہونٹوں پر رکھ لیا۔ اور بڑے سوچ انداز میں کہنے لگیں۔
”مسز رمیض! آپ اتنی سی بھی احتیاط نہیں کر سکتیں۔ جانتی ہیں آپ کی یہ بے احتیاطیاں کیا نتائج پیدا کر سکتی ہیں؟! بنا رمل بچوں کا پیدا ہونا، والدین کے لیے کتنا تکلیف کا سبب ہوتا ہے؟“
دل آویز کی نگاہوں میں وہ عورت اور اس کے بچے آ گئے۔ وہ یک دم کانپ کر رہ گئی۔
”ہمارے یہاں ایک کپل آتا ہے۔ ابھی آپ سے پہلے وہ لوگ اپنے بچوں کا چیک اپ کرا کر گئے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر شاید دکھ ہو۔ ان کے چار بچے ہیں اور چاروں ہی پیدا ہی معذور ہیں۔ لیکن دونوں میاں بیوی اپنے بچوں کی بالکل اسی طرح دیکھ بھال اور توجہ رکھتے ہیں جیسے نارمل

بچوں کی کی جاتی ہے۔ پتا نہیں اللہ نے انہیں کس آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اور انہیں کیا درجات دینا چاہتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اتنی قوت برداشت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ اللہ اولاد دے تو مکمل صحت و تندرستی والی۔“

یہ کہہ کر ڈاکٹر شگفتہ نے پرچے پہ کچھ دوائیں لکھ کر انہیں تھامیں اور کہا۔
 ”مسر رمیض! آپ اچھی خوراک لیں۔ اور مکمل بیداریٹ کریں اور ہر قسم کی ٹینشن سے خود کو آزاد کر لیں۔ میں ہرگز نہیں چاہوں گی کہ آپ کی کمزوریوں کا اثر بچے کی ذہنی یا جسمانی حالت پر پڑے۔۔ پہلے ہی آپ کا بچہ بہت کمزور ہے۔“
 دل آویز یک دم سٹائے میں آگئی۔

”یہ میڈیسن انہیں باقاعدگی سے دیں۔ اگر ان کا پہلی بار بارش ہو گیا تو یہ پھر دوبارہ ماں نہیں بن پائیں گی۔“
 یہ الفاظ تھے یام۔ رمیض کے تو ہوش اڑے ہی تھے۔ دل آویز کے بھی ہوش ٹھکانے پہ آگئے۔



دلشاد بیگم باقاعدگی سے بیٹی کی طرف جارہی تھیں۔ جس کی وجہ سے روزانہ ان کی ملاقات رمیض سے بھی ہونے لگی تھیں۔ رمیض کو اولاد کی ضرورت تھی، اسی وجہ سے اس نے دل آویز کے لیے دن بھر کے لیے ایک ملازمہ کا انتظام کر لیا تھا۔ رمیض کی بہن بھی دن میں دو تین چکر لگاتی تھی۔

رمیض، دل آویز کا بہت خیال رکھ رہا تھا۔ اس کی توجہ اور اپنائیت نے دلشاد کے دل میں نئی جگہ بنانا شروع کر دی تھی۔ اب دلشاد کا رویہ رمیض سے بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ جبکہ دل آویز خود دل سے چاہنے لگی تھی کہ وہ ماں بنے اور اس کا بچہ صحت مند اور نارمل پیدا ہو۔
 اپنی زندگی پہ نگاہ ڈالتی تھی تو ان معذور بچوں سے خود کو کم نہیں پاتی تھی، جو دنیا سے بے گانہ صرف اور صرف ماں کے رحم و کرم پہ تھے۔
 رمیض کی توجہ اور مہربانیوں نے دل آویز کے دل میں بھی نئے غنچے کھلانا شروع کر دیے تھے۔



آج کی صبح کا آغاز بہت خوش گوار ہوا تھا۔ بہت دن کے بعد گھر میں چھاپا سکوت اور اداسی چھٹی تھی۔ دلشاد اب مستقل گھر میں ہی تھیں۔ آج وہ معمول سے زیادہ امور خانہ داری میں دلچسپی لے رہی تھیں۔

رات ڈنر پہ عباد اور اس کے گھر والے آرہے تھے۔ وہ حور سے رات کے مینیو کے بارے میں مشورہ کر رہی تھیں۔ پھر انہوں نے دل آویز کو فون کیا کہ وہ گھر آجائے۔ ساتھ ہی انہوں نے داماد کو بھی رات ڈنر پہ مدعو کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ولید کو تلاش کرنے لگیں، ولید جو گنگ کر کے واپس آیا تھا، وہ اس کے سر پر پہنچ گئیں۔

”میں نے تم سے کہا تھا صبح جلدی تیار ہو جانا، ہم نے اصباح کو لے کر آنا ہے۔“
ولید نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا بڑوں کے درمیان بات چیت ہو چکی ہے۔
اور ماموں، اصباح کو بھیجنے کے لیے تیار ہیں پھر بھی ماں کو ستانے کی غرض سے بولا۔
”میں ماموں جان کو اپنی شرافت کا حلف نہیں دوں گا۔ اگر وہ ایسے ہی اپنی لاڈلی کو بھیجیں تو چلنے کو
تیار ہوں۔“ دلشاد کو ولید پہ غصہ آ گیا۔ وہ کچھ کہنے کو نہیں کہہ سکتا تھا لگوار ہی تھی۔ درمیان میں بول
اٹھی۔
”خیر ہے ماما! ہم ماموں سے کہہ دیں گے۔ اصباح کو بھیج دیں۔ وہ خود ہی آ کر اسے سدھار لے
گی۔“

دلشاد نے مسکرا کر حور کی طرف دیکھا۔
”بھابھی! یہ غصہ نہ کریں۔ کون دیکھے گا ولید بھائی اور اصباح بھابھی کے روز روز کے معرکے۔
ماما، بابا کا کمر اسب سے قریب ہے۔ دونوں ڈسٹرب ہو جائیں گے۔“
معیز نے ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
”اس شیطان کو رکھنا کون چاہتا ہے اپنے قریب۔ اسے تو میں ہر حال میں اوپر پھینکوں گی۔ طارق
اور حور العین کو اپنے قریب رکھوں گی۔“
”ہیں۔۔۔ ہیں۔۔۔ ہیں۔ اتنے اچھے کمرے چھوڑ کر میں نہیں اوپر جانے والا۔“
وہ بھی بنامندہ دھلے ناشتا کی میز پر آ گیا اور دھمکی دی۔
”تمہیں اوپر جانا ہی پڑے گا۔“ دلشاد نے ولید کا کان مروڑا۔ ”تمہارا کچھ بھروسہ نہیں۔ رات بے
رات پھر لے کر نکل جاؤ اسے۔“
ولید شرمندہ ہو گیا۔ دلشاد بھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

”حور نے سارا گھر سنبھال رکھا ہے۔ سارا دن ایک پاؤں اوپر، ایک پاؤں نیچے۔ حور نیچے رہے گی
تو اس کی پریڈ بھی کم ہوگی۔ پھر یہ کہ دلشین بھی چلی جائے گی تو میں تم نگوں کا اچار ڈالوں گی۔ مجھے تو
طارق اور حور کو ہی اپنے قریب رکھنا ہے۔“
اس قدر لاڈ پہ ابراہیم صاحب کو زوردار کھانسی ہوئی تھی۔ انہوں نے اخبار چہرے کے سامنے پھیلا
لیا۔

”بھئی طارق! ان ساس بہوؤں کی ذرا نظر اتار دینا۔ کہیں ان کی محبت کو بیماری کی نظر نہ لگ
جائے۔“

دلشاد نے خفگی سے شوہر کی طرف دیکھا۔ حور جھینپ گئی، جلدی سے بولی۔

”سب ہی آگے طارق نہیں اٹھے۔ میں بلا کر لاتی ہوں۔“

وہ کہہ کر مڑی تو ولید بے ساختہ بولا۔ ”نظر اتارنے کے لیے۔“

معیز قہقہہ لگا کر ہنسا تو حور شرمندہ سی بیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

وہ اتنی جلدی میں تھی کہ آخری سیڑھی پہ نیچے آتے طارق سے ٹکرائی، طارق نہ تھا تا تو وہ واپس

پلٹ سکتی تھی۔
 ”جھیان سے سزا! تعریف و مرتبہ آدمی کے ہوش گم کر دیتا ہے۔“ وہ اسے بازوؤں میں لے کر
 محبت و وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔

حور نے شکوہ کناں نگاہوں سے طارق کو دیکھا۔ اور اتر کر بولی۔
 ”مرتبہ انسان کو یوں ہی نہیں ملتا۔“

طارق کے دل نے اس چیز کا اقرار کیا۔ اس میں اس کے ایثار اور صبر کا بڑا عمل دخل تھا۔ تب ہی
 جیت اس کا مقدر رہی تھی۔

”تو پھر کس طرح ملتا ہے؟“ وہ اسے ستانے کے موڈ میں تھا۔

”پتا نہیں۔“ وہ اس کی گرفت میں یک دم پریشان ہو گئی۔

نیچے دلشاد، طارق اور حور کو آوازیں دے رہی تھیں۔

”پہلے ماما کی نفرت چھین نہیں لینے دے رہی تھی۔ اب محبت اکٹھا نہیں رہنے دے گی۔ لمحہ لمحہ آواز

دیا کریں گی۔“

وہ کچھ بد مزہ سا ہوا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ہمیں نیچے اپنے پہلو میں رکھیں گی۔“ اس کی ہنسی پر طارق نے

اسے گھور کر دیکھا۔

وہ مسکراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے نیچے اتر آئی جہاں دلشاد نگاہوں میں محبت لیے ان کی منتظر

تھیں۔



شب شکستہ

میں روز اسے دیکھتی تھی اور سوچا کرتی تھی کیا یہ شخص مجھے مل سکتا ہے۔ اتنا ڈشنگ اور اتنا مال دار، اگر وہ مجھے مل جائے تو میری قسمت کو چار چاند لگ جائیں اور پھر اچانک قسمت مجھ پہ مہربان ہوگئی۔ اچانک یہ کیسا معجزہ ہوا تھا کہ وہ خود بخود میرے دامن میں آگیا۔ میں خوشی سے جھوم اٹھی۔ میرے ہاتھ تو گویا ہفت اقلیم کی دولت لگ گئی تھی۔

لیکن میں اس خوشی کو اس پہ ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگر میں اسے بتا دیتی کہ میں اس پہ پہلے ہی مرتی تھی تو وہ مغرور مجھ سے بے تعلق ہو جاتا اور میں یہ کیسے چاہ سکتی تھی کہ وہ مرے محور سے ہٹے، کیا نمی تھی مجھ میں۔ بے بہا حسن، ذہانت، شوخی اور بولڈنیس اور وہ میرے حسن پہ ہی تو مرنا تھا۔



آج میرے ساتھ بالکل ہی عجیب معاملہ ہوا۔ مانا کہ رات میں نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ لیکن یہ تو میرا معمول تھا۔ آج میرے حواس میرا ساتھ کیوں چھوڑ گئے تھے جبکہ میں گھر سے بالکل ٹھیک ٹھاک نکلا تھا۔

بیکری سے چیزیں لیتے ہوئے مجھے چکر سے آئے میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن۔۔۔ جب آنکھ کھولی تو میں ”میڈی کیئر“ ہسپتال میں تھا۔
”یار آج تو تم نے ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔ آخر ہوا کیا تھا تمہیں؟ اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ حسیب اور نعمان میرے پاس کھڑے تھے۔

مجھے اپنا سراپ بھی بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔
”کچھ نہیں بس چکر سے آئے اور پھر پتا نہیں کیا ہوا لیکن مجھے یہاں کون لایا؟ اور تم لوگ۔۔۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟“
”میں آپ کو یہاں لائی ہوں اور ان لوگوں کو بھی میں نے ہی انفارم کیا تھا۔“ آواز جتنی مترنم تھی وہ

خود بھی اتنی ہی حسین تھی۔ میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
وہ بھی خریداری کے لیے اسی بیکری میں موجود تھی اور جب میں بے ہوش ہوا تو وہ اپنی گاڑی میں
لوگوں کی مدد سے مجھے یہاں تک لے آئی۔
”شکریہ۔“ میں ذرا سا اٹھتے ہوئے بولا۔

”اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ میری جگہ وہاں کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔
”اچھا اب میں چلتی ہوں۔ آپ کے دوست آگئے ہیں۔ وہ آپ کی دیکھ بھال کر لیں گے۔“
”اپنا اتنا پتا تو دیتی جائیں۔“ وہ مڑی تو حسیب نے بے ساختہ پکارا۔ وہ مڑ کر مسکرائی۔
”یہ ضروری تو نہیں۔ آپ لوگوں نے تو مجھے اتنا پتا نہیں بتایا تھا پھر بھی میں نے آپ لوگوں کو ڈھونڈ

نکالا۔“

کہنے کے ساتھ ہی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسی وقت ماریہ اپنے ابو کے ہمراہ بوکھلائی ہوئی
کمرے میں داخل ہوئی تو حسیب اور نعمان وہاں سے اٹھ گئے۔
”کیا ہوا ہے ولید تمہیں۔“ یک دم ہی کیسے پچھلے ہو گئے ہو۔ بلڈ پریشر تو ٹھیک ہے تمہارا؟“ وہ میرا
ہاتھ پکڑ کر اضطرابی کیفیت میں پوچھ رہی تھی۔

”ٹیک اسٹ ایزی۔ بس ذرا شوگر لیول ڈاؤن ہو گیا تھا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔
”تمہیں اپنی ڈائٹ کی ذرا پروا نہیں ہے۔ دن کے دو بجے تمہارا بڑا بیک فاسٹ ہوتا ہے اور رات
دو بجے ڈنر۔“

”ماریہ ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا، اپنا خیال رکھا کرو۔ صحت ہے تو سب کچھ ہے۔“

”ماریہ کو تو وہم ہو گیا ہے۔ میں اتنا لمبا چوڑا ہٹا کٹا، کیا بغیر کھائے پیے ہوں۔“

”انکل! آپ بیٹھ جائے۔“ حسیب نے ان کے لیے کرسی رکھی۔

ہم یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آئے۔ بس ہم ولید کو لے کر جا رہے ہیں۔“

ماریہ کی رائے حسیب اور نعمان کے بارے میں بہت خراب تھی۔ بلکہ وہ میرے کسی بھی دوست کو
اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا میرے پیٹے پلانے کے پیچھے ان ہی دوستوں کا ہاتھ ہے۔
پھر ڈاکٹر نے مجھے کچھ میڈیسن دے کر ڈسچارج کر دیا تھا۔



تین دن ہو گئے تھے مجھے گھر آئے ہوئے۔ اچھی بیویوں کی طرح ماریہ نے میری خدمت میں کوئی
کسر نہیں چھوڑی تھی، گھر میں آنے جانے والوں کا بھی تانتا سا بندھا ہوا تھا۔

”ماموں ممائی آپ کی طبیعت پوچھنے آئے ہوئے ہیں۔ میں انہیں باہر سے ہی روانہ کر دوں گی۔
آپ آرام کریں۔“ ماریہ نے بچوں کو بھی ڈانٹ کر کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔ وہ لائٹ آف کر کے
باہر نکلے گی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”مجھے تمہاری یہ ایکٹیو ڈیٹیز سخت بور کرتی ہیں۔ کل سے میں جم دوبارہ جوائن کر لوں گا، تم اپنے

رشتے داروں کو بھگلتا رہنا۔“

وہ ہنس پڑی۔

”سب لوگ آپ ہی کی وجہ سے تو آرہے ہیں۔“

”ایسا کرو، گیٹ پہ باہر سے تالا ڈال دو اور بچوں کو کبھی کچھ دن کے لیے ان کی نانو کے ہاں بھیج

۔۔“

”اس کے بعد؟“ ماریہ نے شریں نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”اس کے بعد۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔ بعد میں دیکھی جائے گی۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ابھی

کھینچا ہی تھا کہ فہرودا زہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ ماریہ پھرتی سے ہاتھ چھوڑ کر دور ہو گئی۔

میرا موڈ سخت خراب ہو گیا۔

”ماموں ممانی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ بس میں ابھی آئی۔“ ماریہ کمرے سے نکلتے ہوئے

بولی۔

اور میں جانتا تھا اس کی ”بس ابھی“ رات کے ایک بجے سے پہلے نہیں ہوگی۔ وہ کمرے سے نکلتی چلی گئی اور میں اس کی پشت کو گھورتا رہ گیا۔ جس پہ ایک لمبی سی چوٹی بل کھا رہی تھی۔

دو بچوں کے بعد بھی وہ ویسی کی ویسی ہی تھی۔ حالانکہ دونوں بچے آپریشن سے ہوئے تھے۔

دراز قد، متناسب جسم، کھلتی ہوئی رنگت اور کھڑے نقوش، بلاشبہ ہماری جوڑی چاند سورج کی جوڑی تھی اور کیوں نہ ہوتی، آخر ماریہ میری کزن بھی تو تھی۔

”ڈیڈی! یہ دیکھیں میں نے بنائی ہے۔“ فہرودا شاہکار مجھے دکھانے لگا۔ اس نے ماریہ کی لپ اسٹیکلوں سے اپنی گاڑیوں پر ایسی شاندار پینٹنگ کی تھی کہ ماریہ اسے دیکھتی تو ڈھنک کر رکھ دیتی۔

”بیٹا! یہ مجھے نہیں اپنی ماما کو دکھانا۔ وہ آپ کو داد بھی دیں گی اور انعام بھی۔“

وہ سر ہلاتا ہر جوش انداز میں اچھلتا کودتا کمرے سے نکل گیا۔ تب ہی میرا سیل فون بجنے لگا۔

”السلام علیکم! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ مترنم آواز میرے لیے اجنبی تھی۔

”میری طبیعت تو ٹھیک ہے مگر آپ۔۔۔۔“

”مگر آپ کی آواز سے تو نہیں لگ رہا کہ آپ کی طبیعت بہتر ہے ایسا کریں اپنے اے سی کی کوننگ ذرا کم کر لیں اور کمبل وغیرہ اپنے اوپر سے ہٹالیں۔“

مجھے شدید جھکا لگا۔

”آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں نے کمبل لیا ہوا ہے؟“

”آپ صرف کمبل کی بات کر رہے ہیں، میں تو یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ اس وقت آپ نے کس رنگ

کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔“

”اچھا۔۔۔!“ میں تو قہر لگا کر ہنس دیا۔

”تو پھر بتائے کہ میں نے کس رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔“ میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”ارے، ارے لیٹے رہیے۔ بیماری میں اتنی جلتا اچھی نہیں ہوتی۔“

اب واقعی مجھے حیرانی ہوئی۔

”چلیے بتا دیتی ہوں۔ فیروزی، سفید دھاری کی شرٹ اور۔۔۔ پتلون آپ کے کمرے کے نیچے ڈھکی ہوئی ہے۔ آئی مین آپ کے پاؤں۔۔۔“ میں یک دم چکر اگیا۔

”ارے، ارے۔۔۔ اتنی گھبراہٹ۔۔۔“ وہ دلکشین انداز میں مسکرائی۔

”پلیز، آپ مجھے جلدی سے بتا دیں، آپ کون ہیں اور کہاں سے بول رہی ہیں۔“

”اچھا تو گویا آپ نے مجھے ابھی تک پہچانا ہی نہیں۔ حالانکہ کوئی بھی شخص دو انسانوں کو کبھی نہیں بھولتا، ایک اپنے محسن کو اور ایک اپنے محبوب کو۔“

اس کی مترنم ہنسی مسلسل میری سماعتوں میں رس گھول رہی تھی۔ میں بے چین ہو گیا۔

”ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔“ فون بند ہو چکا تھا۔

میں نے وہ نمبر دیکھا اور اسے ڈائل کیا۔ لیکن بار بار وہ فون کاٹ دیتی اور آخر کار اس نے فون بالکل ہی آف کر دیا۔ ایسا میرے ساتھ پہلی بار ہوا تھا۔

میں شدید حیران اور پریشان تھا کہ یہ معاملہ کس سے ڈسکس کروں۔ پھر سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ گاڑی کی چابی نکالوں اور حبیب سے ملوں میں ابھی بستر سے اٹھا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور میرے اکلوتے سرور بڑے سالے صاحب اندر چلے آئے۔

”کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟“ میرے منہ کا ذائقہ اتنا خراب ہوا کہ میں بتا نہیں سکتا۔

”ایسا لگ رہا ہے کہ تم کہیں جا رہے تھے۔“ سالے صاحب نے مسکراتے ہوئے بات شروع کی۔

”جاؤ واقعی رہا تھا۔ لیکن اب آپ لوگ آگئے ہیں تو کیسا جانا۔“ میں بے دلی سے چابی پھینک کر

بستر پہ لیٹ گیا۔

”میرا خیال ہے ابھی چند روز تم باہر نہ ہی جاؤ تو بہتر ہے اور اگر جانا بھی پڑے تو گاڑی اکیلے ڈرائیو کرنے کی ضرورت نہیں۔ سبحان کو بلا لیا کرو۔ وہ پیر ز دے کر آج کل فارغ ہے اور گھر پہ اکیلا ہی ہوتا ہے، تم کہو تو میں چند روز کے لیے اسے تمہارے پاس بھیج دیتا ہوں؟“

سبحان، اللہ میاں کی گائے۔ کتابی کیڑ اور خطرناک حد تک پیٹو۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی خوبی نہیں تھی اور مجھے ایسے لوگوں سے ویسے ہی الرجی ہوتی تھی۔

ہمہ وقت ٹخنوں سے اونچے پانچے، چار گز کھلا چولا پہنے عجیب بے ہنگم ساحلیہ ہوتا تھا اس کا۔

”ٹھیک ہے، کل ہی سبحان تمہارے پاس آ جائے گا۔ جہاں جانا ہو اس کے ساتھ چلے جایا کرنا۔“

مجھے ہنسی آگئی۔ مروت اور لحاظ تو میرے اندر نام کو نہ تھا۔

”سبحان کے ساتھ آؤں جاؤں گا تو مشکوک تنظیم میں میرا بھی نام آ جائے گا۔“

”کیا اول فول کہتے ہو تم۔ کسی تنظیم سے ہمارا کیا تعلق؟“

”تعلق بے شک نہیں ہے۔ لیکن معاف کیجیے گا انکل! آپ چاروں باپ بیٹے اکٹھے ہوتے ہیں نا

تو لگتے ہیں سارے کے سارے دہشت گرد ہیں۔“ میری بات پہ انکل سخت تلملا گئے وہ تو خیر ہوئی کہ اسی

وقت ماریہ کمرے میں آگئی۔

”یہ حلیہ اسلامی ہے جسے تم جیسے لوگوں نے دہشت گرد قرار دیا ہے۔ اور برخوردار! تمہارا تو قبلہ شروع سے ہی درست نہیں تھا۔ نہ جانے میری عقل گھاس چرگئی تھی جو میں نے۔۔۔“ وہ ضبط کر گئے۔

”کیا ہو گیا ہے ابو! کیوں ناراض ہو رہے ہیں آپ، آپ کو تو پتا ہے ولید شروع سے ہی ایسے ہیں۔“

”تو کیا یہ اب بھی ایسا ہی رہے گا۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہے یہ۔“ ان کے یہ الفاظ مجھے گولی کی طرح لگے۔

”واٹ از یور پرائلم ہاں۔“ میں اپنے سر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ ماریہ کی جان پہ بن گئی۔ عرفان الگ گھبرا گیا۔

”پلیز ابو! آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ قاسم احمد خاموش ہو گئے۔ جو رشتے میں میرے چچا بھی تھے اور اب سرسبھی۔ شدت ضبط سے ان کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ماریہ کی طرف دیکھا اور پھر اس کا ہاتھ اپنے بازو پہ سے ہٹاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

عرفان اور ماریہ بھی ان کے پیچھے ہی باہر نکلے تھے۔ میں بی وی چلا کر اطمینان سے لیٹ گیا۔ زبردست فلم آرہی تھی۔ دوسرے ہی پل میں سابقہ موڈ سے آزاد ہو چکا تھا۔ تمام کاموں سے فارغ ہو کر ماریہ جب کمرے میں آئی تو چپ چاپ آکر بستر میں لیٹ گئی۔ میں بی وی دیکھتا رہا۔ اور وہ چھت کو گھورتی رہی۔

مجھے پتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس خوش فہمی میں بھی ہو کہ میں اس کے باپ سے معافی مانگوں گا۔

کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے نجی معاملات میں دخل اندازی کرے اور اگر میرا قبلہ شروع سے ہی درست نہیں تھا تو وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی مولوی کے ہاتھ میں دے دیتے۔

میں ابھی اسے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرا سیل فون بجنے لگا۔ اسکرین پہ وہی نمبر چمک رہا تھا۔ میں نے فوراً ریسیو کیا۔ لیکن کوئی ریپالس نہیں ملا۔

مجھے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ اور شاید مجھ سے زیادہ ماریہ کو، میری توجہ اس پر سے ہٹ گئی تھی۔ اس کی جوتیوں کی کھنک مجھے یہی بتا رہی تھی کہ وہ سخت بے چین ہے اور اس کا بس نہیں چل رہا کہ میرا فون اٹھا کر پھینک دے۔

لیکن میں نے بھی کوئی پروا نہیں کی۔ سیل فون آف کر کے کرٹ بدل کر سو گیا۔



رات بھر میں، میں نے اسے تیرہ مہس کا لڑکی تھیں۔

مجھے اس کا فون نمبر اس کے جگری دوست حبیب نے دیا تھا۔ حبیب کو میں کب سے جانتی ہوں یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ لیکن کس حد تک جانتی ہوں یہ میں باآسانی بتا سکتی ہوں۔

حبیب جس کا پورا نام حبیب اللہ ہے، ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور بظاہر اس کی

شخصیت بھی اسلامی طور طریقوں کی حامل تھی۔ لیکن جب میں نے اسے سات آٹھ سال کے بعد دیکھا تو وہ خاصا بدل چکا تھا۔ اس کے سینے تک آئی داڑھی اب بہت کم رہ گئی تھی۔ اسی طرح اس کی مونچھیں بالکل غائب ہو چکی تھیں۔ بال اس کے کندھوں تک تھے اور مجھے یہ دیکھ کر اتنا تعجب ہوا تھا کہ اس نے ایک کان میں بالی بھی پہن رکھی تھی۔ بلیک جیمز یہ پچھسی ہوئی شرٹ میں ملبوس پہلی نظر میں تو وہ مجھے عجیب سا لگا تھا۔ ولید کے گھر کا ایڈریس دینے والا بھی حسیب ہی تھا۔

پہلی بار اس کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر ڈور بیل بجاتے ہوئے مجھے جھک مسوس ہوئی لیکن ہمت کر کے میں نے یہ کام کر ہی لیا۔ ایک سات سالہ بچی نے دروازہ کھولا تھا۔ اس بچی کو دیکھ کر فوراً ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ بچی پر تجسس انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔

”آپ کے پاپا گھر میں ہیں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
بچی نے اثبات میں سر ہلادیا اور سامنے سے ہٹ گئی۔ ابھی رات کے نو ہی بجے تھے۔ میں بچی کی ہم راہی میں ڈرائنگ روم تک آ گئی۔

وہاں پہلے سے ہی مہمان موجود تھے اور مسز ولید ان میں مگن تھیں۔
”السلام علیکم!“ سب نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ”دراصل میں وہی خاتون ہوں جنہوں نے بے ہوشی کی حالت میں ولید کو اسپتال پہنچایا تھا۔“
”اوہ بیٹھے۔“ مسز ولید نے خوش دلی سے کہا تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کے ہسبند کی؟“

”الحمد للہ، اب تو ٹھیک ہیں۔“

دوسرے مہمان جانے کے لیے برتولنے لگے۔

”آپ بیٹھے، میں ڈرائنگ روم لوگوں کو گیٹ تک چھوڑ کر آتی ہوں۔“ مسز ولید مہمانوں کو لے کر باہر نکل گئیں۔ میری نگاہ اچانک سامنے اٹھی تو مجھے وہ دیوتا سا منظر آیا جس نے میرے دل کو گھائل کر دیا تھا۔ شاید وہ اس کا بیڈ روم تھا۔ وہ اپنے بستر پہ نیم دراز کی سوچ میں گم تھا۔

میں اطراف کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ بچے لاؤنج کے دوسری طرف کھیلنے میں مصروف تھے۔ ابھی تک مسز ولید گیٹ پہ سی آف کر کے نہیں آسکی تھیں۔ ان کے انداز سے ایسا لگا تھا جیسے وہ ان کے خاص مہمان تھے۔ میں نے ایک بار پھر وقت دیکھا۔ خوانخواہ وقت ضائع ہو رہا تھا۔ پھر مجھے اچانک ہی ترکیب سوچھی میں نے ولید کو فون ملایا۔

پہلی ہی بیل پہ اس نے فون ریسیور لیا تھا۔

میری نگاہ سامنے بھی کہیں اچانک ہی مسز ولید میرے سر پر نہ پہنچ جائیں۔ لیکن لگتا تھا انہوں نے آج ہی سارے راز و نیاز کرنے تھے اور مجھے ٹھیک ٹھاک موقع مل گیا۔

کورڈور سے مجھے قدموں کی چاپ محسوس ہوئی تو میں نے سہولت سے فون بند کر دیا۔

”یہ لوگ میرے ماموں ممائی تھے۔ دراصل ان لوگوں کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ میں ڈرائیور کا

انتظار کر رہی تھی کہ وہ گاڑی نکال لے تو میں گیٹ بند کر کے اندر آؤں۔ آج کل ڈکیتیاں بھی تو کتنی ہو رہی ہیں۔“

اچانک میرا فون بجنے لگا۔ میں نے نمبر دیکھا، ولید کا ہی تھا۔ میں نے پھر سہولت سے کاٹ دیا۔ اس کے بعد مس کالز آتی رہیں۔

ابھی ہمارے درمیان تعارفی مرحلہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ مزید مہمان آ گئے۔

”یہ میرے ابو اور بھائی ہیں۔“ مسز ولید نے مجھے بتاتے ہوئے ملازم کو ہدایت کی کہ انہیں ولید کے کمرے تک لے جائے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

”کیا لیں گی آپ ٹھنڈا یا گرم؟“

”جائے میں پیتی نہیں ہوں اور ٹھنڈا لے نہیں سکتی کہ میرا گلہ خراب ہے۔“

”بہت شکریہ آپ کا کہ آپ نے بروقت ہماری مدد کی۔“ مسز ولید گو کہ غلت کا اظہار نہیں کر رہی تھیں لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ بات چیت کے موڈ میں بھی نہیں ہیں۔

”آپ کے گیٹ آر ہے ہیں۔ آپ انہیں الٹینڈ کریں میں پھر بھی آؤں گی۔“ میں اپنا ہینڈ بیگ کندھے پہ لٹکاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”ارے نہیں، آپ بھی تو مہمان ہیں۔“ وہ مروتا بولیں۔

”کوئی بات نہیں پھر آ جاؤں گی۔“ بچے بہت پیارے ہیں آپ کے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے مسز ولید سے مصافحہ کیا تو لاشعوری طور پر ان کا ہاتھ نہ چھوڑ سکی۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ولید کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔

”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟“

”مجھے ماریہ کہتے ہیں۔ اور آپ؟“

”میں۔۔۔“ میں ہنس دی۔ ”پھر بتاؤں گی۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے ان کا ہاتھ چھوڑا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میری عجیب کیفیت تھی۔ وہ ایک شیشے کی مورت تھی۔ دو حسین بچوں کی ماں۔ ضرور ولید کے دل کی بھی ملکہ ہوگی۔

تب ہی تو وہ ارد گرد کے ماحول سے اکثر بے نیاز رہتا تھا۔

سوچتے ہوئے میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔



اس سے پہلے میں نے ماریہ میں اتنا خرد نہیں دیکھا تھا جتنا وہ اب دکھا رہی تھی۔ رات سے صبح اور صبح سے شام ہو گئی اور اس نے مجھے لفٹ نہیں کرائی۔ یعنی وہ مجھ سے زیادہ اپنے باپ کو اہمیت دے رہی تھی۔

ملازم کے ہاتھ سوپ کا پیالہ بھیج کر وہ کیا سمجھ رہی تھی کہ وہ میرے حقوق اچھی طرح پورے کر رہی

ہے؟

صبح کے ناشتے سے لے کر شام کے سوپ تک سب کچھ یونہی کمرے میں پڑا چھوڑ کر میں تیار ہو کر گھر سے نکل گیا۔
مجھے اچھی طرح پتا تھا جب وہ کمرے میں جائے گی تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ زیادتی پہ کون

ہے؟

ابدالی روڈ سے گزرتے ہوئے میری نظر اچانک اسی خاتون بلکہ اسی نازنین پہ پڑی جو مجھے پہلے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے گئی تھی۔ میں نے اس کے قریب جا کر گاڑی آہستہ کی۔ چونکہ وہ پیدل تھی سو مجھے گاڑی روکنا پڑی۔

”ہیلو۔۔۔“ میں نے گاڑی سے چہرہ نکالا۔

”ہیلو۔۔۔“ وہ ہنشت سے مسکرائی۔

”آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“

”میرے پاس گاڑی موجود ہے لیکن مجھے پیدل چلنا اچھا لگتا ہے اور پھر یہیں کے ایف سی تک تو جانا ہے۔“

”میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔“

پھر میرے اصرار پہ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”آج صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔ شاید آپ کے ساتھ کچھ کھاپی لیا جائے۔ ویسے آپ کی آواز فون پہ اور بھی خوب صورت لگتی ہے۔“
میں نے موڑ کھینٹے ہوئے کہا تو پہلے تو اس کا رنگ اڑا پھر وہ ہنس پڑی۔

”گویا آپ نے پہچان ہی لیا۔“

”کیوں نہ پہچانتا اور آپ نے صحیح کہا تھا کہ انسان اپنے محسن اور محبوب کو کبھی نہیں بھول پاتا۔“ وہ ہنس دی۔ اس کی ہنسی واقعی دلکش تھی۔

”سچ پوچھیے تو میں آپ کی آواز پہچان ہی نہیں پایا تھا۔ پہلی ملاقات ہمارے درمیان سرسری سی ہوئی تھی۔“

”سرسری ضرور تھی لیکن سائلنٹ (خاموش) ہرگز نہیں تھی۔“ اس نے ہنسی میں مجھ پہ طنز کیا تو میں بھی ہنس پڑا۔

میں نے کے ایف سی کے سامنے گاڑی روک دی۔

”اگر آپ مجھے مہمان نوازی کا موقع دیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے شکر یہ کا موقع دیا ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ آپ نے سر راہ مجھے پکڑ لیا اور زبردستی کا مہمان بنالیا۔ شکر یہ ادا کرنا تھا تو

میرے گھر آ کر کرتے۔“

اس کی بولڈنیس نے مجھے خاصا لطف دیا۔ یعنی یہ تو ایسی چڑیا تھی جسے دانہ ڈالنے کی بھی ضرورت

نہیں تھی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

”حلیے ابھی آپ کے گھر چلتے ہیں۔“

”میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آپ سیریس ہی ہو گئے۔“ پھر ہم دونوں باری باری گاڑی سے باہر نکل آئے۔

”ویسے آپ مذاق سنجیدگی سے کرتی ہیں۔ میں ابھی تک حیران و پریشان ہوں کہ آپ نے کیسے جانا کہ میں اپنے گھر میں کس حلیے میں ہوں۔ کیا آپ کے پاس کوئی جادوئی علم ہے؟“ وہ چند ثانیے میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

اس کی آنکھیں اور بال براؤن کلر کے تھے۔ یک دم اس نے نظریں جھکالیں اور ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ آکر معدوم ہو گئی۔

اس نے کرسی پیچی اور بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

”کیا آپ جادو پہ یقین رکھتے ہیں؟“

”پہلے تو نہیں رکھتا تھا لیکن آپ سے جب بھی ملاقات ہوئی ہے عجیب حالات میں ہوئی ہے۔ شاید آپ یقین نہ کریں میں اب بھی راستے میں آپ کو سوچتا ہوا آ رہا تھا اور آپ اتفاقاً طور پر مل گئیں۔ اس دن آپ نے میری اچانک مدد کی حالانکہ وہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے لیکن۔۔۔ آپ نے جس طرح مجھے فوراً اسپتال پہنچایا یہ سب کچھ محض اتفاق نہیں لگتا۔“

”یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے بے ہوش ہونے کے انتظار میں کھڑی تھی؟“

”ارے نہیں، میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ میں خود اب تک حیران ہوں کہ میں اچانک بے ہوش کیسے ہوا حالانکہ زندگی بھر میرے ساتھ کبھی ایسا کچھ نہیں ہوا۔“

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور مینو کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔

”آپ میری مہمان ہیں، آرڈر آپ دیں۔“ آرڈر دینے کے بعد ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ پھر چل پڑا۔

”کتنی عجیب بات ہے، میں نے ابھی تک آپ کا نام بھی نہیں پوچھا۔“

”مجھے مہربانو کہتے ہیں۔ میں لاء کرچکی ہوں اور اب پریکٹس کر رہی ہوں، حسن علی جنوے شہر کے مشہور وکیل ہیں۔ آج کل میں ان کے ساتھ ہوتی ہوں۔ مجھے آؤٹنگ کا بہت شوق ہے اس لیے تقریباً روزانہ ہی گھومنے پھرنے نکل جاتی ہوں اور اکثر ابدالی روڈ پر ہی نکلتی ہوں کیونکہ میرا گھر یہاں سے قریب ہے۔“

”یہ تو اس روڈ کی خوش بختی ہے کہ آپ جیسی حسینائیں رونق بخشی ہیں۔ ورنہ ملتان شہر میں رکھا ہی کیا ہے مٹی اور بس مٹی۔۔۔“

”سب سے پہلے تو آپ کو اپنے الفاظ واپس لینا ہوں گے جو حسینائیں بازاروں کو رونق بخشی ہیں میرا شمار ان میں سے نہیں ہے۔“

”ارے، آپ نے میری بات کا غلط مطلب۔۔۔“ اس نے فوراً میری بات کاٹی۔

”دوسری بات یہ کہ ملتان میں کیا نہیں ہے۔ دنیا کا سب سے اچھا آم۔“
 ”وہ بھی یہاں کی مٹی کی بدولت ہی ہے۔“ میں کب خواتین سے زیر ہونے والا تھا۔ سو جلدی سے

بولاً۔

”اس کے علاوہ ملتان اولیاؤں کا شہر کہلاتا ہے۔“ وہ مزید بولی۔
 ”اور مجھے لگتا ہے آپ نہ صرف اپنی ذات کے حوالے سے آزاد ہیں بلکہ مذہب کے معاملے میں
 بھی ایسی ہی صورت حال ہے۔ بہر حال یہ آپ کا نظریہ ہے۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔“ وہ یک دم ہی
 دست بردار ہوئی۔

”یہ ہوئی نابات۔۔۔ ویسے آپ سے ملاقات نہایت دلچسپ رہی ہے۔“ وہ کولڈ کافی ختم کر چکی
 تھی۔ پھر نشو و پیر سے اپنے ہونٹ صاف کرنے لگی۔
 اس کے ہونٹ خوب صورت بناوٹ کے ساتھ قدرے بھرے بھرے تھے اور اس کے گول چہرے
 کو پرکشش بنا رہے تھے۔

”آپ سے ملاقات میرے لیے بھی دلچسپ رہی ہے۔ یہ میرے گھر کا ایڈریس ہے۔ آپ آنا
 چاہیں تو میں شام چار بجے کے بعد گھر پر ہی ہوں گی۔“ اس نے ایک چٹ پہ اپنا پتہ لکھ کر میری طرف
 بڑھایا۔

”ارے اتنا قریب ہے آپ کا گھر۔“

”بائی داوے میں آپ کے گھر آؤں گا کس حیثیت سے؟“ اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کسی
 نادان بچے کو دیکھتے ہیں۔ پھر استہزائیہ انداز میں بولی۔

”آپ تو بہت آزاد خیال ہیں۔ پھر بھی آپ کوئی جواز چاہتے ہیں۔ تو میرا شکریہ ادا کرنے
 آجائیے گا۔ البتہ آج کی اس مہمان نوازی کے بعد یہ جواز بھی باقی تو نہیں رہتا لیکن آپ کی مرضی ہے۔“
 اس کے ساتھ ہی وہ پرس کاندھے پر لٹکاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”آپ کے ساتھ باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔“ وہ کھڑی ہوئی تو میری نگاہیں اس
 کے سراپے میں الجھ گئیں۔ بلیک شیفون کی کھلی آستینوں والی فیص جوا چھپی خاصی ٹائٹ اور قدرے اوپن
 تھی۔ بلیک ہی تنگ پائچے کی شلوار۔ ہیل والی سینڈل اور شیفون کا بڑا سادہ پٹہ، گرے پرس کاندھے پہ
 لٹک رہا تھا اور پرس سے ہم رنگ کلپ۔

تراشیدہ بالوں کو خواہ مخواہ ہی گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی تھی۔ چھوٹی سی پونی کے باوجود اس کے
 سارے بال ارد گرد پھیلے ہوئے تھے۔

”مجھے دیکھ چکے ہو تو اپنے دائیں طرف بھی دیکھ لو۔“ میں اپنی چوری پکڑے جانے پہ شرمندہ سا

ہو گیا۔

دائیں طرف ویٹر کھڑا تھا۔ میں جلدی سے بل پے کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔



عجیب بات یہ نہیں تھی کہ وہ بنا کوشش کے مجھے مل رہا تھا۔ بلکہ عجیب تو یہ تھا کہ اس کی یادداشت ضرور کمزور تھی۔ تب ہی اس نے میری مس کالز کا ذکر نہیں کیا۔ جبکہ وہ میری آواز بھی پہچان چکا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر عجیب اور حیران کن بات تو یہ تھی کہ میں اس کے گھر بھی ہوئی اور اسے پتا ہی نہیں چلا۔

لیکن پھر جلد ہی میں نے اپنی اس حیرت پہ قابو پا لیا۔ حسیب نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بیوی جاشار بیویوں میں سے ایک ہے۔ میرا خیال ہے ایسی بیویاں معمولی معمولی باتیں بھی شوہروں سے نہیں چھپاتیں تو پھر کیا وجہ تھی کہ اس نے اپنے شوہر کو میرے متعلق نہیں بتایا۔ لیکن جلد ہی یہ ابجھن بھی دور ہو گئی جب اس نے یہ بتایا کہ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور ایسا اس نے مجھے صرف خوش کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ واقعی اس نے ڈٹ کر کھایا تھا۔

مجھے شک ہوا کہ شاید ان دونوں بیوی کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا ہو۔ تب ہی میں اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگی اور آخر میں وہ مان گیا کہ وہ میری باتوں سے متاثر ہوا تھا۔

میں اسے اپنے گھر کا پتانی الوقت نہ دیتی لیکن اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے کہ آیا واقعی ان کے مابین کوئی جھگڑا چل رہا ہے۔ میں نے اپنا ایڈریس اسے دے دیا۔

شاید لوہا گرم تھا۔ تب ہی تو آج صبح ہی اس کا فون آ گیا کہ وہ شام کو میری طرف آرہا ہے۔ بے شک میں یہی چاہتی تھی کہ دن رات وہ میری گلیوں کے چکر لگائے۔ لیکن اپنا اتلا ڈالپن اس پہ ظاہر کر دیتی تو پھر میری شخصیت کا اسرار بھلا کیا باقی رہ جاتا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ آج میں بہت مصروف ہوں۔ فیکٹی میں کوئی پارٹی ہے۔ اس لیے آج نہیں مل سکتی حالانکہ میں بالکل مصروف نہیں تھی۔ بلکہ اسے انکار کرنے کے بعد تو اور بھی خالی پن کا احساس ہونے لگا تھا۔ نہ جانے آج کی شام کیسے گزری گی۔ مزاتو تب ہے جب ایسی ہی بے تابی اسے بھی ہو۔ اچانک پارسا جیوں آ کر مجھ سے لپٹ گئی تو میں اپنے خیالات سے چونکی۔

”مما! آج بھی ایوننگ میں کہیں جانے کا پروگرام ہے؟“
 ”ارے نہیں میری جان، آج کی ایوننگ اینڈ نائٹ مما آپ کے ساتھ گزاریں گی۔“
 ”روزانہ آپ ایسے ہی کہتی ہیں۔ لیکن آپ پھر بھی چلی جاتی ہیں۔“ میں پارسا کو دیکھنے لگی۔ اس کا معصوم سا گول منہ چہرہ۔ شفاف آنکھیں مجھ سے شکوہ کناس تھیں۔

اچانک مجھے کچھ ہوا اور میں تیزی سے پارسا کے سامنے سے اٹھ گئی۔ پارسا میری ٹانگوں سے لپٹنے لگی۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔

”پلیز روز! یہاں سے چلی جاؤ۔ پلیز لیوی الون، خدا کے واسطے مجھے تنہا چھوڑ دو۔“ میں بے ساختہ چلانے لگی تھی۔

میری بیٹی پارسا جسے میں پیار سے روز کہتی تھی سراسیمہ ہو گئی اور دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس وقت میرے خلیجان کا صرف ایک ہی حل تھا میں نے فریج کھولا اور ایک سبز رنگ کی بوتل نکالی۔
میرے اندر ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی لاوا پک رہا تھا۔ تب ہی بوتل ہونٹوں سے لگتے ہی آدھی ہو گئی۔ میرا پورا وجود پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔



رات کے ایک بجے جب میں گھر پہنچا تو حسب معمول فہد اور فرنام سوئے ہوئے تھے۔ جبکہ ماریہ جاگ رہی تھی۔
اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بے تحاشا روچکی ہے۔ میں خود اتنا تھکا ہوا تھا کہ جلد از جلد سو جانا چاہتا تھا۔ میں چیخ کر کے کمرے میں آیا تو وہ میرے قریب آگئی۔ یعنی اس کی عقل ٹھکانے آچکی تھی۔
اور میرا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح معافی مانگ کر میرے کھانے پینے کی فکر کرے گی اور بات رفع دفع ہو جائے گی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔
”ابو کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ نشتر ہاسپٹل وارڈ نمبر ایک میں ایڈمٹ ہیں۔ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔“
یہ کہتے ہوئے اس کے آنسو گرنے لگے۔

حالانکہ وہ میرے بھی چچا تھے اور ابو کی ڈیڑھ کے بعد وہی خاندان میں بڑے رہ گئے تھے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میرا دل سخت ہو گیا تھا۔
”قدرت کے کام میں کون دخل اندازی کر سکتا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر تو انہیں تیس سال سے ہے۔“ میں لاپرواہی سے بولا۔

میں اپنی زیادتی کو سراسر بھول چکا تھا۔
”میں فی الحال ان کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ آپ کا انتظار اس لیے کر رہی تھی کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔“
”اس سے پہلے میں نے تمہیں کبھی روکا ہے۔ تمہارے والدین سے ملنے کے لیے۔“ اس بار میرا لہجہ نرم تھا۔

وہ جلدی جلدی چادر اوڑھنے لگی۔
”بچوں کو یہیں چھوڑ کر جاؤ گی؟“

”اگر یہاں چھوڑ گئی تو گھر میں اکیلے بچے ڈر جائیں گے۔ انہیں بھی ساتھ لے جاتی ہوں۔ اسمارہ کے پاس اتار دوں گی۔ پھر ہم ابو کے پاس چلے جائیں گے۔“
میں خاموش ہو گیا۔ فہد کو اس نے اٹھایا اور فرنام کو میں نے۔ جب میں نے فرنام کو کاندھے سے لگایا تو اس کے پاؤں میرے گھٹنوں تک تھے۔
”فرنام کا قدم میرے اوپر جا رہا ہے۔“ ہم دونوں آگے پیچھے کر کے سے نکلے تھے۔

”اگلے ماہ فرنام سات سال کی ہو جائے گی۔“

اس کا لہجہ نہ صرف سنجیدہ بلکہ کچھ کچھ جتانے والا بھی تھا۔ مجھے واقعی حیرت ہوئی۔
میں نے گاڑی کا دروازہ کھول کر فرنام کو اور اس نے فہد کو پیچھے لٹا دیا۔ اس کے بعد وہ دروازہ لاٹ
کرنے لگی۔ میں گاڑی سڑک پہ نکال چکا تھا۔ وہ تیزی سے آکر میرے برابر بیٹھ گئی۔
”ہماری شادی کو آٹھ سال ہونے والے ہیں اور فرنام شادی کے سات ماہ کے بعد ہی پیدا ہو گئی
تھی۔“

حالانکہ یہ کوئی اتنی پرانی بات تو نہیں تھی۔ لیکن مجھے ہر بات ہی ایسے لگنے لگی تھی۔ جیسے بہت ہی
پرانی ہو۔

مار یہ شادی کے فوراً بعد ہی پریکٹ ہو گئی تھی اور مجھے بہت برا لگا تھا۔ اتنی جلدی ایسا کچھ نہیں ہونا
چاہیے تھا۔

”ابھی تو ہم نے ہنی مون بھی نہیں منایا اور تم پہ گل کھلا کر بیٹھ گئیں۔ دیکھنا اماں جی کتنی پابندیاں
لگائیں گی۔ اب تمہارے ہی نہیں میرے بھی گھر سے نکلنے پر پابندی ہو جائے گی۔“
وہ نوبیا ہتا دلہن تھی۔ میری گفتگو پہ سرخ ہو گئی۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی چلا گیا۔
وہ گویا میری ہی مجرم بنی کھڑی تھی۔ مجھے اس پہ ترس بھی آیا اور پیار بھی۔ مسکراتے ہوئے میں نے
اسے خود سے قریب کر لیا تھا۔

وہ وقت بھی کتنا خوب صورت تھا۔ میں ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔ اور برابر میں بیٹھی مار یہ سے
مخاطب ہوا جو چپ چاپ آگے پیچھے دوڑتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔

”جب تمہیں فرنام ہونے والی تھی تو تم روز بہ روز کتنی خوب صورت ہو رہی تھیں۔ تمہیں یاد ہے میں
ہر وقت تمہارے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ تمہارے سوا مجھے کچھ اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔“

میں اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ شاید وہ اپنے باپ کے غم میں تھی۔

میں نے سر جھٹکتے ہوئے موڑ کاٹا اور اس کے ساتھ ہی اپنے ماضی کا ایک اور ورق پڑھنے لگا۔

شاید میری زندگی کا وہ سب سے اچھا موڑ تھا۔

مجھے اپنے ہنی مون کا وقت برباد ہونے کی کتنی فکر تھی اور تب ہی اماں جی کا ارادہ عمرہ کی سعادت
حاصل کرنے کا ہوا تو انہوں نے مجھے اور مار یہ کو منتخب کیا کہ وہ ہمارے ساتھ عمرہ ادا کرنے جائیں گی۔

اس خوشی یہ مار یہ پھولی نہ سمائی۔ جبکہ میں خاموش ہو گیا۔

حالانکہ خوش تو مجھے بھی ہونا چاہیے تھا کہ مجھے دو دو سعادتیں ایک ساتھ مل رہی ہیں۔ یعنی بوڑھی
ماں کی خدمت اور خداوند تعالیٰ کے گھر اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی سعادت لیکن میں
اتنا بد بخت اور بد نصیب تھا کہ ایک ہی ملال لیے بیٹھا رہا۔

کہاں تو ہنی مون کے عیش و مزے اور کہاں مارے باندھے کی عبادت۔ ہنی مون کے لیے میرا
ارادہ سوئٹزر لینڈ جانے کا تھا۔ الیاس اور اس کی فیملی عرصہ دراز سے وہیں مقیم تھی وہ میرا بچپن کا جگری یار
تھا۔

پیہ میرے لیے کبھی مسئلہ نہیں تھا جبکہ وہاں قیام و طعام اور سیر و تفریح کی آفر وہ کئی بار کر چکا تھا۔ سوئٹزر لینڈ سے سعودی عرب جانے کا سفر میرے لیے بالکل اچانک اور غیر ارادی تھا۔ میں نے صرف اماں جی کی وجہ سے ہامی بھری تھی۔

مکہ معظمہ پہنچ کر جب جب خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑی تو اماں جی آبدیدہ ہو گئی تھیں اور انہوں نے میرے کان میں آہستگی سے کہا تھا۔

”اللہ کے گھر پہلی نگاہ ڈال کر بندہ جو رب سے مانگتا ہے اللہ رب العزت وہی عطا کرتے ہیں۔ تم لوگوں نے جو کچھ مانگنا ہے، صدقِ دل سے مانگنا اور سب سے بہتر دعا اس وقت امتِ محمدیہ کی مغفرت کی دعا ہے۔“

گو کہ اس وقت میں نے دعا تو مانگی لیکن ابھی تک سوچتا ہوں نہ جانے کیا مانگی تھی۔ بس بے چینی تو ایک ہی تھی کسی اچھے سے نزدیکی ہوٹل میں دو کمرے مل جائیں اور جب ہم خانہ کعبہ سے نکلے تو ہمیں بالکل ہی قریب ایک ہوٹل میں دو کمرے مل گئے۔

میں نے جلدی جلدی سامان رکھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میری کب آنکھ لگی۔ یہ رمضان المبارک کے دن تھے روزہ کھانے میں ابھی وقت تھا۔ جب ماریہ نے مجھے جھنجھوڑا۔

”روزہ کھانے میں صرف چند منٹ باقی ہیں، اب تو اٹھ جائیے۔“ میں ہڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”اماں جی کہاں ہیں؟“

”وہ آپ سے ناراض ہو کر یہاں سے نکلی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ خانہ کعبہ میں روزہ کھولیں گی۔ میں بھی ان کے ساتھ جا رہی تھی لیکن آپ کی وجہ سے رک گئی۔“

اماں جی کا خیال تھا اگر میں بھی گئی تو آپ سوتے رہیں گے۔ نمازیں تو قضا ہوئی ہی ہیں، روزہ بھی دیر سے کھولا تو مکروہ ہو جائے گا۔“

میں شرمندگی سے اٹھ بیٹھا۔

”تمہیں اماں جی کو اکیلے نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ ابھی دیکھنا، آئیں گی نا تو شوگر بھی ڈاؤن ہو چکی ہوگی اور بلڈ پریشر۔۔۔“

”یہ سب کچھ تم نے بنایا ہے؟“

میں ماریہ کی تعریف کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ماریہ نے فوراً کہا۔

”ہم نے مل کر بنایا ہے۔ البتہ بازار سے سامان وغیرہ میں خرید کر لائی تھی۔“

”تم اس حال میں بازار میں پھر رہی تھیں؟ میں سویا ہی تو تھا مارتو نہیں تھا۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا

تو؟“

ماریہ نے میری طرف جن نظروں سے دیکھا میں زمین میں گڑ کر رہ گیا۔



پندرہ دن بعد ہم واپس پاکستان آ گئے تھے۔

ابھی چار پانچ روزے باقی تھے۔ ماریہ خود کو بے حد نڈھال محسوس کر رہی تھی لہذا اماں بی نے اس کے والدین کے گھر بھیج دیا۔ ان کا ارادہ تھا عید کی صبح بلائیں گی۔ جبکہ میں چاند رات ماریہ کے ساتھ منانا چاہتا تھا۔ اماں جی کو بتائے بغیر میں ماریہ کو اس کے گھر سے لے آیا۔ ساری رات ہم گھومتے پھرتے رہے۔ تقریباً اذانوں کے وقت گھر آئے۔

میں گہری نیند سو رہا تھا جب کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔ میرا خیال تھا ماریہ مجھے نماز کے لیے اٹھا رہی ہوگی۔ میں اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ بھی کمرے سے چلی گئی اور میں پھر گہری نیند میں۔ فجر تو قضا ہو گئی تھی۔ نماز عید بھی جاتی رہی۔ تقریباً گیارہ بج رہے تھے جب اسید بھائی آئے اور انہوں نے مجھے سخت سست کہہ کر جگا یا اور پھر یہ اطلاع فراہم کی کہ میرے ہاں بیٹی ہوئی ہے۔

میری ساری نیند ہوا ہو گئی۔ ”ابھی تو ماریہ کو کافی وقت تھا۔“ میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔

”پچھلے سے غزالہ آپا بھی آتی دکھائی دیں۔“

”ماریہ کے ستوا سی بیٹی ہوئی ہے۔ ماریہ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ البتہ بیٹی کی حالت نازک ہے۔“

”ماریہ کون سے اسپتال میں ہے؟“

”فاطمہ میڈیکل سینٹر میں۔“

”یہ تو شکر کرو کہ ہم لوگ عید کی وجہ سے آئے ہوئے تھے۔ ورنہ اماں جی بے چاری کہاں بھاگ دوڑ کرتیں۔ عاطف بھی ابھی نا سمجھ ہے۔“ غزالہ آپا کہتے ہوئے الماریوں میں سامان ٹٹولنے لگیں۔

”اب تم جلدی سے اٹھ کر نہا دھولو۔ آنے جانے والوں کا تاجنا بندھ جائے گا۔ تمہیں وہاں ہونا چاہیے۔“ وہ جلدی جلدی سامان بیگ میں رکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

میرے دل پہ یک دم پابست سی چھائی تھی۔ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میری بیٹی بھی ہو سکتی ہے۔ ہمہ وقت اماں جی مجھے بیٹے کی دعائیں دیتی تھیں۔ مجھے لگتا تھا ماریہ بھی دل لگا کر بیٹے کی دعائیں مانگتی رہتی ہوگی۔ گو کہ مجھے گمان تھا کہ بیٹا ہی ہوگا۔ مجھے کم صم بیٹھا دیکھ کر غزالہ آپا میرے نزدیک آگئیں اور میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”بیٹی کی فکر نہ کرنا۔ بیٹیاں تو بڑے بخت والی ہوا کرتی ہیں۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔“

”اللہ۔“ میرے اندر اللہ کا نام اس طرح گونجا کہ میں سر تپا کانپ گیا۔ نہ جانے میں کیسے وہاں سے اٹھا تھا۔

غسل سے فارغ ہو کر جب میں فجر کی قضا نماز ادا کر رہا تھا تو میرے اندر سے آواز آئی۔ کیا جو نمازیں پڑھتے ہیں ان کے بیٹیاں نہیں ہوتیں۔ یہ میں نے کسی بات سوچی کہ ماریہ پانچ وقت کی نمازیں ہے تو ہمارے بیٹی نہیں ہوگی؟

میری بھی تو چار بہنیں تھیں کیا میرے ماں باپ ارکان اسلام کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے تھے؟ ہر گز نہیں۔ مجھے اپنی سوچ پہ شرمندگی ہونے لگی۔

حالانکہ اصل بد نصیبی تو میری یہ تھی کہ میں حال ہی میں عمرہ کی سعادت سے سرفراز ہو کر آیا تھا اور

میں نے عید کی نماز بھی ادا نہیں کی تھی۔

غزالہ آپا سارا سامان لے چکی تھیں، ان کو لے کر میں اسپتال پہنچا۔

اسپتال کے لاؤنج میں میرے سارے سر سب ہی موجود تھے، وہ سب اتنے خوش تھے کہ میں پہلے

تو چونک سا گیا۔

”بھئی مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹی کی نعمت سے نوازا ہے۔“ قاسم انکل کے یہ الفاظ مجھے اجنبی

سے لگے۔

وہاں کمرے میں اماں جی، آنٹی، میری تینوں بہنیں، بڑی بھابھی اور ماریہ کی چھوٹی بہن موجود

تھی۔ سب بہت خوش لگ رہے تھے۔

میں دو چار لمحے طوعاً کرہاً وہاں رکا پھر باہر نکل گیا۔

باہر آیا تو اسید بھائی سامنے سے آتے نظر آئے، کہنے لگے۔

”ماریہ کی چھٹی تو شام تک ہو جائے گی۔ البتہ بچی کی حالت صحیح نہیں ہے۔ دو چار دن ڈاکٹر زیہیں

رکھنے کا کہہ رہے ہیں تو میرا یہ خیال ہے جب تک بچی یہیں ہے، ہم ماریہ کو بھی یہیں رکھیں گے۔ تمہارا کیا

خیال ہے؟“

میں کیا خیال ظاہر کرتا مجھے تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ بچی زندہ بچ جائے گی۔ انتہائی نگہداشت

میں جب غزالہ آپا نے شیشے کے باکس میں لیٹی ہوئی بچی دکھائی تو مجھے تو ایسا لگا جیسے یہ چند سائیس اور لے

گی اور ختم ہو جائے گی۔“

لیکن آج وہ اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ میرے گھٹنوں تک اس کے پاؤں پہنچ چکے تھے۔ میں ماضی سے

حال میں لوٹ آیا۔

ہم نشتر پارک اسپتال کی سرخ عمارت میں داخل ہوئے۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد ماریہ تیزی

سے گاڑی سے اتری اور وارڈ نمبر ایک کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ میں ماریہ کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہاں سب

ہی موجود تھے۔ سب کے چہروں پر تشویش تھی۔ ماریہ کو سامنے اپنا بھائی نظر آیا تو وہ اس کے کاندھے سے

لگ کر سکنے لگی۔ عرفان کا چہرہ بھی اتر ا ہوا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے اب انکل کی؟“ میں نے عرفان سے پوچھا۔

”ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے، ان کے دو والو بند ہیں۔ ڈاکٹر زکا کہنا ہے فوری بائی پاس کرانا ہوگا۔

انہیں لاہور لے جانا پڑے گا۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ ٹکٹس وغیرہ کا بندوبست کرنا تھا۔“

”سجائ اور ذیشان ٹکٹس تو لے آئے ہیں لیکن ڈاکٹر زکا کہنا ہے کہ وہ صبح سات بجے تک ابو کو یہیں

رکھیں گے، پھر یہاں سے جانے کی اجازت دیں گے۔“ عرفان نے تفصیل بتائی۔



تقریباً صبح کی سپیدی پھوٹ رہی تھی۔ میں باہر لان میں نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ یک دم مجھے

کسی نے جگایا۔

”قاسم انکل کا انتقال ہو گیا ہے۔“ یہ خبر دینے والا عاطف تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ عاطف خود بھی رو رہا تھا۔ میں دوڑتا ہوا ان کے روم تک آیا۔ ان کی ڈیڈ باڈی اسٹریچر پر باہر لے جانی جا رہی تھی۔

میرے قدم زمین میں گڑتے چلے گئے۔ میں نے کل ان کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ایسی بدتمیزی۔ جس کا انہوں نے اتنا صدمہ لیا کہ دنیا سے ہی چلے گئے۔

”کیا میں خود کو کبھی معاف کر سکوں گا۔“ میں نے اذیت سے آنکھیں بند کر لیں۔

ان کے چاروں بیٹے اور دونوں بیٹیاں بری طرح رو رہے تھے اور نہ جانے کون کون انہیں سنبھال رہا تھا۔ میں زیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ مجھے بہت سے لوگوں نے اپنے سینے سے لگایا۔ لیکن میری آنکھیں پتھر اچکی تھیں اور وجود بے جان ہو گیا تھا۔

مجھے اماں جی اور بابا جی کی موت کے وہ لمحے سامنے نظر آنے لگے جو ہم پہ قیامت بن کے ٹوٹے تھے۔ یہی قیامت اب ماریہ پہ ٹوٹی تھی۔

میں اسے بڑھ کر اپنے سینے سے لگالینا چاہتا تھا۔ لیکن میں ایسا بھی نہ کر سکا اور سب لوگ وہاں سے نکلتے چلے گئے۔



قاسم انکل کی تجہیز و تکفین کے بعد بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں تین دن وہاں رہا اور جو تھے دن میں بھی اپنے گھر آ گیا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا قاسم انکل کی موت میری زندگی کا ایک نیا موڑ ثابت ہوگی۔

ماریہ اور بچے وہیں تھے اور میں گھر میں اکیلا۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔

قاسم انکل کا چہرہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹا نہیں تھا۔

اس سے قبل میں اپنی ہی عدالت میں خود کو مجرم قرار دے دیتا۔ میں نے فرق کھولا اور اس میں رکھا اپنا خاص مشروب نکال کر اپنے اندر انڈیل لیا۔

پھر تو سارا اضطراب، سارا خوف و بے چینی۔۔۔ سب کچھ زائل ہو گئے اور میں اس قدر اطمینان سے سویا کہ بتا نہیں سکتا۔

تقریباً دن کے ساڑھے بارہ بجے میں نیند سے بے دار ہوا تو میرے اعصاب بری طرح شکستہ رہے تھے۔ آٹھ دس گھنٹے سونے کے بعد بھی مجھے نہیں لگتا تھا کہ میں سویا ہوں۔ دو تین گھنٹے تک میں اپنے بستر میں ایسے ہی پڑا رہا اور ٹی وی دیکھتا رہا۔ ٹی وی نہ تو میری تھکن ختم کر سکتا تھا اور نہ ہی بے زاری۔۔۔ میں نے اکٹا کر ٹی وی آف کر دیا۔

ماریہ اور بچوں کے بغیر گھر خالی لگ رہا تھا۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ ماریہ اپنے والدین کے گھر رہنے جاتی ہو۔ ابھی میں نہانے کے ارادے سے کپڑے نکال ہی رہا تھا کہ ماریہ کا فون آ گیا۔

”آپ کہاں ہیں؟“
 ”فی الحال تو گھر پر ہی ہوں۔ بس جم جانے کی تیاری کر رہا تھا۔“
 ”یہاں سے ہوتے جائیے۔“

”اب کیا ضرورت ہے آنے کی؟“
 ”ولید! ماریہ کی گلوگیر آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تو میں کچھ سنبھل گیا۔“
 ”لوگ آرہے ہیں۔ آپ کو بھی صبح شام کم از کم ایک گھنٹہ آنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مجبوراً ہامی بھری۔ ورنہ میرا ہاں جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت ماریہ کو میری ضرورت ہے۔
 میں نے ابھی فون رکھا ہی تھا کہ ڈور بیل بجنے لگی۔
 ”ارے بھئی کون ہے، آرہا ہوں۔“

میرا خیال تھا حسیب وغیرہ ہوں گے اور افسوس کے لیے آئے ہوں گے۔ لیکن دروازہ کھولا تو سامنے مہربانو سیاہ لباس میں ملبوس کالا دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھی۔
 ”آپ! مجھے خاصی حیرت ہوئی۔“

”آپ کے سر کے انتقال کا پتا چلا تھا۔ افسوس کرنے آئی تھی۔“
 ”ارے اندر آئیے۔“

”آپ کی مسز ہیں؟“ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
 ”نہیں، ابھی وہ ادھر ہی ہیں۔“ (اور شاید تب تک ادھر ہی رہیں جب تک ان کی والدہ کی عدت ختم نہیں ہو جاتی) یہ میں نے گہری آہ بھر کر سوچا تھا۔

”اچھا۔۔۔“
 ”بیٹھیے نا۔“

”میں پھر آؤں گی۔۔۔ آپ کی مسز بھی نہیں ہیں اور ان کے پیرنٹس کا گھر تو میں جانتی بھی نہیں۔“
 ”آپ کو کیسے علم ہوا کہ میرے سر انتقال کر گئے ہیں حالانکہ اس کے بعد تو ہم ملے بھی نہیں۔“
 مجھے حیرت تھی۔

”دراصل میں نے آپ کا جم جوائن کر لیا ہے۔ وہیں پتا چلا تھا۔“
 ”میں تو تین دن سے گیا نہیں۔ اس لیے نئی انٹریز کا تو مجھے پتا نہیں۔ ویسے ٹائم مل جاتا ہے آپ کو جم جانے کا؟“

”انسان اگر چاہے تو وقت نکل ہی آتا ہے۔“
 ”دیری گڈ، یہی سوچ ہونی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں اگر ہم سال میں تین ماہ ایکسرسائز کے لیے صرف کر دیں تو ہمارے سال بھر کا بیٹنس پورا ہو جاتا ہے اور موٹاپا ہم پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ ویسے تین ماہ کی آفران لوگوں کے لیے ہے جو بہت مصروف ہیں اور وقت نہیں نکال سکتے۔ ورنہ ڈیلی ایکسرسائز کا تو لطف ہی اور ہے۔“

”الطف ہی نہیں رزلٹ بھی اچھا ہوتا ہے۔“ اس نے ستائشی انداز میں میرے جسم کی طرف دیکھا۔
میری ساری تھکن اتر گئی اور یک دم ہی میرے ارد گرد کا ماحول بدل گیا۔
”کیا لیں گی آپ ٹھنڈا یا گرم؟“

”ارے نہیں، میں چلتی ہوں، آپ کی مسز آجائیں تو پھر آؤں گی۔“
پتا نہیں کیوں وہ ابھی تو میں یک دم بے چین سا ہو گیا۔
”چلی جائیے گا اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“ میں جلدی سے اس کے لیے کولڈ ڈرنکس لے آیا۔
”دیکھیے ابھی تو میں نے اپنی ڈائٹ کنٹرول کی ہے اور آپ میری کیلیوریز بڑھا رہے ہیں۔“
”اس سے کچھ نہیں ہوتا۔“

میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اس دوران ہمارے درمیان بس اتنی ہی بات چیت ہوئی جتنی دیر
ہمارے گلاس خالی نہیں ہوئے۔ اس کے بعد وہ گلاس رکھ کر کھڑی ہو گئی۔
”اچھا میں چلتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اچانک اپنا سر پکڑا اور پکرا کر گر پڑی۔
میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ اور سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ میں نے اسے کون سا مشروب
پلا دیا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔

”مہربانو، مہربانو۔“ میں نے اسے ہلایا مگر وہ بالکل بے سدھ پڑی تھی۔
”یا اللہ یہ کیا مصیبت ہے، ڈاکٹر کو بلاؤں۔ اگر کوئی آگیا تو؟“
”ابھی میں کوئی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ ڈورنیل پھر بجنے لگی حالانکہ میرے دل میں کوئی چور نہیں
تھا۔ پھر بھی میں خوف زدہ ہو گیا تھا۔“

میں نے بے سدھ پڑی مہربانو کی طرف دیکھا۔ پھر بیرونی دروازے کی طرف۔
پھر ہمت کر کے دروازہ کھولا۔ سامنے حسیب کھڑا تھا۔ حسیب کو دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی۔
”یار! اچھا ہوا بروقت آ گئے۔“ مجھے گھبرا یا ہوا دیکھ کر حسیب بھی پریشان ہو گیا۔
”کیا ہوا، بھابھی کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
”یار اسے تو چھوڑو۔ ادھر آؤ۔“

میں اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔
”یہ کون ہے؟“ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔
”تم نہیں جانتے اسے؟“ مجھے اس سے زیادہ حیرت ہوئی۔
”یہ تو وہی خاتون ہیں جو تمہیں بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال لے گئی تھیں۔“
”اس کے علاوہ یہ آج کل ایک سرساز کے لیے جم بھی تو آرہی ہیں۔“ میں نے حسیب کو جتلانے
والے انداز میں بتایا۔

”شاید کیونکہ میں جینٹس کا انسٹرکٹر ہوں۔ لیڈیز کا مجھے کیا علم۔“ وہ لا پرواہی سے کا ندھے اچکا کر
گویا ہوا۔

”نی الحال یہ بتاؤ کہ اسے کیا ہوا ہے؟“

”یار! یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔ مجھ سے بچا کی تعزیت کرنے آئی تھی خود بخود بے ہوش ہو گئی۔“
 ”خود بخود بے ہوش ہو گئی؟“ اس نے سامنے رکھے خالی گلاسوں کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں
 زمین میں گر گیا۔

”یار ولید! کچھ تو خیال کرتے۔ وہ تمہارے ہاں افسوس کرنے آئی تھی اور تم نے۔۔۔“
 ”خدا کی قسم، میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو خود پریشان ہوں کہ یہ کیا ہو گیا۔“
 ”اور۔۔۔ اور وہ جو مشروب ہے، تو میرے بیدروم والے فریج میں ہوتا ہے۔ میں نے تو یہاں
 سے عام کوک نکال کر پلائی تھی۔“ میں کچھ اکتے ہوئے وضاحت کر رہا تھا۔ حسیب کے چہرے پہ مسخرسا
 لہرایا۔

”خیر چھوڑو اس بات کو۔“
 میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہا ہوں۔ تم کم از کم اپنا حلیہ درست کرو اور فوراً جم پہنچو۔“ مجھے
 اس نے جس طرح حکم دیا تو میں شرمندہ ہو گیا۔
 میرے احسانوں کی بدولت ہی وہ مل کلاس لڑکا آج مسٹر پنجاب باڈی بلڈر جمپین بنا تھا۔ لیکن آج
 بنا کسی جرم کے ہی میں حسیب کے سامنے خود کو بہت کتر محسوس کر رہا تھا۔
 اس نے مہربانو کو بازوؤں میں ایسے اٹھایا جیسے چھوٹے بچے کو اٹھا لیتے ہیں۔
 مہربانو اس کے بازوؤں میں با آسانی سا گئی اور وہ مضبوط قدموں سے اسے لے کر باہر نکل گیا۔
 میں اسے گاڑی تک چھوڑ کر آیا۔
 وہ لوگ چلے گئے تو میرے اعصاب کچھ ڈھیلے ہوئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہی میں تیار ہو کر جرم
 کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔



تھوڑی دیر بعد حسیب بھی جم چلا آیا تھا اور اس نے مجھے تسلی دی کہ وہ مہربانو کو اس کے گھر چھوڑ کر
 آرہا ہے۔ میں اس کا بہت مشکور تھا۔ اچانک اس نے پوچھا۔
 ”سچ سچ بتاؤ معاملہ کیا تھا؟“

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں حسیب جیسے انسان کو صفائی پیش کروں گا۔
 ”مار! کوئی بھی تو معاملہ نہیں تھا۔ میں تو خود حیران ہوں کہ کیا ہوا۔“
 ”اگر ماریہ بھابھی کو پتا چل جائے تو مانو تمہاری ایسی کی تیسری ہو جائے۔“ وہ ماریہ کی فطرت سے
 خوب واقف تھا۔ میں ہنسنے لگا۔

پھر بات ہنسی ہنسی میں آئی گئی ہو گئی۔ لیکن ایک اسرار جو اس کی بے ہوشی سے وابستہ تھا اس نے مجھے
 اس کے گھر جانے پہ اکسایا۔ میں رات گھر دیر سے لوٹا تھا۔ ماریہ نے مجھے آنے کو کہا تھا۔ لیکن میں نہیں
 جاسکا۔ سارا شیڈول خراب ہو گیا تھا۔
 اب رات کا ایک بج رہا تھا۔ سوچا مہربانو کو فون کر کے اس کی خیریت پوچھوں۔ میری پہلی ہی بیل

پہ مہربانو نے فون ریسو کر لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ جاگ رہی تھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

”آپ نے تو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”میں نے؟“ میں اس کے غماز زدہ لہجے سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔

”کیا بلایا تھا آپ نے مجھے؟“

میں پھر چکر لگایا اور سوچنے لگا میں نے جلدی میں کہاں سے مشروب اٹھایا تھا۔ ہاں میں کمرے میں تو گیا تھا لیکن کیوں گیا تھا۔ میں نتیجہ نہ اخذ کر سکا۔ اس نشے نے میری یادداشت یکسر کمزور کر کے رکھ دی تھی۔ میں خود کو ملامت کرنے لگا۔

”کچھ بھی نہیں۔ ایک سادہ سا مشروب بلایا تھا۔“ میں نے پھر وضاحت کی۔

”نہ جانے آپ کے گھر کے مشروب کیسے ہیں۔“

”کبھی آپ بے ہوش ہو جاتے ہیں اور کبھی ہم۔“ میں ہنس پڑا۔

”یہ بات تو واقعی سوچنے والی ہے۔ بہر حال اب تو ٹھیک ہیں آپ؟“

”ہاں کوشش تو کر رہی ہوں ٹھیک ہونے کی۔“

”اچھا پھر آپ آرام کریں، صبح بات ہوگی۔“

”ارے، ارے نہیں۔ فون مت بند کیجیے گا میں اس وقت اکیلی ہوں۔ آپ سے بات کر کے میرا

تھوڑا سا وقت اچھا گزر جائے گا۔“

”اچھا بانی گھر والے کہاں ہیں؟“ میں نے ذرا دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”مہندی کا کوئی فنکشن تھا خاندان میں۔ وہاں گئے ہوئے ہیں، میری طبیعت صحیح نہیں تھی۔ اس

لیے میں گھر پہ ہوں۔“

”آئی ایم سوری، میری وجہ سے آپ فنکشن سے محروم ہو گئیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ مجھے دیے بھی ایسے فنکشن زیادہ اچھے نہیں لگتے۔ آپ کی مہربانی سے مجھے

خلاصی کا بہانہ تو ملا۔“ وہ الٹا میری ہی مشکور ہوئی تو مجھے اس سے اپنائیت کا احساس ہونے لگا۔

پھر یہ اپنائیت بڑھتے بڑھتے ملاقاتوں میں تبدیل ہو گئی

جب سے مہربانو نے جم آنا شروع کیا تھا میرا جم میں دل لگنے لگا تھا۔ پھر اچانک ایسا ہوا مہربانو

نے جم آنا چھوڑ دیا۔ حالانکہ یہاں بہت سے لوگ ایسا کرتے تھے۔

لیکن مہربانو کی غیر حاضری نے جیسے مجھے ادھورا کر دیا۔ میرے فون کر کے پوچھنے پہ اس نے

چھوٹے ہی کہا تھا۔

”آگیا آپ کو میرا خیال؟“

یعنی وہ دو دن سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے بتایا کہ تاحال میری مصروفیت بہت ہے۔ میرا ایک پاؤں اپنے سرال میں ہے، ایک

گھر پہ۔“

”ابھی تک آپ کی سزن نہیں آئیں؟“ اس نے قدرے تعجب سے پوچھا۔
 ”نہیں، ان کی والدہ کی طبیعت سخت خراب ہے۔ وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ اس لیے ماریہ ابھی وہیں رہے گی۔“

”آپ سنائیں، آپ کو کیا ہوا؟“
 ”آپ کو کیا دلچسپی ہے میری طبیعت سے؟“ اچانک ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔
 مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مگر کچھ تو کہنا تھا۔
 ”اس لیے کہ ہمارے درمیان ایسا تعلق ہے کہ ہم ایک دوسرے کا حال پوچھ سکتے ہیں۔“
 ”اجنبیوں کی طرح۔۔۔“ اس کا لہجہ شکوے سے بھر پور تھا۔
 مجھے بھلا اور کیا چاہے تھا صرف یہی موقع۔
 ”چلیے، اپنوں کی طرح پوچھ لیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔



ملازم نے آکر اطلاع فراہم کی کہ کوئی صاحب مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ مجھے کامل یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ تب ہی میں نے سارے انتظامات پہلے سے ہی کر لیے تھے۔ روز کو واپس ہاسٹل بھجوا دیا تھا اور میری تیاری بھی شاندار تھی۔

میں اچھی طرح جانتی تھی ولید جیسے لوگ کس فطرت کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ سب کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن۔ دوسرے کے کاندھے پہ بندوق رکھ کر۔

وہ بنیادی طور پر عیش پرست آدمی تھا۔ اپنی زندگی تمام تر قید و بند سے آزاد ہو کر گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن حدوں سے تجاوز کرنے کے لیے اسے تھوڑا سا حوصلہ دینا تھا۔ کیونکہ جب میں اس کے گھر گئی تو مجھے اچھی طرح سے علم تھا کہ وہ اپنے گھر میں اکیلا ہے۔

اور یہ ساری معلومات مجھے حسیب نے دی تھیں۔ حسیب کا خیال تھا کہ ولید کمال اتنا لوز کرکٹر ہے کہ مجھے اپنے گھر میں اکیلا پا کر ضرور کوئی گھٹیا حرکت کرے گا۔ لیکن حسیب کی اس سوچ پہ مجھے اب ہنسی آرہی ہے۔ وہ بھلا اپنے گھر میں ایسا کیونکر کرتا۔

وہ تو ہماری سوچ سے بھی محتاط نکلا۔ جب میں نے بے ہوشی کا ڈرامہ رچایا تو اس نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا اور ٹھیک وقت پہ حسیب وہاں پہنچ گیا۔

میں نے حسیب سے کہہ دیا تھا۔ میں اپنا وہاں کچھ نہیں گنواؤں گی۔ اگر ایسا کچھ ہو گیا تو ولید کمال میری طرف کبھی نہیں دیکھے گا۔ ہاں وہ میرے گھر آئے اور تب کچھ ہو تو کم از کم اسے ندامت کی زنجیروں میں تو جکڑ سکوں گی۔ اور حسیب نے وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ پھر ٹھیک وقت پہ حسیب آ گیا۔

ولید کمال چاہتا تو میرے گھر آ سکتا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ پھر جب ہماری جم میں ملاقاتیں ہوئیں تو میں نے محسوس کیا وہ مجھ میں انوالو ہو رہا ہے۔ جب اسے میری عادت پڑنے لگی تو میں غیر حاضر ہونے لگی۔ وہ تب بھی میرے گھر نہیں آیا اور فون پہ مزاج پر ہی کرنے لگا۔

مجھے اس کی یہ منافقت سخت زہر لگی۔ مجھ سے زیادہ مردوں کی فطرت کو کون جان سکتا ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ لیکن اس طرح کہ وہ بدنام بھی نہ ہو اور زندگی کے مزے بھی لوٹتا رہے اور تب مجھے مجبوراً ملوہ کرنا پڑا اور بس اتنی سی بات تھی۔ راستہ آسان ہو گیا۔



گزشتہ شام کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ اتنا سب کچھ دبائے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جب میں اس کے گھر گیا تو ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ اس کا گھر درمیانے درجے کا تھا۔ لیکن سجا ہوا، صاف ستھرا۔ مختصر ڈرائنگ روم جس میں، میں بشکل من منٹ ہی بیٹھا تھا کہ وہی ملازم دوبارہ نمودار ہوا تھا۔

”آپ اندر تشریف لے آئیں۔“ میں ملازم کی رہنمائی میں مہربانہ کے کمرے میں آ گیا۔

وہ بستر پر نیم دراز تھی۔ مجھے دیکھ کر ذرا سا کسمائی۔

”ارے ٹیلی ریپے۔“ میں قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہو گیا تھا آپ کو؟“

”کچھ بھی نہیں بس۔“ وہ ہنس کر نالنے لگی۔

”دراصل میرے گلے میں ٹانسلز ہیں جس کی وجہ سے مجھے آئے دن ٹمپر پچر رہتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ ٹمپر پچر اتنا بڑھتا ہے کہ میں دنوں بستر سے اٹھ نہیں پاتی۔“

”یہ تو بہت تشویش کی بات ہے۔ آپ کو فوراً آپریشن کرالینا چاہیے۔“ دھیمی سی مسکراہٹ اس کے ہنرے پر آ کر گزر گئی۔

”آپریشن اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس ہزار لگیں گے اور آپ کی اس مسئلے سے ہمیشہ کے لیے جان بچھوٹ جائے گی۔“ میرا خیال تھا وہ اتنا انورڈ کر سکتی تھی۔

”آپ کے لیے کیا منگواؤں؟“

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

”ارے چھوڑیے اس مسئلے کو۔ آپ بتائیے کیا لیں گے؟“

میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی اس کی مالی پوزیشن کا اندازہ بھی لگا رہا تھا۔ اس کا گھر بہت شاندار نہیں تھا۔ لیکن مہنگے علاقے میں ضرور تھا۔ اس کے پاس میں نے بلیک گاڑی بھی دیکھی تھی۔

وہ لباس و انداز سے بھی کم حیثیت نہیں لگتی تھی۔ پھر اس نے اس طرح ظاہر کیوں کیا کہ وہ پندرہ بیس ہزار روپے انورڈ نہیں کر سکتی۔

”کھانا کھا کر آئے ہیں یا ابھی کھائیں گے؟“ مجھے اپنی طرف خاموشی سے تکتا پا کر اس نے اعتماد سے پوچھا۔

”آپ کو پتا ہے، مسز تو میری گھر پر ہیں نہیں۔ تینوں وقت بازار سے چل رہا ہے۔ جس کی وجہ سے پیٹ کی یہ پوزیشن ہو چکی ہے کہ ایک وقت کھاتا ہوں اور دو وقت صبر کرتا ہوں۔ بصورت دیگر ڈاکٹر کے

پاس حاضری لازمی دینا پڑتی ہے۔ اس لیے میں کھانا تو نہیں کھاؤں گا۔ البتہ سادہ پانی مل جائے تو نوازش ہوگی۔“

وہ اپنی کشادہ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری فرمائش پر مسکرا دی۔
 ”آج امی نے قیمہ کر لیے بنائے تھے۔ قیمہ کر لیے میری من پسند ڈش ہے۔ لیکن طبیعت کی وجہ سے کھانا کھا ہی نہیں سکی۔“
 اتفاق کی بات ہے کہ قیمہ کر لیے میری بھی پسندیدہ ترین ڈش تھی۔ ماریہ کی غیر موجودگی میں یا تو فاسٹ فوڈ سے گزارا ہو رہا تھا یا چائزز سے۔ قیمہ کر لیے کاسن کر میرے منہ میں بھی پانی آ گیا اور مروٹا بھی انکار نہ کر سکا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیبل پہ رکھی ایک گھنٹی بجائی۔ دوسرے ہی لمحے ملازم اندر آ گیا۔
 ”نئی بابا! کھانا لے آئے۔۔۔“ ملازم چپ چاپ باہر نکل گیا۔
 تب تک میں اس کے کمرے کا جائزہ لے چکا تھا۔ اس کا کمرہ قدرے مثلث تھا۔ درمیان میں خوب صورت پردہ اور دو درمیانے سائز کے بک ریک رکھے تھے۔
 میں کتابوں سے بھرے ریک دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”سب قانون کی ہی کتابیں بھر رکھی ہیں۔ رومینک ناول یا شاعری وغیرہ نہیں پڑھتیں آپ؟“
 اس نے اپنے سر ہانے کی طرف اشارہ کیا۔

وہاں بھی ایک بڑی سی بک شیف بنی ہوئی تھی اور جس میں رنگ برنگی کتابیں جگمگ رہی تھیں۔
 ”یعنی آپ صرف قانون دان ہی نہیں ایک باذوق خاتون بھی ہیں۔“ میں ستائشی انداز میں کتابوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تو وہ ہنس پڑی۔
 ”کیا آپ کو لگتا ہے میں بد ذوق ہوسکتی ہوں؟“ وہ مجھے نظروں میں تول رہی تھی۔ میں اس کا سوال سمجھ کر بھی انجان بننے لگا۔
 اسی اثناء میں ملازم کھانا لے آیا اور ایک ٹیبل درمیان میں رکھ کر اس نے سلیقے سے کھانا اس پہ لگا دیا۔

”آپ نے خواجہ تکلف کیا۔“
 اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور پلیٹوں میں سالن نکالنے لگی۔
 ”لگتا ہے یہ کمرہ صرف آپ کے ہی استعمال میں رہتا ہوگا۔“
 ”ہاں۔۔۔ میرے کلائنٹس وغیرہ آتے ہیں تو میں یہیں ملتی ہوں۔ پھر رات دیر تک اسٹڈی کا موڈ ہو تو بیڈ روم بھی ملحقہ ہے۔“

میرے دونوں والوں کے بعد اس نے نوالہ لیا تھا۔
 ”آپ کی امی نے کھانا بہت اچھا بنایا ہے۔ وہ ملنے نہیں آئیں؟“
 ”در اصل وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“
 ”اکثر وہ گھر پر نہیں ہوتیں۔“ میرے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا۔ مہربانو تھوڑا سا مسکرائی۔

اس لیے کہ وہ ایک سوشل خاتون ہیں۔ لیٹ نائٹس ان کی میٹنگز رہتی ہیں۔ شام میں ان کے وزٹ وغیرہ ہوتے ہیں۔ البتہ صبح وہ آپ کو ہمیشہ ہی گھر پہ ملیں گی۔“

”کتنے بہن بھائی ہیں آپ لوگ؟“

”ہم پانچ بہنیں ہیں۔ ایک بھائی ہے جو معذور ہے۔“

”اچھا!“ مجھے گہرا دھچکا لگا۔

”آپ کون سے نمبر پر ہیں؟“

”سب سے بڑا بھائی پھر میں اور پھر مجھ سے چھوٹی چار بہنیں جو زیرِ تعلیم ہیں۔“

”اور ابو کیا کرتے ہیں آپ کے؟“

”ابو سعودی عرب میں ہوتے ہیں۔ تقریباً چودہ سال ہو گئے وہ وہیں پہ مقیم ہیں۔ گئے تو معاشی تنگ دستی کی وجہ سے تھے۔ لیکن وہاں جا کر جب ایڈ جسٹ ہوئے تو شادی کر لی۔ وہاں والی بیوی سے بھی تین بیٹیاں ہیں۔“

”کیا کرتے ہیں وہاں۔۔۔؟“

”جو کام یہاں کرتے تھے، وہاں بھی وہی کام کرتے ہیں۔ پہلے تو معقول رقم بھیج دیا کرتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ سے بھی بھیج دیتے ہیں، بھی نہیں بھیجتے۔“

”ویسے آتے تو ہوں گے وہ یہاں؟“

”ہاں تقریباً دو تین سال کے بعد چکر لگا لیتے ہیں۔ مہینے بھر کے لیے۔“

”گویا آپ لوگوں کی ساری ذمہ داریاں آپ کی امی پہ ہیں۔“

”تقریباً۔۔۔ مجھ۔ اور امی۔۔۔۔“

”ذمہ داری علیحدہ لیکن آپ گواپنی صحت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔“ وہ چپ چاپ کھانا کھاتی رہی۔ چند لمحے ہمارے درمیان خاموشی رہی۔

”ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گی؟“

”وہ میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔“

”اگر آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔ آئی مین کیش رقم کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں لیکن آپ اپنے معاملے میں دیر نہ کیجیے اور آپریشن کرا لیجیے۔ معاملات بگڑنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ صحت ہے تو سب کچھ ہے۔“ میرے آفر کرنے پہ اس نے سر جھکا لیا۔

”یقین کیجیے میں آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ ادھار کے طور پہ مجھ سے لے لیں۔ پھر لوٹا دیجیے گا۔“

”میرا اپنے حالات بتانے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ آپ سے مدد مانگنا چاہتی تھی۔“ اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

”آپ میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہیں۔ آپ نے مجھے اپنا مان کر اپنے بارے میں اتنا کچھ بتایا۔ میرا بھی تو حق بنتا ہے کہ اس اپنائیت کا جواب اپنائیت سے دوں۔“ اس نے سر اٹھایا تو میں دنگ رہ

گیا۔ وہ رو رہی تھی۔

”کیا جانا ہے آپ نے میرے بارے میں۔ کچھ بھی نہیں جانتے آپ۔“ اس نے چھلکتے آنسوؤں کو ہتھیلی سے رگڑا۔

”ارے آپ رو رہی ہیں۔ میں تو بہادر لڑکی سمجھتا تھا آپ کو۔“

”میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ میں بہت بہادر ہوں۔ لیکن اب میں اتنا ٹوٹ چکی ہوں خود کو سمیٹ نہیں پاتی تو حالات کا مقابلہ کیسے کروں گی۔“ وہ متواتر رو رہی تھی۔ میں نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اس کے قریب ہو گیا۔

اس وقت میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہی نہیں ہوئی اس کی ذات میں کوئی ایسا سرا ضرور پوشیدہ تھا جو مجھے اس کے نزدیک لے گیا۔

”بیجے آنسو صاف کر لیجیے۔ اچھے دوستوں کے ہوتے ہوئے رویا نہیں کرتے۔ اس نے متورم آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اور دیکھتی رہی۔

”لیکن دکھ تب ہوتا ہے، جب کوئی ہمارے خلوص پر شک کرے۔“

”بھلے سے ساری دنیا آپ سے بدگمان ہو۔ لیکن آپ کی والدہ تو آپ سے محبت کرتی ہوں گی؟“ مجھے کیا پتا تھا کہ یہی اس کا سب سے کمزور پہلو ہے۔ اس کے رونے کی رفتار تیز ہو گئی۔

”ماں نے مجھے بھی بیٹی نہیں سمجھا۔ دکھ ہے تو مجھے صرف اسی چیز کا۔ ہر رشتہ مجھ سے صرف اپنے مفاد کا طالب ہے۔ کوئی تو بے ریا ہو کر ملے۔ اتنی بڑی دنیا میں مجھے بھی اس چیز کا احساس ہو کہ ہاں مجھ سے کسی نے محبت کی ہے۔ اپنا جانا ہے۔ تمام تر اغراض و مفاد سے ہٹ کر۔“ وہ سسک رہی تھی۔

میں اس کے تھوڑا سا نزدیک ہو گیا۔ مجھے لگا واقعی اس کا دل دکھا ہوا ہے۔ لیکن اس کی کہانی کیا ہے۔ یہ میں فی الوقت جانتا تو نہیں چاہتا تھا لیکن اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے میں نے کہا تھا۔

”اگر آپ غور کریں تو اب بھی آپ کے ارد گرد ایسے لوگ ہیں جو آپ کو تھوڑا جانتے ہیں، لیکن آپ سے دلی تعلق محسوس کرتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں معاملہ کیا ہے۔ شاید میں آپ کے کام آسکوں۔“

”میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں۔ مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو میرے غم بانٹ سکے۔“

”آپ مجھے اپنا ایسا ہی ساتھی سمجھ سکتی ہیں۔“ میں ایک لاپرواہ اور غیر ذمہ دار انسان اتنی بڑی بات

مہربانو سے کہہ رہا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی، یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔

اس نے سسکتے ہوئے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

”آپ میرے لیے بالکل انجی ہیں لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں آپ سے مل کر ہمیشہ ایسا کیوں

محسوس ہوا جیسے آپ میرے بہت نزدیک ہیں۔“

”اچھا۔“ میں دھیرے سے مسکرایا۔ اور اس کے مہکتے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

”میرا دل کرتا ہے میں اس دنیا سے کسی اور دنیا میں چلی جاؤں۔ جہاں مجھے کم از کم وہ لوگ نظر نہ

آئیں جن کے لیے میں نے قربانیاں دیں۔ لیکن انہوں نے مجھے پھر بھی محسن نہیں جانا۔“ اس کا ہاتھ میرے بازو پر تھا۔ اس کی انگلیوں کی حرکت سے میرے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی اور پھر بے ساختہ میرا دوسرا بازو اس کے گرد اس طرح حائل ہو گیا کہ وہ میرے قریب آ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ ساتھ ہی مجھے اس کی قربت سے جو سکون اور سرور محسوس ہو رہا تھا اس کے بعد جو نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ہوتا گیا۔ وہ ریشم کی ڈور کی طرح کھلتی چلی گئی۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں دنگ رہ گیا۔ میں ایک اجنبی جگہ پر سویا ہوا تھا۔ میں پھرتی سے اٹھا تھا۔

پھر دوسرے ہی لمحے رات کا سارا منظر نظروں میں گھوم گیا۔ میں مہربانو کے بستر پہ سو رہا تھا۔ میں نے ہاتھ روم میں جھانکا پھر کمرے کے دوسرے پورشن میں لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اب مجھے اس خالی جگہ سے خوف محسوس ہونے لگا۔ پہلا خوف کہ یہاں کوئی آنے جائے۔ دوسرا خوف کہ ماریہ کو پتا نہ چل جائے کہ میں رات بھر کہاں رہا۔

اسی دوران دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں نے جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا۔ میری بو کھلا ہٹ عروج پر تھی۔ دستک پھر ہوئی۔ دوسری دستک کے بعد ملازم اندر آ گیا۔ اندر آنے کے بعد اس نے دروازے کی کنڈی چڑھا لی۔

”آپ اس دروازے سے نکل کر چلے جائیں۔“ اس نے بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا اور میں نکل کر جا بھی سکتا تھا۔ مگر میں چوروں کی طرح کیوں نکل کر جاتا۔ جو کچھ بھی ہوا وہ یک طرفہ تو نہیں تھا۔

”مہربانو کہاں ہے؟“ میں نے اعتماد سے پوچھا۔

”ساڑھے سات بجے وہ کورٹ چلی جاتی ہیں اور اب آٹھ بج رہے ہیں۔“ ملازم کا جواب مختصر اور معقول تھا۔ میں اس کے جواب پہ الجھ گیا۔

”تمہیں مہربانو نے کہا تھا کہ تم مجھے یہاں سے نکال دینا؟“

ملازم میرے سوال پہ خاموش رہا پھر توقف سے بولا۔

”دراصل مہربانو کی والدہ اچھی عورت نہیں ہیں۔ وہ مہربانو سے بھی کچھ چاہتی ہیں۔ جو آپ لوگوں کے درمیان ہو گیا۔ اگر مہربانو، ایسا کرتی تو آج یہاں نہ ہوتی بڑی بڑی گاڑیوں میں گھوم رہی ہوتی۔ بڑے بڑے بنگلوں میں رہ رہی ہوتی۔ لیکن وہ اس بات پہ آج تک آمادہ نہیں ہوئی۔“

”تمہیں کیا پتا کہ ہمارے درمیان کیا ہوا ہے؟“ میں ملازم کو ڈپٹ کر بولا۔ ملازم مسکراتے ہوئے

بولا۔

”صاحب ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیا۔ یہ ہوٹل تھا نہ فٹ پاتھ جو آپ اپنا بستر چھوڑ کر یہاں سو گئے تھے۔“ میں شرمندہ ہو گیا۔

تب ہی اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

میں نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ رات بھر میری گاڑی باہر کھڑی رہی۔ کسی نے دیکھا

ہوگا تو کیا سوچا ہوگا۔

میں دروازے سے نکلنے لگا۔ پھر مڑا اور جیب سے دس ہزار نکال کر مہربانو کے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔

میں نے اتنی رقم اس لیے رکھی تھی کہ وہ اپنا علاج کرا لے گی۔ لیکن شاید یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔



وہ جا چکا تھا۔ جب اس کی گاڑی اشارٹ ہو چکی تو میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ سخی نے مجھے بتایا کہ وہ تکیے کے نیچے کچھ رکھ کر گیا ہے۔

”اچھا تم کمرے سے باہر جاؤ اور میرے لیے ناشتے کا بندوبست کرو۔“ وہ باہر چلا گیا تو میں نے تکیہ اٹھایا رُم گئی دس ہزار۔ صرف دس ہزار۔ میں نے پیسے واپس بستر پر پھینک دیے۔

”صرف دس ہزار سے زندگی نہیں گزرتی ولید کمال! تمہیں میرے لیے بہت کچھ کرنا ہوگا۔“ اب میں نے اپنے دروازے پر راہ گیر کے لیے بند کر دیے ہیں۔ یہ دروازہ کھلا ہے تو صرف تمہارے لیے۔“

دفعتاً میرا سیل فون بجنے لگا۔ میں نے نمبر دیکھا۔ فون پارسا کے ہاسٹل سے تھا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو۔“ دوسری طرف میڈم گیلانی بول رہی تھیں۔

”پارسا کو کل سے سخت بخار ہے۔ اسے میڈیسن تو دے دی تھیں۔ مگر اسی دوران وہ سیڑھیوں سے گر گئی۔ اس کے سر میں شدید چوٹ لگی ہے۔ وہ آپ کو یاد کر رہی ہے بہت زور رہی ہے۔“

میں نے فون رکھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پارسا کے پاس چلی گئی۔

”ہیلوروز، میری جان۔“ وہ بستر میں بیٹی ہوئی بے حد کمزور لگ رہی تھی۔ میں اس سے پلٹ گئی۔

”مجھے ابھی یہاں سے لے کر چلیں۔ میں نے ہاسٹل میں نہیں رہنا۔ یہاں کی میڈم مجھے ڈانٹتی ہیں۔“

”روز! میری جان ایسا نہیں کہتے۔ اگر آپ ایسا سوچیں گی تو پڑھیں گی کیسے؟“

”مجھے نہیں پڑھنا۔ مجھے پاپا کے پاس جانا ہے۔ مجھے پاپا کے پاس بھجوا دیں۔“

”تمہارا دنیا میں کوئی باپ نہیں ہے۔“ میں اسے بازوؤں میں جھینچ کر چلانا چاہتی تھی۔ لیکن میں چلا نہیں سکی۔ البتہ میری آنکھوں میں جو وحشت اور چہرے پہ جو سختی درآئی تھی۔ اس سے پارسا ہمیشہ کی طرح سرا سمہ ہو گئی۔

”ہمارا خیال ہے آپ اسے چند روز کے لیے اپنے ساتھ لے جائیں اور اسے فل ٹائم توجہ دیں۔ بچی ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ صہدی بھی بہت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ پڑھائی سے ہی بد دل ہو جائے۔“

میڈم گیلانی کی گفتگو پہ میں سوچنے پہ مجبور ہو گئی۔

”نی الحال تو میں اسے لے کر ہی جاؤں گی۔ جب اس کی طبیعت صحیح ہوگی تب ہی اسے اسکول

”بھینے کا سوچوں گی۔“
 ”میں کبھی ٹھیک نہیں ہوؤں گی۔ مجھے کبھی ٹھیک نہیں ہونا، مجھے نہیں پڑھنا۔۔۔ مجھے نانو کے پاس
 بھجوادیں۔“

”نانو۔۔۔“ میں نے پارسا پر سوالیہ نگاہ ڈالی۔
 ”ہاں۔ نانو کے پاس۔ آپا کبھی تو نہیں پڑھتیں۔ نانو تو انہیں اسکول نہیں بھیجتیں۔ وہ تو خوب
 مزے کرتی ہیں۔ لیٹ ٹائٹس سونا لیٹ مورنگ جاگتا۔“
 ”چپ کرو روز۔“ اس سے آگے میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ ہاں البتہ مجھے اس بات پہ حیرت ضرور
 ہوئی تھی کہ پارسا کی یادداشت کمال کی تھی۔
 جب میں نے اپنی ماں کا گھر چھوڑا تھا۔ تب پارسا صرف چار سال کی تھی اور اب آٹھ سال کی یعنی
 اسے گزشتہ چار سال کی زندگی یاد تھی۔

”آپ پارسا کا سامان وغیرہ پیک کرادیں۔ میں اسے لے کر جا رہی ہوں۔“ میں نے قریب
 کھڑی میڈم سے کہا اور پارسا کے بال سنوارنے لگی۔
 ”میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔“ چلتے ہوئے جب میں میڈم گیلانی کے آفس میں اللہ
 حافظ کہنے آئی تو انہوں نے مجھے روک لیا۔ پارسا گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی۔
 ”ہے تو آپ کا نجی معاملہ۔ اگر آپ جواب دینا مناسب سمجھیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“
 ”کیوں نہیں میڈم گیلانی، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“
 میرا خیال ہے پیرنٹس اور ٹیچرز کے درمیان ایسا سلسلہ ہونا چاہیے، اس سے بچے کی شخصیت بھرپور
 طریقے سے ابھرتی ہے۔“

”بچے کی شخصیت اپنے گھر سے مکمل ہوتی ہے کسی ادارے یا فرد سے نہیں۔“
 میڈم گیلانی نے نعل سے میری بات کی لٹنی کی تھی۔ میں چونک گئی۔
 ”آپ کے اور آپ کے ہسبنڈ کے مابین کوئی کشیدگی ہے تو اسے ابھی ختم کر دیجیے۔ بچی کی زندگی
 پہ اس کے بہت برے اثرات پڑ رہے ہیں۔ دیکھیں بات یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان سو معاملے
 ہوتے ہیں۔ لیکن بچوں کی خاطر قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں نانو بے فیصد ماں ہی قربانی
 دیتی ہے۔ آپ کو اپنی بچی کا مستقبل محفوظ کرنا ہے تو اپنے ہسبنڈ سے تعلق جوڑ لیجیے۔ بچی نا سمجھ ضرور ہے،
 لیکن اپنے ارد گرد کے ماحول کو خوب سمجھتی ہے۔“

مجھے یہ کہتے ہوئے شرمندگی ہو رہی ہے کہ بچی اپنی دوستوں میں اپنے گھریلو معاملات ڈسکس
 کرتی ہے۔ وہ بچوں کو بتاتی ہے کہ ان کی می اور پاپا کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔
 امی ہر وقت گھومتی پھرتی رہتی ہیں اور اسے ملازموں سے اور اکیلے گھر سے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے
 اس کی می نے اسے ہاسٹل میں ڈلوادیا ہے۔“ میڈم گیلانی اور نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں مگر میرے
 اطراف آندھیاں خانے لگیں۔ میں جو روز کے لیے یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ اب وہ بھی مجھے۔۔۔۔۔
 ”اچھا میں چلتی ہوں، زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“

میڈم گیلانی عمر رسیدہ خاتون تھیں، انہوں نے میرا سفید پڑتا چہرہ دیکھا۔ پھر اپنی فائل پر سر جھکا لیا تھا۔ میں آفس سے نکل آئی۔



گاڑی سے اتر کر میں نے پارسا کو کندھے سے لگایا اور اسے اندر لے آئی۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ قابل اطمینان بات یہ بھی کہ اس کا ٹمپریچر بھی اب کم ہو گیا تھا۔ جتنی دیر وہ سوئی رہی میں پیکنگ میں مشغول رہی۔

”مما! کیا ہم کہیں جا رہے ہیں؟“ وہ آنکھیں مسلتے ہوئے اٹھ بیٹھی اور بیگ اور دوسری اشیاء کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”میں بہاد پور نہیں جاؤں گی۔“ وہ یک دم بولی۔

”تم سے کس نے کہا ہم بہاد پور جا رہے ہیں۔“

”تو آپ کہاں جائیں گی؟“

”ہم مری جا رہے ہیں۔“

”اوہ۔۔۔ ایس۔“ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

”مجھے بہاد پور جانا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ وہاں والی آنٹی کا گھر بہت چھوٹا اور بہت اونچا ہے اور

وہاں ہر وقت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔“

اس نے میرے گال پہ پیار کیا اور آہستگی سے بولی۔

”پنڈی میں پاپا سے بھی ملاقات کر ادیں گی نا۔“

میں یک دم گم سم سی ہو گئی۔

”راجو آئے تو اس سے کہہ دینا کہ ہم لوگ ایک ہفتے کے لیے مری جا رہے ہیں۔ وہ ضرور پوچھے گا

کہ کس کے ساتھ گئی ہوں۔“

اس کے علاوہ مجھے خنی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری غیر موجودگی میں وہ سب سنبھال لیا

کرتا تھا۔

ٹرین میں بیٹھتے ہوئے مجھے ایک لمحے کے لیے ولید کا خیال ضرور آیا اور جیسے ہی ٹرین چلنے لگی۔ اس

کا خیال بھی پیچھے جانے لگا۔

اور آخر کار میں اپنے ماضی میں پہنچ گئی۔



”بچی ایک ماہ کی ہو گئی ہے اور تم نے اس کا ابھی تک نام نہیں رکھا۔“ ماما مجھ سے اکھڑے ہوئے

لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ میرے ہونٹوں پہ تلخ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ آپ کو اس کے نام کی پڑی ہے جبکہ

میں۔۔۔

صرف انیس سال کی عمر میں، میں ماں بن گئی تھی۔

جب ڈاکٹر نے مجھے یہ خبر سنائی تو مجھ سے زیادہ ماں ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے پہ بھند تھیں۔ جبکہ ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا تھا کہ بچہ صحت مند ہے اور یہ خاصی ویک۔ اس طرح ان کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ ماما وہاں سے مایوس ہو کر گھٹے اپنے جانے والی لیڈی ڈاکٹر فرزانہ بخاری کے پاس لے گئیں۔ انہوں نے بھی یہی کہا۔

لیکن ماما رسک لینے کے لیے تیار تھیں۔ لیکن شاید انہیں یہ نہیں پتا تھا کہ میں اپنی جان کی بازی ہرگز نہیں لگاؤں گی۔ میں پہلے ہی خوف زدہ تھی۔ کچھ ڈاکٹر نے جو خطرات بتائے، میرے حوصلے اور بھی پست ہو گئے۔ پھر دن گزرنے لگے۔ مجھے آنے والے وجود سے فی الحال کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ہاں البتہ یہ احساس ضرور تھا کہ اگر میں ماں کی حوصلہ شکنی پہلی بار ہی کر دیتی۔ تو آج میں اس حال کو نہ پہنچتی۔ درحقیقت عیش و عشرت کی تمنا تو مجھے بھی تھی۔ تب ہی تو میں نے میٹرک کے بعد آگے تعلیم بھی حاصل نہیں کی اور ماما کے بتائے ہوئے راستوں پہ خوشی خوشی چل پڑی۔ آنے والی دولت کے بری لگتی ہے۔ دنوں میں ہی گھر کے حالات بدلنے لگے۔

میں ایک فنکارہ کی حیثیت سے خود کو تسلیم کرانا چاہتی تھی۔ فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ میرا یہ شارٹ کٹ راستہ بھی بہت کام آیا اور ہماری زندگی کے دن بدل گئے۔ ماما مجھے پہلے سے بھی زیادہ محبت اور عزت دینے لگی تھیں۔ میں بھی مطمئن تھی، چلو میں نے اپنے بہن بھائیوں اور ماں کے لیے کچھ تو کیا۔

میں اس راستے پہ خود چلی تھی۔ لیکن میں نے یہ ضرور سوچا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ اپنی چھوٹی بہنوں کو اس راستے پہ ہرگز چلنے نہیں دوں گی۔ لیکن پتا نہیں کیا وجہ تھی کہ نا ز مجھ سے دو برس چھوٹی ہونے کے باوجود میرا مقابلہ کیا کرتی۔ جتنی اہمیت مجھے گھر میں حاصل تھی شاید وہ بھی اتنی ہی اہمیت چاہتی تھی۔ نقوش اس کے بے شک پرکشش تھے لیکن رنگ اور قد دونوں ہی کم تھے۔

اس لیے ماما کی بھی توجہ میرے بعد سحر پہ تھی۔ سحر واقعی سحر تھی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کا حسن سحر زدہ کر دینے والا تھا۔

میں چاہتی تھی کہ یہ سب بڑھ لکھ جائیں۔ مبشر ہم سب میں بڑا تھا۔ لیکن وہ پیدائشی مفطون تھا۔ دس سال کی عمر میں تو اس نے بیٹھنا سیکھا تھا۔ ماما ہر وقت اس سے بے زار رہا کرتی تھیں۔

ابو کے جانے کے بعد ماما نے اسے معذوروں کے ایک ادارے میں داخل کروا دیا تھا۔ اس کے بعد سے ہمارا اس سے صرف اتنا تعلق تھا کہ عید وغیرہ پہ جا کر اسے دیکھ لیتے تھے۔ ورنہ ہم میں سے کسی کو بھی اس سے دلچسپی نہیں تھی۔

اسی وقت راجو کمرے میں داخل ہوا۔ بیٹی مبارک ہو تمہیں۔ اس کا انداز خاصا مذاق اڑانے والا تھا۔ میں خاموش رہی۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”کیا نام رکھا ہے اس کا؟“ میں پھر بھی چپ رہی۔

”بہنی خوب صورت ہے تمہاری۔“

راجو جیسے لوگ تھیں بہت ہوتے ہیں، کسی بھی بڑے آدمی کے ساتھ چچہ گیری کے لیے۔ وہ ماما کا بھی بہت بڑا چچہ تھا اسی کے توسط سے میں تھیں تک پہنچی تھی۔ وہ خالد قرنی کا خاص آدمی تھا۔ بس میں اس کے بارے میں اتنا ہی جانتی تھی۔ حسب معمول جب وہ اپنی ہانک چکا تو اس نے ماما کے متعلق پوچھا۔

”بازار گئی ہیں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”چلو میں پھر آؤں گا۔“

”کیوں کوئی خاص کام ہے کیا؟“

”ارے۔ تمہیں نہیں پتا۔ ناز اور سحر کو ایک ڈرامے میں کاسٹ کیا جا رہا ہے۔“

”لیکن ناز کو تو میں ڈانی دو میں ہوسٹ کی ملازمت دلوا چکی ہوں۔“

”اے وہ ملازمت پسند نہیں ہے۔ اور پھر اتنی تھوڑی تنخواہ میں ہوتا ہی کیا ہے۔“

”کیا نہیں ہوتا۔ اے اخراجات تو نکال لیتی ہے۔“ راجو نے ایک قہقہہ لگایا۔

”جب تم نے قناعت نہیں کیا تو وہ کیوں کرنے لگی۔“

”میری بات اور تھی۔ میں ان حالات میں وہاں پہنچی تھی جب گھر میں فاقے تھے۔“

”فاقے تو اس گھر میں کبھی بھی نہیں ہوئے۔ انکل جب سے گئے ہیں معقول رقم بھیج رہے ہیں۔ یہ کہو کہ تمہیں دال روٹی کھانا پسند نہیں تھا۔ مرغ مسلم کی ضرورت تھی۔ تم نے وہ حاصل کر لیا۔ اب

ناز اور سحر کے لیے رکاوٹ کیوں بن رہی ہو۔“ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا اور میں گنگ بیٹھی رہ گئی۔



”اصل میں سحر اور ناز کے بہت اچھے رشتے آ رہے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں اس ڈرامے سے

فارغ ہونے کے بعد ان کی شادیاں کر دوں۔“ ماما نے راجو سے کہا۔

”تو یہ کریں آنٹی۔ کیا کہہ رہی ہیں۔“ راجو نے ہاتھ نہ چاکر کہا۔

”دونوں کو بیاہنے کے بعد مجھے اتنی رقم مل رہی ہے۔ جس سے میں ایک شاندار پراپرٹی خرید کر

کرائے پے دے سکتی ہوں اور جس کا کرایہ بھی شاندار ہوگا۔“ ماما نے قہقہہ لگایا۔

”ارے واہ آنٹی! پھر تو سمجھیں، آپ کی لاٹری کھل گئی۔“

”ہاں بیٹی سمجھ لو۔“

راجو ستانسی انداز میں ماما کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”ایک بات کا خیال رکھیے گا آنٹی! سودا واپس نہ

لوٹے۔ کل کلاں کو الٹا گلے میں پڑی ہوں۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ کام پکا ہی کر دوں گی۔ ان کا بھی تحفظ، اپنا بھی تحفظ۔“ ماما نے ہنستے ہوئے

راجو کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ ماما اور راجو کی گفتگو نے مجھے یک دم ہی کنگال کر دیا تھا۔ میں کتنی بے وقوف

تھی۔ میں نے اپنا سب کچھ گنوا یا بھی اور میری ماں کو کوئی فائدہ بھی نہیں ہوا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں اور میں سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ سارا دن میں اپنی بیٹی کے کاموں میں لگی رہتی۔ درحقیقت مجھے اس سے محبت ہی ہو گئی تھی۔ میرا دل ہی نہیں کرتا تھا کہ اسے اکیلا چھوڑوں۔ ماما اب مجھ سے چڑنے لگی تھیں بالکل اسی طرح جس طرح وہ مبشر سے چڑا کرتی تھیں۔ میں محسوس کرنے لگی تھی کہ وہ میری بیٹی کو برداشت نہیں کر پا رہی ہیں۔ میں نے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ ماما اس کا ذرا خیال نہ رکھتیں۔ البتہ ندا وغیرہ اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

میں نے اس کا نام پارسیا جیں رکھا۔ میری شدت سے خواہش تھی کہ وہ پارسیا ہی رہے۔ ناز اور سحر کی شادیاں ہو گئیں۔ ماما کی سرگرمیاں بھی خاصی تبدیل ہو گئیں۔ نہ صرف انہوں نے رہائش تبدیل کر لی تھی۔ بلکہ اسٹینس اور بھی باقی ہو گیا تھا۔ اب وہ بڑی بڑی پارٹیوں میں آتی جاتی تھیں۔ ماما کے پاس زندگی کے نشیب و فراز کے بہت سے تجربے تھے۔ خواتین کی فلاحی تنظیم کی اہم رکن بن چلی تھیں۔

پارسیا پاؤں پاؤں چلنے لگی تھی۔ اس نے مجھے ماما کہنا شروع کر دیا تھا اور میں آنے والے کل سے خوف زدہ تھی۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی راجو بہت جلدی میں تھا۔

”تم تو گھر میں بیٹھ بیٹھ کر بالکل ہی ڈل ہو گئی ہو حالانکہ سب بہنوں میں تمہارا فکر سب سے خوب صورت تھا۔“

”راجو مجھ سے شادی کرو گے۔“ میں نے یک دم ہی کہہ دیا۔

راجو ذرا حیران نہ ہوا۔

”ہاں کر لوں گا۔“ میں اس کی طرف دیکھنے لگی ”یہ بتاؤ کب شادی کرنا ہے۔“ وہ بنیدہ تھا۔ میں اس وقت اتنا خوش ہوئی کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ میری بیٹی کو باپ کا نام مل جائے گا۔ اس سے بڑھ کر مجھے کیا چاہیے تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کر کے ماما کو اطلاع کر دی۔

نکاح کے بعد ماما نے راجو سے پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے کر جائے گا۔

راجو سے پہلے میں نے ماما سے کہا کہ میں اپنے گھر جاؤں گی۔ ماما یں نہ کر رہے تھے سے اکھڑ گئیں۔

”ابھی سے اس پر احسان کرو گی تو وہ تمہیں کیا نکما کر کھلائے گا۔“

لیکن احسان تو وہ مجھ پہ کر رہا تھا نہ کہ میں اس پہ۔

”یہ فیصلہ ہم بعد میں کریں گے کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔“ راجو نے ہمارے درمیان مداخلت کی۔

ماما بھی چپ ہو گئیں، ہم لوگ واپس اپنے گھر آ گئے۔ راجو کی اپنی مصروفیات شروع ہو گئیں۔

وہ کھیر میرے نام تھا۔ البتہ ابو والا گھر جس میں وہ ہمیں چھوڑ کر ملک سے باہر گئے تھے۔ اسے بیچ کر جو رقم بچی تھی۔ وہ بھی اس میں ڈالی گئی تھی۔ تب جا کر یہ مکان لیا گیا تھا۔ اس لیے ماما کچھ بھی تنازع کھڑا کر سکتی تھیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ماما کے وہ پیسے لوٹا دوں گی۔ اس لیے میں نے تھیرے دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ اور پھر وہی ہوا۔ مکان کے معاملے پہ ماما اور میرے درمیان جھگڑا ہوا۔

ماما اس قدر خود غرض ہوں گی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ انہوں نے کہا ”بی بی کو یتیم خانے میں ڈال دو اور کام شروع کر دو۔“

میں ماما کے پیسے ان کے منہ پر مار دینا چاہتی تھی اور فی الحال میرے پاس کوئی آسرا نہیں تھا۔ میں نے راجو سے بات کی اور راجو نے مجھے ڈیڑھ لاکھ کی رقم اگلے ہی روز لا کر تھادی۔ میں نے وہ پیسے ماما کو دے دیے۔

اس کے بعد ماما کچھ نہیں بولیں۔

ہم نے نیچے والا پورشن کرائے پہ دے دیا اور اوپر رہائش اختیار کر لی۔ گوکہ اوپر کی منزل میں صرف ایک ہی کمر تھا۔ ہمیں بہت اچھے کرائے دار ملے تھے۔ دو میاں بیوی جن کے اولاد نہیں تھی۔ مرد وکیل تھا اور خاتون لیڈی ہیلتھ ورکر۔ ان لوگوں کو صرف چند سال کے لیے کرائے کے گھر کی ضرورت تھی۔ کیونکہ وہ ملتان میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔

ان کا ارادہ لاہور شفٹ ہونے کا تھا۔ دونوں ہی میاں بیوی کی زندگی مصروف ترین تھی۔ اس لیے کبھی کبھار ہی ان سے ملاقات ہو پاتی تھی۔

یوں راجو کے ساتھ میری نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت یار سا ساڑھے تین برس کی تھی اور راجو سے ٹھیک ٹھاک مانوس ہو چکی تھی۔ یار سا اس کے پیچھے پیچھے پھرا کرتی تھی اور اسے راجو کہا کرتی۔ میں اسے بہت سمجھانے کی کوشش کرتی کہ وہ تمہارے ابو ہیں۔ لیکن وہ بچی بالکل نہ مانتی۔ اور اس کا یہی اصرار ہوتا کہ راجو اس کے بابا نہیں ہیں، اس کے بابا دوسرے شہر میں ہیں۔

راجو نے فیصلہ کیا کہ اسے اسکول میں داخل کر دیا جائے۔ اس طرح اس کی ذہانت مثبت انداز میں پروان چڑھے گی۔

میری زندگی کی ڈور اب راجو کے ہاتھ میں تھی، وہ جس طرح چاہ رہا تھا۔ مجھے استعمال کر رہا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ اس نے کینٹ میں پان شاپ کھول لی ہے۔ بظاہر تو وہ پان شاپ تھی۔ لیکن وہاں کوئلہ ڈرنکس، سگریٹ بھی تھے اور سب سے بڑھ کر وہ پرائز بانڈ ڈیلر بن گیا تھا۔ مو بائل فون اور اس سے وابستہ اشیاء بھی وہ سیل کر رہا تھا اور کچھ ہی عرصے میں راجو پان شاپ بہت مشہور ہو گئی۔ مجھے بھی اطمینان ہوا چلو روزگار کا کوئی معقول ذریعہ تو ہاتھ آیا۔

میرے خیالات سن کر راجو ہنسنے لگا تھا۔

”یعنی تمہیں بھی حلال روزی کا شوق چرایا ہے۔ لیکن وہ تمہیں اس نہیں آئے گی یہ پان شاپ میں نے اپنے بیوی بچوں کے لیے کھولی ہے۔“

”بیوی بچے۔“ مجھے جھکا لگا۔

”ہاں۔“ راجو کا اطمینان قابل دید تھا۔

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ میں ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اس نے میری طرف گہری نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگا۔

”تمہیں شادی کرتے ہوئے ان سب باتوں کی پروا نہیں تھی اور نہ ہی تم نے پوچھنے کی کوشش کی۔“

تھی۔ پھر آج کیوں خیال آ گیا۔ تمہیں اپنی بیٹی کے لیے باب کا نام چاہیے تھا۔ میں نے وہ احسان چپ چاپ کر دیا۔ اب تمہارا کوئی حق نہیں بننا میرے معاملے میں دخل دینے کا۔“
میں دنوں گھر میں مردہ وجود کی طرح بڑی رہی۔

اسی دوران میری ملاقات سحر سے ہوئی۔ اس نے بتایا کہ ناز نے دوسری شادی کر لی ہے اور پہلے سے بھی زیادہ مزے میں ہے اور آج کل میں وہ بھی اپنے شوہر سے طلاق لینے والی ہے۔
سحر پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی۔

”لیکن تم لوگوں کی شادیاں تو بہت اچھے لوگوں سے ہو گئی تھیں۔“
”کون ہوتے ہیں اچھے لوگ۔“ وہ طنزیہ مسکرائی۔ ”آج کل کے دور میں سوائے پیسے کے کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔ جب تک شوہر خیرے برداشت کرے۔ تب تک اس کے ساتھ رہو۔ جب وہ ادھر ادھر منہ مارتا شروع کرے تو اسے بائے بائے کہہ دو۔“ اس کی بات پر میں حیران رہ گئی۔

”لوگ ہمیں اچھا نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے۔ ہمیں اپنا تے بھی کیوں ہیں۔ عشق میں گرفتار ہو کر۔ پھر وہ کیسا عشق ہے؟ جب لوگ ہمیں کیش کر سکتے ہیں۔ تو ہم خود کیوں نہیں کر سکتے۔ تم بھی کسی ٹکڑی پارٹی کو پھانساؤ اور اس راجہ کے بچے سے پیچھا چھڑاؤ جو تمہارے ساتھ ذرا بھی نہیں چلتا۔“
سحر جا چکی تھی لیکن اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

کتنا درست کہا تھا اس نے، حالانکہ میرے پاس زندگی کا اس سے زیادہ تجربہ تھا۔
لیکن میں نے ان ہی راستوں پہ سفر جاری رکھا جہاں سے آغاز کیا تھا۔ مجھے بھی اب کسی باحیثیت شخص کا انتخاب کرنا تھا اور اسی دوران مجھے ولید کمال مل گیا۔



تقریباً دو ہفتے کے بعد میں نے اس کی شکل دیکھی تھی اور میں بتا نہیں سکتا کہ اس کی غیر موجودگی میرے لیے کتنی بے چینی کا باعث بنی رہی۔ حالانکہ نہ تو مجھے اس سے محبت تھی اور نہ ہی اتنی خاص ضرورت لیکن اس کے باوجود اس کے اندر کچھ ایسا تھا جو مجھے اس کے قریب جانے پہ مجبور کر رہا تھا
جب وہ جم آئی تو مجھے حبیب نے فون کیا کہ آج وہ آچکی ہے۔ کیونکہ صبح کے وقت میں کم ہی جم جایا کرتا تھا۔ میں حبیب کے پیغام پہ جم پہنچ گیا۔ وہ ایک سرساز سے فارغ ہو چکی تھی۔
”میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے سراٹھا کر مجھے دیکھا۔

”کیا بات کرنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟“

”میرا خیال ہے۔ آپ میرے آفس میں آجائیں۔ یہاں کھڑے کھڑے تو بات نہیں ہو سکتی۔“
وہ چپ چاپ میرے آفس میں آ گئی۔ اور میرے کچھ کہنے سے قبل ہی بول پڑی۔
”آپ کے یہاں جولیڈی انسٹرکٹر تھی۔ سنا ہے وہ جاب چھوڑ چکی ہے اور آپ کو کسی تجربہ کار لیڈی انسٹرکٹر کی ضرورت ہے؟“

”ہاں، لیکن آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟“

”آپ کے دوست حبیب نے مجھ سے بات کی تھی۔“ میں دل ہی دل میں خوش ہوا کہ گفتگو کا کوئی

معقول جواز تو ملا۔

”جب تک کسی کا رآمد خاتون کا بندوبست نہیں ہو جاتا میں عارضی طور پر یہ جاب سنبھال لوں۔“

”اگر حبیب نے آپ سے بات کی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ آپ کی کارگزاری سے واقف

ہوگا۔ اس لیے کہ وہ نہ صرف پنجاب کا باڈی بلڈنگ چیمپئن ہے بلکہ ماہر انسٹرکٹر بھی ہے۔ اگر وہ مطمئن ہے

تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”اعتراض آپ کو نہیں لیکن مجھے تو ہے۔ حبیب نے کہا جب تک کسی کا رآمد خاتون کا بندوبست

نہیں ہو جاتا۔ تب تک آپ یہ جاب سنبھال لیں۔ بھی اگر میں کارآمد خاتون نہیں ہوں تو آپ کیوں اپنا

وقت ضائع کر رہے ہیں۔“

دراصل اس طرح سوچنا آپ کی مجبوری ہے۔“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں مسکرا کر کہا ”کیونکہ

آپ وکالت پڑھ رہی ہیں۔ اور لفظوں کو پکڑ کر ہی تو وکیل بات کو بڑھاتے ہیں۔“ میں مسکرایا۔

”ایک منٹ، بات بڑھاتے نہیں سکتے تک پہنچتے ہیں۔“

”آئی ایم سوری، میں یہی کہنے والا تھا۔“

”لیکن آپ نے کہا تو نہیں نا اور مقابل تو وہی سمجھتا ہے جو کہا جاتا ہے۔“

”میں ہار اور آپ جیتیں۔“ میں نے ہتھیرا ڈال دیے۔

”تو پھر کیا خیال ہے آپ کا میرے بارے میں؟“ وہ فتح مندی سے مسکرا رہی تھی۔

”موسٹ ویلکم، آپ میں صلاحیتیں ہیں تو حبیب نے آپ کو آفر کی، پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا

ہے۔ بائی داوے اس سے قبل بھی آپ کوئی جم کلب جوائن کر چکی ہیں؟“ میں نے بات آگے بڑھائی۔

”اگر آپ کو میری صلاحیتوں پر شبہ ہے۔ تو آپ حبیب کو مجھ سے نگران بنا سکتے ہیں۔“

”سب سے پہلی بات تو یہ کہ اگر ایسا ہو سکتا تو ہمیں لیڈی انسٹرکٹر کی محتاجی ہی کیوں ہوتی۔ دونوں

شفٹیں حبیب با آسانی سنبھال لیتا۔ یہاں خواتین اسی وجہ سے آتی ہیں کہ یہاں پردے کے ساتھ ساتھ

مکمل تحفظ کا بھی احساس ہے۔ اور آپ بخوبی سمجھ سکتی ہیں پردے دار خواتین ایسے ماحول میں تو ایک منٹ

بھی نہیں رکتیں۔ خواتین ٹائم میں حبیب یا دوسرے لڑکے اندر ہال میں نہیں جاتے۔ میں بھی خواتین ٹائم

میں اندر ہال میں نہیں جاتا۔“

”مجھے خود آپ لوگوں کا ماحول پسند آیا تھا تو آئی تھی۔“

”ٹھیک ہے پھر آپ کب سے آرہی ہیں؟“ فی الحال میں چھٹیوں پر ہوں۔ اس لیے کل سے

آ جاؤں گی لیکن یہاں کام میں اپنی پسند سے کروں گی؟“

”میں سمجھا نہیں آپ کی بات؟“

”سب سے پہلے تو آپ کو یہاں خواتین کے لیے لباس کا انتظام کرنا ہوگا۔ کیونکہ گھریلو حلیے میں

ایکسر سائز کرتی ہوئی خواتین اول جلول لگتی ہیں۔ کٹ پہن کر ایکسر سائز کریں گی تو انہیں اپنے فکر کا خود

اندازہ ہو جائے گا۔“

”آپ کی رائے سے میں متفق ہوں۔ لیکن خواتین ایسا کرتی نہیں ہیں۔“ میں نے اس کی تجویز پسند کرتے ہوئے رد کرنا چاہی تو وہ فوراً بولی۔

”ہر ارادے کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ اگر آپ بیس پونڈ وزن تین مہینے میں لیس (کم) کرنے کا دعو کرتے ہیں تو آپ کو اپنے کسٹمر کو اپنے اصولوں کا پابند بھی کرنا چاہیے۔“

”مس مہربانو! بات یہ ہے کہ خواتین اتنی زیادہ تعداد میں یہاں آتی نہیں ہیں۔“

”اگر آپ چاہتے ہیں کہ خواتین بھی اسی طرح آئیں جیسے مرد حضرات آتے ہیں تو اس کا آسان سا اصول ہے، بیوی سیلون کا انتظام کر لیجیے۔ سیلون کے لیے خوب صورت اور ماہر خواتین کا انتظام میں کر دوں گی۔“

میں اس کی تجویز پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔

”ٹھیک ہے، آپ جس طرح چاہیں اپنا چارج سنبھال لیں۔“ میں نے فی الحال معاملے کو سرسری سا لیا تھا۔ لیکن وہ خاصی سنجیدہ تھی۔

وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں نے اسے روک لیا۔

”مس مہربانو! میں آپ سے ایک اور ضروری بات بھی کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ رک گئی۔

”اس روز ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہوا۔۔۔“

”کیا آپ اس پر شرمندہ ہیں۔۔۔؟“ اس نے بات کاٹی۔

”نہیں۔۔۔“ میں نے سچائی سے اعتراف کیا۔

”گٹلی فیل کر رہے ہیں؟“

”نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔“

”لیکن بات یہ ہے کہ اس روز کے بعد سے میں آپ کے متعلق جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کون ہیں

اور آپ کی حقیقت کیا ہے؟“

”کس قسم کی حقیقت کی بات کر رہے ہیں آپ؟“

اس کی آنکھیں میرے چہرے پر گز گئیں۔ ”ایک شخص میری عیادت کے لیے میرے پاس آتا

ہے۔ بظاہر دوستی کا دعو کرتا ہے اور مجھے استعمال کر لیتا ہے اور پھر جاتے سے دس ہزار گیش بستر پہ پھینک

کر چلا جاتا ہے۔“

وہ مجھ پر حاوی ہونے لگی تو میں تیزی سے بولا۔

”یہ سب کچھ یک طرفہ نہیں تھا۔ میں خود نہیں جانتا ایسے کیسے ہوتا چلا گیا۔“

وہ طنز یہ مسکرائی۔ ”سارے مرد ایسے ہی کہتے ہیں۔“

”تم کیا جانتی ہو سب مردوں کے بارے میں؟“ میں مشتعل سا ہو گیا۔

”اس لیے کہ میں مردوں کی فطرت سے اتنا ہی واقف ہوں۔ جتنا مرد اپنی کمزوریوں سے واقف

ہوتے ہیں۔“ وہ مجھ سے زیادہ تیز لہجے میں بولی تھی۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ایک کرپٹ عورت ہو۔“ میری بات پہ وہ اطمینان سے بولی۔
”عورت کو کرپٹ کون بناتا ہے؟ یہ معاشرہ۔ اور یہ معاشرہ کیا ہے۔ صرف اور صرف آپ جیسے مردوں کی عنایت۔“

یہ کہتے سے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے اور اس نے سر جھکا لیا۔
پھر پوروں سے آنسو صاف کیے اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”جو کچھ بھی ہوا بہتر ہوگا یہ ہمارے درمیان ہی رہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکلتی چلی گئی۔
وہ چلی گئی اور میں الجھنے لگا اور اس الجھن کو سوائے مہربانو کے کوئی نہیں سلجھا سکتا تھا۔ میرے اندر اس سے ملنے کا بحسب بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن میں خود کو روکتا رہا۔ اس روز میں بتا نہیں سکتا کہ ماریہ مجھے کتنی شدت سے یاد آ رہی تھی۔

میں نے ماریہ کو فون کیا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد میرے پاس آجائے۔
”ولید! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، ابھی ابو کا چہلم بھی نہیں ہوا، میں کیسے آسکتی ہوں۔“ وہ جھنجھلائی۔

میرے لب یک دم ہی سل گئے۔
”کیا بات ہے ولید تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
”ہوں۔“ میں نے مختصر اُکہا۔ پھر چند رسمی باتوں کے بعد فون بند ہو گیا۔
میں سر تھامے بیٹھا تھا۔

پھر میں گاڑی کی چابی لے کر باہر نکل گیا۔ میں نہیں جانتا کون سی طاقت مجھے یہاں کھینچ لائی تھی۔
البتہ وہ شیطانی طاقت ضرور تھی، جس نے میری مہربانو کے گھر تک رہنمائی کی۔ مہربانو کے دروازے کے سامنے میں نے گاڑی روکی اور ڈور نیل پہ ہاتھ رکھ دیا۔
دروازہ مہربانو نے کھولا۔

وہ سیاہ لباس میں دروازے کے وسط میں ایستادہ تھی۔
”اندر آجائیے۔“

میں اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے مجھے پکارا۔ میں چپ چاپ اندر آ گیا۔
اس نے مجھ سے کوئی سوال جواب نہیں کیا اور میرے بالکل نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔
ایک عجیب سی آنچلھی جو میرے اندر سلگ رہی تھی۔ وہ میرے نزدیک آئی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔
اور پھر میں سب کچھ بھول گیا۔



”ولید رضا کمال! آپ کو شاید حیرت ہوگی۔ میں آپ کو بہت پہلے سے پسند کرتی تھی۔ آپ کی

اسٹائٹس اور بے نیازی جو ہمہ وقت آپ کے چہرے کا احاطہ کیے رہتی تھی۔ مجھے بہت اڑیکٹ کرتی تھی۔ اور میں چاہتی تھی کہ اس دیوتا کو چھو کر دیکھوں کہ اس کے اندرونی احساسات کیسے ہیں؟“ وہ میری سماعتوں میں رس گھول رہی تھی۔ میں مسکراتے ہوئے سیدھا ہوا۔
 ”تو پھر ان احساسات کو چھو کر تم نے کیا پایا؟“ میری بات پہ وہ کھلکھلائی۔
 ”مغرور سے لگتے ہو۔“ وہ میری ناک چھوتے ہوئے بولی۔
 ”تمہیں میں مغرور لگتا ہوں؟“

”ہاں بہت زیادہ۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔ میں اٹھ بیٹھا۔
 ”اور کیا کیا لگتا ہوں؟“ میں اس کے حسن کو آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔
 ”آج ہی سب کچھ بتا دوں گی تو میری طرف پھر بھی نہیں آؤ گے۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

”تم روز کہو گی تو میں روز آؤں گا۔“ میں اپنے اختیار میں کب تھا۔
 ”اچھا!“ وہ تعجب سے بولی۔
 اور پھر میں نے یہ ثابت کر کے دکھایا۔
 تقریباً پانچواں روز تھا جب ہم رات کا کھانا شکر پیلا سے کھا کر نکلے تو میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”موسم خاصا خراب ہو رہا ہے۔ میں تم کو گھر تک ڈراپ کر دیتا ہوں ایسا نہ ہو کہ بارش ہو جائے۔“ وہ میری پیش کش پہ میری گاڑی میں بیٹھ گئی۔
 ”آپ کے ساتھ گاڑی میں آتے جاتے ڈر لگتا ہے۔ کوئی دیکھ لے گا تو؟“
 بے شک میں اس پہ دل نہیں ہار تھا مگر کوئی وجہ تھی کہ میرا دل اس کی طرف کھینچنے ضرور لگا تھا۔ اور پھر وقت گزاری کے لیے اس سے بہتر کیا مشغلہ ہو سکتا تھا۔
 گھر کے سامنے میں نے گاڑی روکی تو اس نے مجھے اندر آنے کی پیش کش کی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔

”میں ذرا چیخ کر لوں، آپ اتنی دیر ٹی وی دیکھ لیں۔“
 ”سنوڈرا ٹھہر جاؤ۔“ میں نے اسے روکا۔
 ”آج میری بیٹی آئی ہوئی ہے، میں آپ کو وقت نہیں دے سکتی۔“ میری ساری بے خودی، سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

”بیٹی!“ میں نے دہرایا۔
 ”ہاں بیٹی۔“ اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چند ثانیے میں یونہی جامد کھڑا رہا۔
 ”تم نے مجھے پہلے نہیں بتایا کہ تمہاری کوئی اولاد بھی ہے۔“ مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔
 ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے تمہارے بھی تو دو بچے ہیں۔“

میں چونک گیا۔

”تمہیں کس نے بتایا کہ میرے دو بچے ہیں؟“

”واٹ نان سینس، یہ بھی بھلا پوچھنے کی بات ہے۔ اتنے عرصے سے میں آپ کے ساتھ ہوں، کیا مجھے یہ بھی نہیں پتا ہوگا۔“ وہ ایک کتاب لے کر صوفے میں دھنس گئی۔ ساتھ ہی لی وی بھی آن کر لیا۔

”تم شادی شدہ ہو؟“

”ظاہر ہے۔۔۔“ اس کی بے نیازی کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔

”تمہارا شوہر کہاں ہے؟“ وہ جتنا پرسکون بھی میں اتنا ہی الجھ رہا تھا۔

”یہیں ہوتا ہے۔“ اس کی نگاہیں کتاب پر جمی تھیں۔ پھر وہ یک دم اٹھتے ہوئے بولی۔

”ولید رضا! آئی لو یو۔“ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ تم ایسے دیوتا ہو جس کے سامنے میں اپنے حسن

کی بھینٹ دن رات بھی چڑھاؤں تو کم ہے۔“ اس کے لفظ میری سماعتوں میں رس گھول رہے تھے۔ وہ

میرے بے حد قریب آچکی تھی اور میں بے بس ہوتا جا رہا تھا۔



آج میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ راجو کی تصاویر بھی دکھائیں اور اپنی ماں

بہنوں کی بھی۔ میں نے اس سے صرف دو باتوں میں جھوٹ بولا ایک تو یہ کہ راجو پارسا کی بیٹی ہے،

دوسرے یہ کہ میں وکیل ہوں۔ اگر میں یہ جھوٹ نہ بولتی تو میں کبھی بھی ولید رضا کمال کی نظروں میں مظلوم

نہ بنتی۔ اس کے علاوہ میں نے اسے سب کچھ سچ بتایا۔

اور یہ کہ وکالت کے لیے بہت وقت اور محنت درکار ہے۔ جو بچی کے ساتھ ایک مشکل کام ہے۔

اس لیے میں نے سادہ سی جاب ڈھونڈنے کا ارادہ کیا تھا اور وہ جاب مجھے اس کے جم میں مل گئی۔ یہ

جھوٹ پچھلے جھوٹ سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ کیونکہ میں محض میٹرک پاس تھی اور یہ سب کتابیں میرے

کرائے دار وکیل کی تھیں۔

اس نے چپ چاپ میری ساری داستان سنی تھی۔ اور اس کے بارے میں مجھے بتانے والا صرف

حسیب تھا کیونکہ حسیب اور ولید کا ساتھ خاصا پرانا تھا۔

میں اب تک نہیں سمجھ پائی تھی کہ حسیب میری رہنمائی کیوں کر رہا ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا

کہ حسیب کو ولید سے کوئی خاف ضرور ہے۔ جو وہ ایسا کر رہا ہے کیونکہ ایک روز اس نے کہا۔

”چند لوگ پیدا کئی قسمت والے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر قدرت کی مہربانی سمجھ میں نہیں آتی۔

جو محنت بھی نہیں کرتے اور ٹھانڈے سے رہتے بھی ہیں۔“ اسی طرح ایک روز اس نے کہا۔

”یہ شخص انسان کو انسان نہیں سمجھتا اور کوئی بھی چوٹ اس کے دل پہ اثر انداز نہیں ہوتی تو اس لیے

کوشش کرنا روئے دھونے سے پہلے اسے اپنا عادی بنالینا۔ ولید رضا کمال مفاد پرست آدمی ہے۔ وہ مفاد

نکالنا جانتا ہے۔ احسان نہیں مانتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سب کچھ کھو کر بھی خالی ہاتھ رہ جاؤ۔“

مگر یہ حسیب کی بھول تھی۔ میں سب کچھ کھو ضرور چکی تھی۔ لیکن ولید سے ہی تو سب کچھ بیاج

سمیت وصول کرنا تھا۔



خواتین ٹائم میں انٹریز روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات تھی۔ شہر کا سب سے بڑا کلب میرا تھا۔ مہربانو کی حکمت عملی موثر ثابت ہو رہی تھی۔ لیکن اس کی وجہ مہربانو کی ذہانت نہیں، حسن تھا۔ جس کا میں دل ہی دل میں اعتراف کرنے لگا تھا۔

میں گھر میں کام کا بج کر نی مار یہ کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ماریہ میں کس بات کی کمی ہے۔ لیکن پھر بھی ماریہ میں کوئی کمی تو تھی۔ جس کی وجہ سے مہربانو مجھ پہ چھانی جا رہی تھی۔
 ”کیا سوچ رہے ہو؟“ یک دم ماریہ میرے نزدیک آ کر بولی تو میں چونک گیا۔
 ”آں، کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی جم کی کارکردگی کے متعلق سوچ رہا تھا۔“
 ”پھر کیسی جا رہی ہے جم کی کارکردگی؟“

”اے دن، فرسٹ کلاس۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا موبائل فون نکالا اور اس کا بیلنس چیک کرنے لگا۔
 آج کل سارا بیلنس مہربانو سے باتیں کرتے ہوئے ختم ہوتا تھا۔ مجھے فون پہ مصروف دیکھ کر ماریہ میرے پاس سے اٹھ گئی۔



گزشتہ رات میں نے اسے جتنی بھی شاپنگ کرائی اپنے پاس سے کرائی۔ اس نے پرنس ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں تو مجھے کچھ نہیں کہا۔ لیکن جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو اس نے اپنا والٹ کھول لیا۔
 ”میں تمہیں وہاں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تمہیں اپنا بل واپس لینا ہو گا۔“ اس نے کہا تھا۔
 ”شرمندہ تو آپ نے مجھے کر دیا۔ یعنی میری اتنی اوقات نہیں کہ آپ جیسے رئیس آدمی کو تحفہ دے سکوں۔“ میں نے معصومیت سے کہا۔

تو وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے پیسے لے لیے۔
 ”اگر آپ مجھے ایک دوست کی حیثیت سے قبول نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے۔ ویسے بھی میری جیسی لڑکیاں صرف ایسے خواب ہی دیکھ سکتی ہیں۔“ گاڑی اپنے راستے پہ رواں دواں تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔

”سنو ماہی!“

مجھے اس کے منہ سے ماہی سن کر بہت اچھا لگا۔ میں ہمدن گوش ہو گئی۔
 ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لو؟“
 ”میں ایسا تب کر سکتی تھی۔ اگر بیٹی کا ساتھ نہ ہوتا وہ پارسا کا باپ ہے۔ بچی کو مجھ سے چھین لے گا۔“

”تم وکالت پڑھ رہی ہو۔ کیا اس کے لیے کوئی راستہ نہیں نکال سکتیں؟“

”نکال سکتی ہوں۔ لیکن میرے پاس کوئی مضبوط سہارا نہیں ہے۔ قانون مجھے راجو جیسے آدمی سے چھٹکارا تو دلا دے گا لیکن ایک راجو ہی نہیں اس معاشرے کے گلدھ مجھے زندہ نوح لیں گے۔ جنہیں راجو نے میرے گھر کا پتہ دے رکھا ہے۔ قانون ہر وقت تو حفاظت نہیں کرے گا میری۔“

وہ چپ رہا پھر کچھ دیر بعد بولا۔
”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنی رہائش تبدیل کر لو؟“ اس کے منہ سے یہ بات سن کر میرا دل بلیوں اچھلا۔

”ہاں، جب میں خود کو اس قابل سمجھ لوں گی۔ تب شاید یہ شہر ہی چھوڑ جاؤں۔“
”اگر تم پسند کرو تو شاہ رکن عالم میں میری ذاتی کوٹھی خالی پڑی ہے۔ تم اس میں رہ سکتی ہو۔“

مجھے پتا تھا اس وقت وہ صرف اپنا مفاد دیکھ رہا ہے۔
”میں آپ کی رہائش میں جا کر آپ کی زندگی میں مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ آخر آپ کی بھی تو ازدواجی زندگی ہے۔ آپ کی کوٹھی کا سب کو پتا ہو گا۔ میرے جانے سے آپ کے لیے بہت سے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔“

میری بات پہ اس کے چہرے پہ تھوڑی دیر کے لیے پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ دوسری باتوں میں مگن ہو گیا۔ میں نے بھی زیادہ بحث نہیں کی۔ میرے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اس پہلو پر سوچ رہا ہے۔ جب وہ ایسا سوچ سکتا ہے تو اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ بھی کر گزرے گا۔ لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ صبح شام اس کی توجہ مجھ پہ رہے اور میری توجہ اس معاملے پہ کہ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان کیسا وقت گزر رہا ہے۔ ان کا وقت زیادہ اچھا نہیں گزرنا چاہیے۔ بہتر ہوتا کہ اس کی بیوی پہ میرا معاملہ آشکار ہو جائے اس سے ان دونوں کے درمیان جھگڑے ہوں جس کا مجھے ہی فائدہ ہو گا۔



آج ماڈل ٹاؤن میں، میں نے ایک کوٹھی کرائے پہ لے لی۔ کیونکہ مہربانو تین چار روز سے جم بیس آرہی تھی۔ میرا بھی اس کی طرف جانا نہیں ہوا۔ جب میں نے اسے فون کر کے پوچھا۔ تو اس نے مجھے جو کچھ بتایا۔ وہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ لیکن اس سے میری غیرت میں بھونچال سا آگیا۔ حالانکہ یہ بھی غیر فطری سی بات تھی۔

میں ایک سخت دل آدمی تھا۔ کسی کا دکھ بھی ایک ایسی کی میرے دل پہ اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ کیا مجھے مہربانو سے ہمدردی ہو رہی ہے یا محبت اور اس نرم گوشہ سے مجبور ہو کر میں نے اس کے لیے کرائے پہ کوٹھی لے لی۔

میری کل شام اس سے آخری بار بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ گھر چھوڑتے ہوئے اسے وہاں سے کچھ بھی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے سب کچھ اسی گھر میں مل جائے گا جہاں اب وہ جا رہی ہے۔ میرے اس احسان پہ وہ رو رہی تھی۔



میرا خیال تھا کہ علیحدہ رہائش کے بعد وہ مجھ سے روز ملنے آیا کرے گا۔ لیکن یہاں آئے ہوئے مجھے ستائیس دن ہو گئے تھے اور وہ نہیں آیا تھا۔ البتہ فون یہ وہ میرا حال احوال پوچھ لیا کرتا تھا۔ یہی نہیں اس نے حبیب کے ہاتھ پندرہ ہزار روپے میرے خرچ کے لیے بھی بھجوائے تھے۔ میں اور حبیب ابھی تک اسی محلے میں تھے کہ ولید رضا کمال کا یہ کون سا روپ ہے۔

”اگر وہ تم سے یہ نکاح کر لے تو سب سے پہلے کاروبار میں آدھی شراکت کی مالک بننا پھر نکاح کے لیے سائن کرنا۔“

حبیب مجھے پٹیاں پڑھا رہا تھا۔

”کیا وہ مجھ نکاح کرے گا؟“ میری خوش فہمی عروج پہ تھی۔

”وہ نکاح کرے یا نہ کرے لیکن تمہیں تحفظ تو دے رہا ہے۔ اور اسی میں تم نے اپنا مالی فائدہ سوچنا ہے۔“

مجھے یک دم جھٹکا لگا۔

”تمہیں آخر میرے فائدے کی اتنی فکر کیوں ہے۔ کیا ولید کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی مجھ سے ہمدردی ہو گئی ہے؟“

وہ میرے طنز پر ہنس بڑا اور اپنی ہتھیلیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”بعض انسانوں کی قسمت کی لکیریں بہت ہی روشن ہوتی ہیں۔ اگر ان کی روشنی سے کوئی اور بھی فائدہ اٹھالے تو اس میں نقصان ہی کیا ہے۔ خیر چھوڑو۔ تمہیں ان مسئلوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دیکھو کہ ایک اچھا خاصہ بندہ تمہارے لیے پریشان ہے۔“ وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

”لیکن فی الحال مجھے یہ پریشانی ہے کہ تم میرے فائدے کے لیے اتنا کانٹا کاشس کیوں ہو رہے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تمہارا بھی کوئی فائدہ ہے۔“ میری بات یہ حبیب کی آنکھیں چمکیں۔ لیکن اس چپک میں ایک عجیب طرح کی چبھن بھی تھی۔ حسرت اور حسد کی ملی جلی اس کیفیت کو میں کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔

”میں ایک پروفیشنل آدمی ہوں۔ مجھے اور شہروں سے بھی آفرز آتی ہیں لیکن مجھے ملتان سے دلی لگاؤ ہے۔ کیونکہ یہ میرا آبائی شہر ہے۔ میں ایک بہت بڑا جم کلب بنانا چاہتا ہوں اور میں ولید رضا کمال کو دکھانا چاہتا ہوں کہ حیثیت تو پیسے سے خریدی جاسکتی ہے لیکن صلاحیت پیسے سے خریدی نہیں جاسکتی۔ اس کے یہ تحقیر آمیز الفاظ میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ مجھے مسٹر پنجاب بنانے والا وہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوا۔ اس نے مجھ پہ یہ احسان اپنے فائدے کے لیے کیا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس بڑا سرمایہ تھا اور وہ ماہر انٹرکٹر کے زیر نگرانی یہ ادارہ کھولنا چاہتا تھا۔ جو میری صورت میں اسے مل گیا لیکن تمام عمر میں اس کا زر خرید بن کر نہیں رہ سکتا۔ اتنے آرام سے وہ میری تذلیل کر دیتا ہے کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ تم اس جگہ اپنی حیثیت حاصل کر چکی ہو۔ تمہیں صرف اتنا کام کرنا ہو گا کہ کسی کبھی

روز خواتین کی ایکس سائز کرتے ہوئے مووی بنانا ہوگی اور وہ مووی ڈریسنگ روم سے لے کر ایکس سائز تک کی ہونی چاہیے۔ بس مجھے تم سے اتنا سا فائدہ اٹھانا ہے۔ بولو میرا یہ کام کر دو گی؟“
میں اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ یہ تو ولید رضا کو مجھ سے بھی بڑا ہاتھ دکھانے والا تھا۔
”تم نے مجھ سے یہ اتنا بھروسہ کیسے کر لیا۔ اگر میں یہ سب کچھ ولید رضا کو بتا دوں تو؟“
”تم ایسا نہیں کرو گی کیونکہ تم نے ابھی اس سے دس فیصد بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر اسے یہ سب کچھ پتا چل گیا تو وہ میرا ہی نہیں تمہارا بھی پتا صاف کر دے گا۔“

ایک لمحے کے لیے میرا دل یہ ضرور چاہا تھا کہ میں ولید کو یہ سب کچھ بتا دوں ہو سکتا ہے اس سے میں ولید کے دل میں مزید جگہ پاسکوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ حسیب میرے عزائم سے اچھی طرح واقف تھا اور میرے عزائم کو کسی حد تک کامیاب بنانے میں حسیب کا ہی ہاتھ تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ ولید رضا مجھ سے وقتی دل لگی کر رہا ہے۔ وہ اتنا سب کچھ جان لینے کے بعد ہر ایک پہ اعتبار کرنا چھوڑ دیتا تو اس سے مجھے نقصان ہی ہوتا تھا فائدہ نہیں۔



بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو سرسری سا لیتے ہیں۔ لیکن ایسا صرف بظاہر ہوتا ہے اور ہمیں پتا ہی نہیں چلتا کہ کب اور کس وقت وہ چیز ہمارے اوپر اثر انداز ہوئی اور اہمیت کی حامل بن گئی۔
مہر بانو جیسی عورتوں کے ساتھ ایسا آئے دن ہوتا ہے اور کوئی ان کی تلافی بھی نہیں کرتا۔ لیکن کیا وجہ تھی مہر بانو کے ساتھ جو کچھ ہوا اس نے مجھے اتنا بھجھوڑ ڈالا کہ میں نے اس پہ یکسر پابندی لگا دی کہ وہ آئندہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گی۔

میں ہر ایک کو اپنی گاڑی نہیں دیتا تھا اور مجھے کسی کو بھی انکار کرتے ہوئے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے دوست میرے بارے میں ایک بات پہ ضرور متفق ہیں کہ جب میں بد لحاظی پہ اتر آؤں تو کسی کی بھی پروا نہیں کرتا۔

لیکن یہ کتنی حیرت انگیز بات تھی کہ مجھے مہر بانو کی پروا ہونے لگی تھی اور میں اس بات کو جانچنے کے لیے پورے ستائیس دن اس سے دور رہا کہ آیا یہ وقتی جذبات ہیں یا ان کی کوئی حقیقت بھی ہے لیکن ہر کوشش نا کام ہوئی اور مہر بانو میرے قریب تر ہوتی چلی گئی اور میرے گھر کے حالات کشیدہ ہوتے گئے۔
حالات کی کشیدگی کی وجہ ماریہ کی عدم دلچسپی اور میرا ذہنی تناؤ تھا۔

ان ستائیس دنوں میں ماریہ نے مجھے اتنا ہی وقت دیا جتنا وہ دیا کرتی تھی، کبھی یہاں کبھی اپنے والدین کے گھر۔ میں بے چین ہو کر راتوں کو ٹھٹھکا کر وہ ہوتی تو اسے میری طبیعت کی خرابی گردانتی اور ڈاکٹروں کے ہاں جانے کے مشورے دیتی بلکہ بضد ہو جاتی کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ اچانک کیا ہوا تھا کہ ماریہ کی ساری کشش ختم ہو گئی تھی اور مہر بانو مجھے شدت سے یاد آ رہی تھی۔ ان ستائیس دنوں میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں مہر بانو کے لیے سب کچھ کر گزروں ایسا تحفظ کہ آئندہ اسے ایسی تذلیل نہ پہنچی پڑے۔ راجو جو اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا تھا میں اس سے اسے بچانا چاہتا تھا۔ اس

لیے اس کے لیے گھر بھی لے لیا اور خرچ بھی باندھ دیا اور تب میں جان گیا کہ جسے میں دل لگی سمجھ کر نبھار ہا تھا دراصل وہ دل کی لگی بن گئی ہے اور تب میں مہربانو کی طرف جانے سے خود کو روک نہیں سکا۔ آج ستائیس دن کے بعد جب میں اس کی دہلیز پہ پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر بے تاب ہو کر آگے بڑھی۔ میں اچانک اس کی ایسی پیش رفت پہ بوکھلا گیا۔

وہ رو رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ میرے وجود سے لگی کھڑی رہی۔

”مہربانو! کوئی ایسا عمل تو مجھ پہ نہیں کرتی ہو جس سے میرا دل تمہاری طرف ہی بھٹکتا رہے۔“ میں بھیگی ہوئی آواز میں بے بسی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے میرے سینے سے لگی سسکیاں لے رہی تھی۔

اس نے کسی معصوم بچے کی طرح مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ میں اس آغوش میں چھپ جانا چاہتا تھا ہمیشہ کے لیے اور پھر میں نے مہربانو کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”مجھے قرار کی ضرورت ہے مہربانو! اور وہ قرار تم ہی دے سکتی ہو۔ مجھے چھپالو مہربانو، مجھے چھپالو۔“ میں بچوں کی طرح رو رہا تھا اور وہ میری دلجوئی کر رہی تھی۔ اس کی قربت میں سکون تلاش کرتے کرتے ہی ہوش سے غافل ہوتا گیا۔



ولید رضا کمال کو میرے گھر میں سوئے ہوئے چھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ ایسے سویا ہوا تھا جیسے اب کبھی نہیں جاگے گا۔

آج اس کا یہ رویہ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ اور کسی حد تک چونکا دینے والا بھی۔ وہ اس طرح ٹوٹ کر بکھرا تھا کہ میں خود بھی ہراساں ہو گئی تھی پھر جلد ہی میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

پہلے تو مجھے یہی شک گزرا کہ وہ نشے کی حالت میں ہے اور اول فول بک رہا ہے۔ لیکن وہ نشے کی حالت میں بالکل نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کہا سب ہوش و حواس میں کہا مجھے اپنی خوش قسمتی پہ ناز کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔

اور پھر راجو کو اپنے گھر میں دیکھ کر میری ساری خوشی ہوا ہو گئی۔

”تم یہاں۔۔۔ تم یہاں کیوں آئے ہو۔“ میں راجو کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

”لگتا ہے بہت بڑا ہاتھ مارا ہے۔ رہائش ذاتی ہے یا کرائے پر لی ہے؟“

”تمہیں اس سے کیا۔“ میں اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تھقہر لگا کر ہنس پڑا۔

”لگتا ہے جس کے گمڑوں پہ عیش کر رہی ہے وہ یہیں موجود ہے۔“ اس کی کیننگی پہ میں پیچ و تاب

کھا کر رہ گئی۔

”ایک منٹ کے اندر اندر تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ میں نے اسے دھمکی دی۔

”ایک بہت زبردست پیش کش لایا ہوں۔ زندگی بھر اتنا نہیں کمایا ہوگا۔ جتنا ایک جھٹکے میں کماؤ

گی۔ ہماری ٹیم کا ایک ڈرامہ ملک سے باہر جا رہا ہے جس رقاصہ نے اس ڈرامے میں رقص کرنا ہے اسے

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بچوں سے پوچھ رہی تھی۔ بچے اس اچانک فیصلے پہ حیران ہو گئے۔ کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی اسے۔

فرنام سراسیمہ سی ماں کے پہلو سے چپکی رہی۔ فہد بھی خوف زدہ سانان خن چپاتا ہوا ماں کے قریب آ گیا اور تب میں نے سوچا۔ میں اس کے اندیشے جھٹلا بھی تو سکتا تھا۔ میں نے جس جرات سے سچ اگلا تھا اس سے اس کا سارا حوصلہ اور اعتماد پہلی بار میں ڈھس گیا۔ مجھے اپنی کمینگی کا احساس ہوا تو میں آگے بڑھ آیا۔

سب سے پہلے تو میں نے وہ اٹیچی کیس سامنے سے پرے دھکیلا پھر میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور محبت سے اپنا بازو اس کے گرد حائل کر لیا۔ دوسری طرف سے میرے بچے آ کر مجھ سے چٹ گئے۔ میرے قریب جانے پہ اس کے رونے میں مزید شدت آ گئی۔ میں انہیں لے کر صوفے پہ آ گیا۔ پھر میں نے اسے رونے دیا۔ بہت دیر تک جب وہ رو چکی تو میں نے فرنام سے پانی لانے کو کہا۔ فرنام دوڑ کر پانی لینے چلی گئی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔

”ابھی تک جم نہیں آئے، سو رہے تھے کیا؟“

”نہیں بس۔۔۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”کیا ہوا خیریت تو ہے۔ ڈاکٹر کو دکھالیا ہوتا؟“

”نہیں ایسا بھی مسئلہ نہیں۔ خیر چھوڑو میں آج جم نہیں آسکوں گا۔ اور شاید ایک دو روز اور نہ

آسکوں۔“

”اس کا مطلب ہے، طبیعت زیادہ خراب ہے۔ پھر ہمیں ہی آپ کے گھر آنا پڑے گا۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود چکر لگا لوں گا۔“

میرے خشک سے انداز پہ وہ خاموش ہو گئی لیکن اس نے فون بند نہیں کیا۔

”ٹھیک ہے، فی الحال میں بچوں میں مصروف ہوں پھر بات کروں گا۔“

وہ پھر بھی چپ رہی۔

اس کے بعد میں نے خود ہی فون بند کر دیا۔ بچے بڑے غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

”آپ دو تین روز تک جم نہیں جائیں گے۔ ہم بھی اسکول سے چھٹیاں لے لیں گے۔“ فرنام اور

فہد خوش ہونے لگے۔

”میں چھٹیاں تمہارے لیے نہیں تمہاری ماں کے لیے کر رہا ہوں۔“

”یہ فائل ہے، چینگ ہے۔“ وہ حمایت کے لیے ماریہ کے پاس دوڑے، میں بھی پیچھے پیچھے چلا

آیا۔

ماریہ منہ ہاتھ دھو چکی تھی اور اپنے بال بنا رہی تھی۔ میں اس کے دراز بالوں کو دیکھنے لگا۔ جنہوں

نے اس کی پشت کو بالکل ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک دقت تھا مجھے ماریہ کے لمبے خوب صورت بال بہت ہی

اچھے لگتے تھے۔ لیکن اب مہربانوٹی اسٹائلش کٹنگ ماریہ کے بالوں کو ماند کر رہی تھی۔

”جاؤ اپنا سبق یاد کرو۔۔۔“ دونوں منہ لڑکا کر کمرے سے نکل گئے۔

کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اگر تم اس رقاصہ کی جگہ رقص کرنے پہ آمادہ ہو جاؤ تو تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ صرف دو گانوں پہ رقص پیش کرنا ہوگا۔ البتہ لباس پروڈیوسر کی مرضی کا ہوگا۔“

میں سمجھ سکتی تھی کہ وہ کس قسم کے لباس کی بات کر رہا ہے۔ اس نے کمینگی سے مسکراتے ہوئے میرا گال چھوا اور فون نمبر مجھے تمہا گیا۔

”اگر ارادہ بن جائے تو رابطہ کر لینا۔“ وہ سیٹی بجاتے ہوئے واپس چلا گیا۔ انکئی ابھتی سانسوں کو ہموار کرتے ہوئے واپس کمرے میں آئی اور یہ دیکھ کر خاصا اطمینان ہوا کہ ولید رضا ابھی بھی اسی طرح سویا ہوا ہے جیسے میں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کارڈ پہ کئی فون نمبر درج تھے۔ میں نے اپنے دل کے ہر گوشے سے یہ فیصلہ لینا چاہا کہ آیا میں یہ پیش کش قبول کروں یا ریجیکٹ کر دوں۔



میں اپنے رویے پہ شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ماریہ میری بیوی ہے اور میرے دو بچوں کی ماں بھی۔ آج زندگی میں پہلی بار میں نے ماریہ پر ہاتھ اٹھایا۔ وہ آٹھ دن اپنی ماں کے گھر رہ کر آئی تھی اور ان آٹھ دنوں میں میں کس قدر اس کی بے بسی پہ جلا کر ہاتھ تھا اسے اس چیز کا ذرا بھی تو اندازہ نہ تھا۔ اپنا محاسبہ کرنے کے بجائے وہ الٹا میرے معاملات کی پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ اسے کسی نے یہ رپورٹ دی تھی کہ مجھے براؤن بالوں والی خاتون کے ہمراہ گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہے۔

”ہاں وہ میرے جم میں انسٹرکٹر ہے اور ہمیں کئی بار اپنے کام کے سلسلے میں اکٹھے آنا جانا پڑتا ہے۔“

میرے اقرار پہ وہ مجھے دیکھنے لگی۔

”پہلے بھی تو کئی انسٹرکٹر آئی ہیں تب تو تمہیں کسی نے ان کے ساتھ گھومتے پھرتے نہیں دیکھا۔“

”اب جم کی صورت حال وہ نہیں ہے جو تھی۔ جم کے عقب میں بیوٹی سیلون بنا ہے کبھی آکر دیکھنا آنکھیں چکا چوند ہو جائیں گی اور تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟ تمہیں میری پروا ہے؟“ میں پھٹ پڑا۔

ماریہ میری طرف دیکھنے لگی۔

”اب تم بازاری عورتوں سے اپنا کاروبار چلو او گے۔ دھندے کا اچھا طریقہ اختیار کیا ہے تم نے۔“ وہ طنز پہ بولی۔

میری غیرت پہ اس کے الفاظ تازیانہ بن کر لگے۔ اور میرا اس پہ ہاتھ اٹھ گیا۔ پھٹکھاتے ہی وہ پھر گئی۔

”اس سے پہلے تم نشہ کرتے تھے، اب تمہیں بازاری عورتوں کی بھی عادت ہو گئی ہے۔“ کہتے ہوئے وہ اپنے اور بچوں کے کپڑے نکالنے لگی۔

اس سے پہلے وہ کبھی اس قدر ہٹ دھرمی پہ نہیں اترتی تھی۔ لگتا تھا اس کے پاس مکمل رپورٹس تھیں۔ مگر مجھے اس چیز کا قطعی خوف نہیں تھا۔

”میں یہاں سے جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے۔ تم لوگ میرے ساتھ چلو گے یا یہیں رہو گے؟“

”آئی ایم سوری ماریہ۔“ شاید میں اس سے زندگی میں پہلی بار سوری کر رہا تھا۔
 ”درحقیقت تمہیں میرے خلاف کسی نے بھڑکا دیا ہے۔ میں تمہاری بے بسی پہ پچھلے چند روز سے
 ویسے ہی جل کر رہا تھا۔ تمہاری باتوں پہ مزید سخت پا ہو گیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“
 ماریہ آئینے سے مجھے دیکھتی رہی۔

میں نے شانوں سے تمام کرا سے اپنی طرف موڑا۔
 ”مجھے معاف کر دو۔ مجھے تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔“
 ”مجھے پھڑکا مال نہیں ہے۔ ملال ہے تو ان لفظوں کا جو تم نے مجھ سے کہے۔“
 ”ان کا مطلب ہے میں نے جو کچھ بھی سنا وہ سب سچ تھا؟“
 ”ایسا کچھ نہیں ہے ماریہ۔۔۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“
 لوگ ہماری خوش حال گریہ سے حد محسوس کرتے ہیں۔ تم لوگوں کو ان لوگوں کے اپنی گریہ سے
 خود آگ لگا رہی ہو۔ تمہیں مجھ پہ اعتماد ہونا چاہیے۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔
 میرے بازوؤں میں ماریہ بھی لیکن میرا دھیان مہربانوں کی طرف تھا۔
 میں نے غلٹ میں نون بھی بند کر دیا تھا۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ میں اس کے چہرے
 سے بال ہٹاتے ہوئے نرمی سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔



رات اس نے اپنی بیوی کو شاپنگ کرائی تھی۔
 مجھے یہ اطلاع حسیب نے فراہم کی تھی۔
 ”یعنی تمہاری لگائی ہوئی آگ کام کر گئی۔“ میں نے جلن محسوس کرتے ہوئے حسیب سے کہا تو وہ
 ہنس پڑا۔
 ”تب ہی تو وہ اپنی بیوی کو منانے کے لیے اسے شاپنگ کر رہا ہے۔“
 ”لیکن مجھے تو لگتا ہے ان کا کہیں جانے کا ارادہ ہے۔ کیونکہ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ دو چار روز
 جم نہیں آئے گا۔“

حسیب میری بات پہ پھر ہنسنے لگا۔
 ”اس کی بیوی کے دل میں جو پھانس چبھ چکی ہے، وہ دو چار دن تو کیا اب دو چار سال بھی نہیں
 نکلی، اب پتا چلے گا ولید رضا کو۔“
 ”تمہیں یقین ہے کہ تمہاری باتوں پہ ماریہ نے صدق دل سے یقین کر لیا ہوگا۔ کیا وہ اپنے شوہر
 کے بہلاوے میں نہیں آئے گی؟“
 ”میں ماریہ بھابھی کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اپنے شوہر سے بے پناہ محبت ضرور کرتی
 ہے۔ لیکن اس کے پیچھے سائے کی طرح پھرتی بھی رہتی ہے۔ یعنی اسے پتا ہے کہ اس کا شوہر ایسی کمزوری

یا ایسے شوق میں مبتلا ہے جو برائی کی جڑ ہے۔ عارضی طور پر وہ میری دی گئی انفارمیشن کو اپنے شوہر کی باتوں سے بھلا تو دے گی لیکن اپنے دل سے فراموش نہیں کر سکے گی اور تم دیکھنا وہ میرے پاس دوبارہ ضرور آئے گی۔ یہ جاننے کے لیے کہ میں نے اتنا بڑا الزام اس کے شوہر پر کیسے لگایا اور تب جو دلائل و ثبوت اسے ملیں گے۔ وہ تم بھی نہیں جانتی۔“

”تم بہت بڑے کمینے ہو۔ حالانکہ شکل سے تم بالکل بے وقوف لگتے ہو۔“

حسیب نے میری صاف گوئی کا بالکل برا نہیں مانا۔

”اچھا یہ بتاؤ اس فلم کی تم نے کتنی کا پیاں بنائی ہیں؟“

”ایک بھی نہیں، میرے پاس صرف اور پینجل ہے۔“

”تو وہ تم مجھے کب دو گی؟“

”جب مجھے اچھی طرح سے اپنے تحفظ کا یقین ہو جائے گا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا، کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟“

میرا حسیب کے بھولا بننے پر واری صدمے ہونے کو دل چاہا۔

”میں اس بات کا کیسے یقین کر لوں کہ تم اس کے ذریعے مجھے نقصان نہیں پہنچاؤ گے؟“

”واٹ نان سینس۔ مجھے ولید رضا سے بدلہ لینا ہے یا تم سے اور پھر اس کے عوض میں نے

تمہارے کتنے کام کیے ہیں۔ تمہیں ہر طرح کی انفارمیشن دیتا رہا۔ ولید رضا کو تمہارے لیے کنوینس کیا اور

اب اس کی بیوی یعنی ماریہ کو تمام صورت حال سے باخبر کر دیا۔ کیا یہ سب کچھ میں نے تمہارے فائدے

کے لیے نہیں کیا۔“ اس نے گویا صفائی دی۔

”اگر میں یہ کہوں کہ اس کا تمہیں بھی فائدہ تھا اور اس فائدے کے لیے تم نے مجھے استعمال کیا تو

بے جا نہ ہوگا۔“ اس نے جتایا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ بھڑک اٹھا۔

”فائدہ نہیں تھا تو تم نے ایسا کیونکر کیا؟“

”میں بعد میں حسیب سے بلیک میل نہیں ہونا چاہتی تھی اس لیے دو ٹوک بات کر رہی تھی۔“

”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس کی کیا وجوہات ہیں، میرا جو تم سے مفاد ہے وہ بھی تمہارے

سامنے ہے۔ میں وہ فلم لینا چاہتا ہوں۔ اس سے میں ولید رضا کو بدنام کروں گا۔ اس طرح اس کا جم بند

ہو جائے گا۔ پہلے وہ مجھ سے فائدہ اٹھا رہا تھا اب میں اس سے فائدہ اٹھاؤں گا۔“ وہ جھل سے مجھے سمجھا رہا

تھا۔

”ذرا یہ سوچو جب تم اس فلم سے ولید رضا کو بدنام کرو گے تو میرا کیا ہوگا۔ میں نے تو ولید رضا سے

ابھی کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ اس لیے ابھی تمہیں صبر کرنا ہوگا۔“ میں نے حسیب کو دو ٹوک جواب دیا تو وہ

خاموش ہو گیا۔

اسی اثناء میں میرے سیل فون کی بپ بج اٹھی۔ میں نے نمبر دیکھا، ولید رضا کا نمبر تھا۔

”ولید کا فون ہے۔“ میں نے حسیب سے کہا اور اس کے آفس سے باہر نکل آئی۔

اتنی دیر میں تین چار ٹیل ہو چکی تھی جبکہ میں اس کی پہلی ہی ٹیل پہ فون ریسیو کیا کرتی تھی۔
”ہیلو۔“

”کہاں تھیں تم، میں اتنی دیر سے فون کر رہا ہوں۔“ وہ بے چینی سے پوچھ رہا تھا۔
”بس ذرا مصروف تھی۔“

”اچھا میں ذرا جلدی میں ہوں۔ میں نے یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ میں شہر سے باہر جا رہا ہوں اپنی فیملی کے ساتھ۔ تقریباً ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ اس لیے پریشان مت ہونا۔“ وہ جلدی جلدی بتا رہا تھا۔

میں بھڑبھڑ جلنے لگی۔



”میں تو آپ کو آنکھوں سے بھی اوجھل نہیں کرنا چاہتی کجا کہ آپ شہر سے باہر جائیں۔“ اس کے اس جملے میں سر تا پا سرور میں ڈوب گیا تھا۔

پہلے تو میں یہی سوچتا تھا کہ اسے تشو کی طرح استعمال کر کے پھینک دوں گا۔ لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ ماریہ میری برابر والی سیٹ پہ بیٹھی تھی۔ بچے شور شرابا کر کے سو چکے تھے۔

”بس تھوڑا سا ہی سفر پاتی ہے۔ آدھے گھنٹے میں ہم لاہور پہنچ جائیں گے۔“ میں نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جو نارنجی اور سرخ رنگ کے سوٹ میں ہمیشہ کی طرح دلکش لگ رہی تھی۔ لیکن صرف دلکش لگنا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اس چیز کا اندازہ مجھے مہربانو سے مل کر ہوا تھا۔ مہربانو مجھے جتنی اہمیت دیتی تھی کبھی تو مجھے گمان ہونے لگتا کہ میں انسان نہیں کوئی دیوتا ہوں۔ وہ میری تعریفیں کرتی نہیں تھکتی تھی۔

میں ماریہ کی تعریف تو کرتا تھا لیکن ماریہ نے میری تعریف کم ہی کی تھی۔ اس کا خیال تھا میں پہلے ہی خود پسند انسان ہوں۔ مزید تعریفوں پر تو انتہاؤں کو پہنچ جاؤں گا۔

ایک روز میں نے اس بات کا احساس دلایا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”ولید! اب خود ہی دیکھیں۔ بچوں کی مصروفیت میں آئینہ دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ بچے بڑے ہو جائیں گے تو میں آپ کی ساری شکایتیں دور کر دوں گی۔“

زندگی اتنی ہی بے رنگ گزر رہی تھی کہ مہربانو نے زندگی میں داخل ہو کر مجھے زندگی کی نئی جہتوں سے روشناس کرایا تھا۔



اتنے بڑے پروگرام میں پہلی بار پر فام کر رہی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں لوکل پروگرام ہی زیادہ کیے تھے اس کام کے لیے میں بڑے جوش تھی اور کچھ خوف زدہ بھی۔

پرفارمنس دینے کے بعد میں خوش نہیں تھی۔ میرا دل اندر سے مردہ ہو رہا تھا۔ رات بھر میں نے کروٹیں بدل بدل کر وقت گزارا تھا۔ میں زندگی کی اسی کشائش سے نجات پانے کے لیے ہر جوا کھیلنے پر

رضامند تھی۔ پھر یہ بے چیدیاں میرے اندر کیسی تھیں۔ میں نے اپنے اندر سے اٹھنے والے ہر احساس کو دبا دیا۔ میں نے سوچا تھا۔ میں پارسا کے لیے سب کچھ کروں گی اور پھر اسے لے کر کہیں دور چلی جاؤں گی۔ اسے ایک پڑھا لکھا مستقبل دوں گی اور اس کے لیے مجھے ڈھیر سارا پیسہ چاہیے۔

میں ولید رضا کو بھی صرف اس لیے دھوکا دے رہی تھی کہ وہ ہر طرف سے بدل ہو کر میرا اور صرف میرا ہو جائے۔ وہ کچھ جائیداد میرے نام کر دے۔ پھر بھلے سے اس کا دیوالیہ نکلے یا کچھ ہو۔ اچانک نیچے سڑک پہ بھاگتی دوڑتی گاڑیاں دیکھ کر مجھے پارسا کا خیال آیا۔ جسے میں راجو کے پاس چھوڑ کر آئی تھی۔ پارسا کے بارے میں، میں نے راجو پہ پہلی اور آخری بار اعتماد کیا تھا۔ راجو کے پاس مجھے اسے اس لیے چھوڑنا پڑا فی الوقت وہ کسی اسکول میں نہیں پڑھ رہی تھی۔ اس لیے اسے ہاسٹل میں چھوڑنا ناممکن تھا اور میرا یہ پروگرام ارجنٹ تھا سو مجھے راجو پہ اعتماد کرنا پڑا۔ اچانک مجھے گھبراہٹ ہونے لگی اور میرا دل چاہا فوراً پارسا سے بات کروں۔ میں نے راجو کا فون ملایا رات کے تین بج رہے تھے۔ گھنٹیاں بجتی رہیں لیکن کسی نے فون ریسپونڈ نہیں کیا۔ میرے بے چیدیاں اور بڑھ گئیں اور بالآخر میں نے تھک ہار کر فون ایک طرف پھینک دیا۔



معاملات کا لین دین کرتے ہوئے میرا سیل فون بجا۔ نمبر راجو کا تھا۔
 ”فارغ ہوگئی ہو یا ابھی مصروفیت ہے۔“ وہ بڑی اپنائیت سے پوچھ رہا تھا ظاہر ہے وہ لالچی کمیشن لینے کے لیے بے قرار تھا۔ راجو کی آواز سننے ہی میرا میٹر ٹھوم گیا۔ میرا دل چاہا کہ اسے کھری کھری سناؤں۔

”تم نے تو کہا تھا کہ یہ لوگ پرکشش معاوضہ دیں گے۔ لیکن انہوں نے تو مجھے اتنا بھی نہیں دیا جتنا میں پرائیویٹ محفلوں میں جا کر کمایا کرتی تھی۔“ حیرت کی بات تھی راجو نہ تو حیران ہوا اور نہ ہی چونکا بڑے سکون سے ہلکا سا ہنسا۔

”حساب کتاب کی بات پھر کر لیں گے۔“

پارسا سے تو بات کر لو وہ تمہیں یاد کرتی رہتی ہے۔“

کیسا لہجہ تھا راجو کا میں سمجھ نہیں پاتی۔ دوسرے ہی پل اس نے فون پارسا کو تھما دیا۔

”مما، ممما۔“ پارسا بے چینی سے بولی۔

”پارسا، تم ٹھیک تو ہو۔“ پارسا کی آواز پہ میں بے چین ہوگئی۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں، خوب مزے میں ہوں۔“

”مزے میں؟“ میں چونکی۔

اسی وقت راجو نے فون لے لیا۔ ”پریشان نہ ہو، پارسا میرے پاس بہت خوش ہے۔ یہ بتاؤ تم کب آرہی ہو؟“ میں پارسا کی بات یہ الجھ سی گئی تھی۔ آخر راجو نے اسے ایسی کیا خوشی دے دی تھی جس سے وہ بہت مزے میں تھی۔ جبکہ وہ راجو کو پسند بھی نہیں کرتی تھی۔

”مہر وکب آ رہی ہوتی؟“ راجو کا لہجہ بہت اپنائیت سے لبریز تھا۔
 ”شاید کل صبح تک۔“ میں نے بے خیالی میں کہا تھا۔



میں تین روز سے متواتر مہربانو سے رابطہ کر رہا تھا۔ لیکن، اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے جب یہ پتا چلا کہ پچھلے ہفتے سے وہ مسلسل چھٹیوں پہنچی۔ تو میرے لیے یہ بات پریشانی کا باعث تھی۔ میں ماریہ کو اچھی طرح مطمئن کر چکا تھا۔ لیکن مہربانو کو نہ پا کر میری بے چینیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا آج وقت نکال کر اس کے گھر جاؤں گا۔ وہ گھر جو میں نے اس کے تحفظ کے لیے اسے لے کر دیا تھا اور جس میں جا کر اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ”اگر ایسا ہی گھر مجھے پہلے ملا ہوتا تو میں شاید اتنی رسوائیوں کا شکار نہ ہوتی۔“ اور تب میرے دل میں خواہش ابھری تھی۔ ایک ہمدردی کی لہر۔ اگر میں یہ گھر مہربانو کے نام ہی کر دوں تو میرا کچھ بھی کم نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے لیے مہربانو کو مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ وہ اس گھر کی چار دیواری سے پھر کبھی باہر نہیں نکلے گی۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ مجھ پہ نثار ہو گئی۔ کہنے لگی کہ اسے کبھی کوئی ایسا نہیں ملا جس نے اسے تحفظ دیا ہو۔

”آج پہلی بار مجھے کسی نے جی خوشی دی ہے۔ میں اس خوشی کو سنبھال کر رکھوں گی۔ آپ کے مان کو کبھی نہیں توڑوں گی۔“ اور میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔
 میں نے گاڑی کی اسپید کچھ کم کر دی۔ میں مہربانو کے گھر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اچانک ہی میرے ہاتھ اسٹیرنگ پہ جم سے گئے۔ پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین ہی نہیں آیا۔ لیکن میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ سچ تھا۔

مہربانو کا نام نہاد شوہر، اس کے گھر سے نکل رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر گاڑی ذرا سی ریورس کی اور گلی کی اوٹ میں کر لی۔ اس نے اپنی پھینچو بانیک اشارت کی اور دوسرے ہی لمحے غائب ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میرا غصے سے دماغ پھٹنے لگا۔ مہربانو مجھ سے کون سا کھیل کھیل رہی ہے؟ میرے ذہن میں ان گنت سوال شور مچا رہے تھے۔ اگر اسے ایسی ہی زندگی گزارنا تھی تو پھر اس نے مجھے رورو کر اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی داستانیں کیوں سنائی تھیں۔

ابھی ابھی جو میرے اندر اس کی ہمدردی جاگ تھی، وہ یک دم غائب ہو گئی۔ مہربانو سے بے پناہ کراہیت و نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو وہ پریشان سی سرپکڑے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر چونک گئی۔
 ”وہ یہاں کیوں آیا تھا؟“ یہ سوال کرتے ہوئے مجھے خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔
 ”تم تو عزت کی زندگی کے سننے دیکھتی آئی تھیں۔ پھر میرے مل جانے پہ راجو جیسا شخص تمہارے گھر میں کیسے آ گیا۔“ میں چلا یا وہ تب بھی خاموش رہی۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم اتنے دن سے کہاں تھیں۔ بتائی کیوں نہیں ہوتی۔“ میں نے اسے تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔



کس حیثیت سے وہ مجھ پہ اتنی ملکیت جتا رہا تھا۔ کیا اس نے مجھ سے نکاح کیا تھا۔ یہ سوال تو مجھ سے کبھی راجو نے نہیں پوچھا تو وہ کون ہوتا تھا مجھ سے یہ پوچھنے والا۔ کرائے کی کوٹھی میں بٹھا کر میں ہزار روپے ماہانہ دے کر وہ سمجھتا ہے کہ اس نے مجھے اپنا زرخیز بنالیا ہے۔ اور میں پھٹ پڑی۔ ”راجو میرا شوہر ہے اور یہ بھی مت بھولو کہ میں ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ میں اس سے اپنی بیٹی لینا چاہتی ہوں۔ اس لیے مجھے اس کے لیے اپنے گھر کے سب دروازے کھلے رکھنا ہوں گے۔“

”وہ بیٹی صرف تمہاری ہی نہیں اس کی بھی ہے۔“
”وہ صرف میری بیٹی ہے۔ وہ راجو کی کچھ نہیں لگتی۔“ میں ہذیانی انداز میں چلائی۔ تو اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”چلے جاؤ تم یہاں سے۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“
میں ولید سے الجھنا نہیں چاہتی تھی کہ یہ معاملہ بعد کا تھا اصل کھیل تو میرے ساتھ راجو نے کھیلا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے وہاں سے بھاری رقم ملی ہے اور میں اس سے چھپا رہی ہوں۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں وہاں سے صرف دس ہزار لے کر آئی ہوں۔ وہ تا دیر مجھے بہلاتا پھلاتا رہا۔ لیکن جو سچ تھا میں اس سے کیوں مکتی۔

اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے اسے سچ رقم کا پچاس فیصد حصہ نہ دیا تو وہ پارسا کو کبھی بھی مجھے نہیں دے گا۔ اور اسے بچ دے گا۔ جس پارسا کے لیے میں یہ سب کچھ کر رہی تھی آج وہ داؤ پہ لگ گئی تھی۔ یہ سوچ کر میرے دماغ کی شریانیں پھٹ رہی تھیں کہ پارسا اس جیسے بے غیرت شخص کے پاس ہے۔

میں اس لمحے کو کوس رہی تھی جب میں پارسا کو اس کے حوالے کر گئی تھی۔ میں اسے اتنی رقم کہاں سے لا کر دیتی۔ پھر میرے دل میں یکا یک خیال آیا کہ قانون کا سہارا لوں لیکن دوسرے ہی پل یہ خیال جھٹکنا پڑا۔ راجو پارسا کا باپ ہے اور اس کا ٹھوس ثبوت کاغذات میں موجود ہے۔ کیا سچ بتانے پہ قانون میری مدد کرے گا یا مزید رسوائیاں مجھے آن گھیریں گی۔ میں مزید پریشان ہونے لگی۔ نہ جانے غصے میں میں نے ولید سے کیا اول فول بک دیا۔ مجھے اب خود اپنے رویے کا ملال ہو رہا تھا۔ مجھے ولید کو بتا دینا چاہیے تھا کہ راجو مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔



”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ اس نے ہاسٹل سے میری بیٹی کو اغوا کر لیا ہے اس کے بدلے وہ مجھ سے رقم مانگ رہا ہے۔۔۔ میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں۔“ وہ رونی رہی۔
قدرتی عمل تھا اس کے آنسو میرے پتھر دل پہ ضرب لگا رہے تھے۔
وہ رونی رہی۔ اور میرا دل اپنی بے بسی پہ دبائیاں دے رہا تھا۔

شاید میں اپنے دل کے ہاتھوں ایک بار پھر مجبور ہو کر مہربانو کی دہلیز پہ پہنچ جاتا۔ لیکن ایسا ہونے سے قبل کچھ اور ہو گیا۔
راجو جو مہربانو کا شوہر تھا وہ آج مجھ سے آنکرایا۔ وہ بڑے اعتماد سے میرے جم میں آگیا تھا اور آتے ہی اس نے کہا۔

”میں تمہارا زیادہ وقت ضائع نہیں کروں گا۔“

حال ہی میں مہربانو نے ملک سے باہر جا کر ایک شو میں رقص کیا جس کا معاوضہ آدھا آدھا ہم دونوں نے لیتا تھا۔ لیکن وہ سارے کی مالک بھی بن رہی ہے اور الٹا مظلوم بھی۔ ہماری لڑائی اسی بات پہ ہے۔ اگر وہ ایمان داری سے میرا حصہ مجھے دے دے گی تو میں اسے اس کی بیٹی لوٹا دوں گا۔“ یہ سن کر میرا دماغ جھٹکنے لگا۔



آج اس نے مجھ پہ ہاتھ اٹھایا تھا۔ نہ صرف ہاتھ اٹھایا تھا بلکہ وہ مجھ سے سارے تعلق ختم کرنے آیا تھا۔ وہ چاچکا تھا اور میں ان خالی دیواروں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ مہربانو تم کتنی بے وقوف تھیں۔
کشتیوں میں پاؤں رکھ کر تم نے سفر جلدی کٹ جانے کی سوچی۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور دونوں ہی کشتیاں ڈوب گئیں۔



مار یہ کارویہ میرے ساتھ بہت کھنچا کھنچا سا تھا۔ اس کی مصروفیات بھی آج کل کچھ مشکوک سی ہو رہی تھیں۔ وہ پورا پورا دن گھر سے غائب رہتی۔ میں پوچھتا تو وہ مجھے مناسب جواب دینے کے بجائے گھر میں اٹھا بیٹھ کر نے لگتی۔

یہ سب کچھ اس کی فطرت کے خلاف تھا لیکن وہ کر رہی تھی۔ آج میں خود بھی بہت ڈسٹرب تھا۔ اتنا ڈسٹرب کہ بتا نہیں سکتا۔ آج میرے فون پہ ایک نامعلوم کال آئی تھی۔ جس نے مجھے انعام کیا تھا کہ عنقریب میرے جم کی شہرت خراب ہونے والی ہے۔ وہ آواز بالکل اجنبی تھی۔ میں جیج مچ پریشان ہو گیا تھا۔

ادھر مار یہ مجھ سے کوئی بات کرنے پہ آمادہ نہیں تھی۔
”میری بات سنو مار یہ۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

مار یہ نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔
”لیکن میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“
”مگر کیوں؟“ میں چیخ گیا۔

”جو سچ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں اس کو چاہتے ہوئے بھی نہیں جھٹلا سکتی۔“
”تم نے جو کچھ دیکھا ہے شاید وہ سچ ضرور ہو۔ لیکن وہ سچ باقی رہنے والا نہیں ہے۔“ میں بے بسی سے بولا تو مار یہ خنسی سے ہنس پڑی۔

”شاید تم سمجھ رہے ہو، اب کی بار بھی مجھے باتوں سے بہا لو گے۔ لیکن تم نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی میں تو پہلی بار بھی نہیں پہلی تھی۔ تو اب کیسے بہل جاؤں گی۔“

”تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے ماریہ۔“
”کاش ایسا ہی ہو۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

”جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔“

”میں بھول جاؤں گی لیکن وہ نہیں بھولے گی۔“ ماریہ طنز یہ بولی۔

”وہ پھر کسی چور راستے سے میری ازدواجی زندگی میں داخل ہو جائے گی اور اب یہ کھیل چلتا رہے گا۔ کیونکہ تم نے خود یہ راستے کھلے رکھے ہیں۔“

”تم ہونا ماریہ! مجھے اس بُرائی سے نہیں بچاؤ گی؟“ میں نے نکاست خوردہ لہجے میں کہا تو ماریہ ہنست پڑی۔

”میں تمہیں اپ کی برائی سے نہیں بچاؤں گی۔ میں نے اب اپنا فیصلہ اللہ پہ چھوڑ دیا ہے۔“ ماریہ کے لہجے میں ایسی بات تھی کہ میں کانپ سا گیا۔

اس کے بعد وہ تکیہ اٹھا کر میرے پاس سے چلی گئی۔ میں سر قہام کر بیٹھ گیا۔ آخر ماریہ کو یہ ساری باتیں کس نے بتائیں۔

کہیں مہر بانو خود ہی تو یہ کھیل نہیں کھیل رہی۔ میری نگاہ قریب پڑے اپنے سیل فون پہ پڑی میں مس کالز چیک کرنے لگا۔

نمبر دیکھ کر میری آنکھیں پھٹ گئیں کیا ڈھٹائی تھی کہ وہ مجھ سے اب بھی رابطہ رکھنا چاہتی تھی۔ کس توقع پہ اس نے مجھے فون کیا۔ جبکہ میں اسے جم سے بھی بے دخل کر چکا تھا اور اس سے کوٹھی بھی خالی کرا لی تھی۔ میں نے مشتعل ہو کر اسے فون کیا۔ تو اس نے پہلی ہی نیل پہ فون ریسو کر لیا اور بے ثباتی سے بولی۔

”میرا تو خیال تھا، آپ مجھے اب کبھی فون نہیں کریں گے۔ لیکن آپ نے تو تیسرے ہی روز فون کر لیا چلیں محبت کا نہ سہی نفرت کا ہی سہی کوئی تعلق تو رہا۔“

”مجھے تمہاری کوئی بکو اس نہیں سننی اور آئندہ مجھے کالز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”پلیز ولید رضا! میری بات سنیں۔“ وہ یک دم رونے لگی اور منتوں پہ اتر آئی۔

”تمہاری اصلیت میں پہلے ہی دن سے جانتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں جانتے بوجھتے دھوکا کھاتا رہا۔ لیکن اب ولید رضا کسی جھانے میں نہیں آئے گا۔“

”تمہیں آنا پڑے گا ولید رضا! تمہیں آنا پڑے گا۔“ وہ چلائی تھی۔

پھر وہ فوراً ہی سابقہ انداز میں آگئی۔

”مجھے صرف پچیس لاکھ روپے چاہئیں، پلیز مجھے وہ دے دو۔ میں ساری عمر تمہاری احسان مند رہوں گی۔ میں جانتی ہوں تم مجھے اتنی رقم دے سکتے ہو۔“

اس کی ڈیمانڈ پہ مجھے شدید کرنٹ لگا۔

”میں مجبور ہوں۔ راجو میری بیٹی کو بیچ دے گا۔ پارسا میری زندگی کا کل اثاثہ ہے۔ میں نے اچھایا

براجو کچھ بھی کیا صرف پارسا کے لیے کیا ہے۔“
 ”بکواس بند کرو، تم نے صرف اپنے لیے کیا ہے۔“
 ”تو کیا تم نے اپنے لیے نہیں کیا ہے۔“ وہ دودب بولی۔
 ”میں تمہیں اس کا معاوضہ دیتا رہا ہوں۔“ میں نے حقارت سے کہا۔
 ”وہ بہت کم تھا۔ میرا تمہاری طرف ابھی قرض باقی ہے جو تمہیں لوٹانا ہوگا ہر حال میں ہر قیمت پر۔“ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ میں نے فون بند کر کے آف ہی کر دیا۔



میں راجو کی ڈیمانڈ پر اس قدر فنی دباؤ میں مبتلا ہو چکی تھی کہ مجھے کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔
 تقریباً ایک ماہ سے میری بیٹی اس کے پاس تھی۔ اس نے اسے کہاں رکھا ہوا تھا، وہ کس حال میں تھی۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔

ہر گز رات دن اور ہر گہری تاریکی میں جاتی رات مجھے پارسا کے لیے نئے سرے سے پریشان کر دیتی۔ میں نے راجو کو اپنا سب کچھ دے دیا تھا لیکن وہ سب کچھ ڈھائی لاکھ سے زیادہ نہیں بنا۔ راجو کی ایک ہی ضد تھی وہ پچیس لاکھ سے کم نہیں لے گا۔ میرا جی چاہتا تھا اسے گولی سے اڑا دوں۔ کچھ ایسا کر دوں کہ میری اس سے جان بھی چھوٹ جائے اور پارسا بھی مل جائے۔
 مجھے کچھ بھائی نہ دیا تو میں نے حسیب کے پاس فون کیا کہ اب وقت آچکا تھا کہ میں اس کریڈٹ کارڈ کو کیش کروں جو میں نے اچھے دنوں میں بنایا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔“
 ”تم اتنے بھولے تو نہیں ہو جو بالکل ہی نہ سمجھ سکو۔ ہاں اگر میرے ہی منہ سے سننا چاہتے ہو تو سنو۔ میں ولید رضا کو بلیک میل کر کے پیسہ نکلاؤں گی۔ وہ وہی کیسٹ پریس میں دوں گی۔ جو تم نے مجھ سے بنوائی تھی اور ساتھ اپنا بیان دوں گی۔“
 ”تم اس کیسٹ کا استعمال اس طرح نہیں کر سکتیں۔“ حسیب کی بے چینی میں اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ لیکن اس وقت مجھے صرف اور صرف اپنا مفاد دیکھنا تھا۔

”کیوں نہیں کر سکتی۔“ میں تنک کر بولی۔ ”آخر دیا ہی کیا ہے تمہارے سینٹھ دوست نے مجھے اور مجھے دے بھی کیا سکتا تھا۔ میں ایسے مردوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس نے مجھے استعمال کر کے ایک طرف پھینک دیا لیکن اسے اچھی طرح سمجھا دینا ریم کا انتظام کر لے ورنہ بہت پچھتائے گا۔ بہت زیادہ۔“ اب میں پاگلوں کی طرح چلائے لگی تھی۔
 میرے بے بسی کے آنسو میرے ہاتھ پر گر رہے تھے۔ میں نے فون بند کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



میں رات کو جم سے فارغ ہو کر آیا تھا تب تو حسیب نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ جیسی اس نے

اب کی تھی۔ نیند ایسی اڑی کہ میں بغیر ناشتا کیے ہی صبح ہی صبح جم پہنچ گیا۔ حسیب مجھ سے زیادہ فکر مند بیٹھا تھا۔

”وہ یہ سب کچھ کیسے کر گئی۔“ میں حسیب پہ چڑھ دوڑا۔ اس کا چہرہ اتر اہوا تھا۔
 ”میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے؟“ میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔
 ”میں نہیں جانتا اور تمہیں پتا ہے لیڈریز ٹائم میں کوئی لڑکا اندر نہیں جاتا۔“
 ”مجھے سچ بتاؤ ورنہ میں تمہارا خون کر دوں گا۔“

اس نے سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔
 ”کیا تمہیں نہیں پتا کہ مہربانو کیسی عورت تھی۔ ایسی عورتیں وقت آنے پہ اپنا مفاد کیسے نکالتی ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے؟“ وہ مجھ سے زیادہ چلایا۔

”اس کے باوجود تم آفس کی چابیاں تک اسے تمہا کر گئے؟“
 ”مجھے کیا پتا تھا، میں تو ملازم تھا یہاں کا۔ مجھے کیا معلوم سیلون میں کیسی کیسی عورتیں آتی تھیں اور یہ کب؟ کیسے ہوا؟ کس منصوبے کے تحت ہوا اور کیونکر؟“ آخر میں اس نے چپھتی ہوئی نظریں مجھ پہ ڈالی تھیں۔ میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے مقابل بیٹھ چکا تھا۔
 ”ایک بات پوچھوں تم سے؟“ میں نے سراٹھا کر حسیب کی طرف دیکھا۔
 ”تمہارا کوئی لین دین کا تنازعہ چل رہا تھا اس سے؟“
 ”ہونہ۔“ میں نے غصے سے سر جھٹکا۔

”تمہیں دیکھ لوں گا۔“ میں پھنکارتے ہوئے اٹھا۔ حسیب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”یہ جوش کا نہیں ہوش کا وقت ہے۔“

”چھوڑ دو مجھے۔“ میں نے حسیب کو دھکا دیا اور اپنا ریوالور نکالا۔ جو میں گھر سے لے کر نکلا تھا۔
 ”نہیں ولید! میں تمہیں ایسا ہرگز کرنے نہیں دوں گا۔ وہ عورت تو چاہتی ہی یہی ہے کہ تم پھانسی کے پھندے پہ پہنچ جاؤ۔“

میرے ہاتھ ہی نہیں قدم بھی رک گئے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر حسیب کی طرف دیکھا۔
 ”کیا جانتے ہو تم اس کے بارے میں؟“

”جتنا تم جانتے ہو، اتنا ہی میں جانتا ہوں۔“ حسیب نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
 ”اس نے جتنی ڈیمانڈ کی ہے بہتر ہے تم اسے خاموشی سے ادا کر دو۔ وہ سب کچھ تمہاری عزت سے زیادہ نہیں ہے۔“

حسیب کے مشورے پہ میں چپ کا چپ رہ گیا۔
 ”اسے تو میں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ یاد کرے گی۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا ریوالور جیب میں ٹھونس لیا۔ حسیب نے گہرا سانس خارج کیا اور بیٹھ گیا۔
 ”ناشتا منگو اوں تمہارے لیے؟“ اب وہ مجھے ٹھنڈا کر رہا تھا۔
 ”نہیں۔“ میں کھڑا ہو گیا۔ ایک عجیب طرح کی بے چینی نے مجھے گھیر لیا تھا۔



آج اس نے مجھے فون کیا۔ اور ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میری کچھ آس سی بندھ گئی۔ حسیب نے نہ جانے اسے کیا کچھ بتایا ہوگا۔

میں یہ جانتا بھی نہیں چاہتی۔ لیکن میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ اتنی آسانی سے وہ وڈیو کیسٹ اس کے ہاتھ میں دے دوں گی۔ میں نے اپنی سیکورٹی کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ لیکن جب اس نے یہ کہا کہ میں اس کے گھر ملنے آؤں تو میں ٹھنک گئی۔

”گھبراؤ نہیں۔ میری مسز گھر پر ہی موجود ہوں گی۔ اطمینان رکھو۔“

میں اس چیز کا کیسے اطمینان کر لیتی کہ اتنا کچھ جان لینے کے بعد وہ مجھے زندہ بھی چھوڑے گا یا نہیں۔ یہ فیصلہ میرے لیے بہت مشکل تھا۔

”اگر میں نے یہ نہ کیا تو میں پارسا کو کھود دوں گی۔ مجھے ہر قیمت پر اس آگ کے سمندر میں جھلاٹ لگانا ہوگی۔“ میں نے تڑپ کر سوچا پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں ولید رضا کے گھر ضرور جاؤں گی۔ لیکن پولیس کو انعام کر کے اگر میں تین باچار گھنٹے میں واپس نہ لوئی تو پولیس نوٹس لے گی۔ لیکن پھر میں جلد ہی ہوش میں آ گئی۔

اگر میں نے قانون کو بیچ میں ڈالا تو میں خود مجرم ثابت ہو جاؤں گی۔ قانون مجھے تاوان مانگنے پر حراست میں لے لے گا۔ میں نے حسیب کے پاس فون کیا اور اسے اطلاع کی کہ اس کا دوست مجھے اپنے گھر بلارہا ہے۔

”جب تم نے مجھے معاملے سے نکال ہی دیا تو پھر مجھ سے رابطہ کیوں کر رہی ہو۔“

”میں صرف یہ جانتا چاہتی ہوں کہ تم نے ولید کو کیا بتایا ہے۔“

”جو کچھ تم نے مجھے کہا میں نے اس تک پہنچا دیا۔ اب وہ، وہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہے جس سے تم

اسے بلیک میل کر رہی ہو۔“ حسیب نے کہا۔

”میں اتنی بے وقوف ہوں کہ اس کے گھر جا کر اسے سب کچھ بتاؤں گی؟“

”میں اس معاملے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ حسیب سکون سے بولا تو میرے تن بدن میں آگ لگ

گئی۔

”تم اس معاملے سے بے دخل کیسے ہو سکتے ہو۔ آخر یہ سب تمہارا ہی پلان تھا۔“

حسیب نے قہقہہ لگایا تو میرے دماغ کو جھٹکا لگا۔ میری جلد بازی نے حسیب کا معاملہ کس قدر

آسان کر دیا تھا۔ اسے تو سامنے بھی نہیں آنا پڑے گا اور اس کا مقصد بھی اچھی طرح پورا ہو جائے گا۔ اس

کھیل میں سب سے زیادہ فائدے میں تو وہ تھا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے فون بیچ

دیا۔

اب مزید وقت ضائع کرنا میرے لیے نقصان دہ تھا۔ ولید کوئی بھی ہوشیاری دکھا سکتا تھا۔ سب

سے پہلے میں نے کاغذ قلم اٹھایا اور اپنا بیان قلم بند کیا۔ ”میری زندگی خطرے میں ہے میں قانون سے

اپنے تحفظ کی اپیل کرتی ہوں۔“ اسے میں نے دو تین بار پڑھا پھر اپنے دستخط کر دیے۔ اب مجھے راجو کو اعتماد میں لینا تھا۔

”ولید رضا! اگر تم مجھے شرافت سے رقم دے دو گے تو سمجھ لو یہ پرچہ پولیس اسٹیشن جانے سے رک جائے گا۔ وگرنہ۔۔۔ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے ولید رضا کو فون کیا۔



میں مہربانو کے بتائے ہوئے ایڈریس پہ پہنچ گیا۔ اس نے گھر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس نے اپنی شاطر چالیں چلنے کے لیے مہرے تیار کر رکھے ہوں گے۔ میں اسے اعتماد میں لیتے ہوئے وہاں جاؤں گا اور قانون سے مدد لوں گا۔ اس چیز کے لیے میں نے ماریہ کو اور حبیب کو اعتماد میں لیا تھا۔

حبیب نے کہا بھی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلنا چاہتا ہے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ حبیب بے شک میرے بہت قریب تھا لیکن تھا تو میرا ملازم ہی۔ میں مہربانو سے اکیلے ہی نمٹنا چاہتا تھا اور یہی خود اعتمادی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی۔

”بہت دن بعد آپ میرے غریب خانے پہ تشریف لائے ہیں۔ بتائیے کیا خدمت کروں آپ کی۔“ وہ بولی تو میں چپ چاپ اس کی شکل دیکھتا رہا۔

”میرا غریب خانہ پسند تو نہیں آیا ہو گا آپ کو۔“ وہ میرے بالکل نزدیک بیٹھ گئی۔

”تم نے میرے جم سے ایسی کون سی سوغات حاصل کی ہے جس کے عوض تم مجھ سے پچیس لاکھ کی ڈیمانڈ کر رہی ہو؟“ میں رکھائی سے بولا۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے کچھ کھاپی تو لیجیے!“

”میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔“

”میرے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ رقم لے کر آئے ہیں آپ؟“

”ہاں، چیک میری جیب میں پڑا ہوا ہے۔“

”دیری گڈ۔“ اس نے میرا گال چھوا۔ ”میں آپ کی تواضع کے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔ وہ ٹی وی کارٹیوٹ مجھے دے کر اندر غائب ہو گئی۔ میں غور سے اسکرین کی طرف دیکھنے لگا۔

سامنے میرے جم کا اندرونی حال دکھائی دے رہا تھا۔ آدھے گھٹنے کی اس قلم نے میرے خون کو منجمد کر دیا تھا۔ جب وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو میں سر پکڑے بیٹھا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

”کیا مجھے آسانی سے رقم دے دینی چاہیے؟“

”ہرگز نہیں۔“ میرے اندر سے کوئی چلا آیا۔ ”میں اس عورت کی بلیک میلنگ کا حصہ نہیں بنوں گا۔ میں قانون سے مدد لوں گا۔“

”کیا سوچ رہے ہو؟“ وہ اچانک میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔ میں اسی طرح بیٹھا رہا۔ دراصل میں اپنے غصے کو ضبط کر رہا تھا۔ مہربانوں نے میرے بازو پہ ہاتھ رکھا۔

”کافی پی لیجیے۔ اپنے ہاتھ سے بنا کر لائی ہوں۔“ میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی پرسکون اور پُر اعتماد بیٹھی تھی۔ جبکہ میرے اندر اشتعال انتقام کی صورت میں ٹھانٹیں مار رہا تھا۔

”میرا خیال ہے اس کے آگے میری قیمت زیادہ نہیں ہے۔“ وہ کمینگی سے مسکرائی۔ میں جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

”میں تم سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ فی الحال میرے پاس ابھی پیسوں کا بندوبست نہیں ہے۔“

”اور فی الحال میرے پاس بھی وقت نہیں ہے۔“ وہ میرے سامنے آ گئی۔

”تمہیں جلدی کس چیز کی ہے؟“ میں تنک کر بولا۔

”تم جلدی کی بات کرتے ہو اور میں کہتی ہوں دیر مت لگاؤ ولید رضا! اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔“

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی تو میں ضبط نہ کر سکا۔

”تم مجھے بلیک میل نہیں کر سکتیں۔“ میں دھمکی دیتے ہوئے بولا۔

”تم بلیک میل ہو رہے ہو۔“

”کیا کر لو گی تم میرا؟“ میرا اشتعال اور بڑھ گیا۔

”سوچ لو، ابھی بھی وقت ہے تمہارے پاس۔“ وہ غرائی تھی۔

”تم سوچو اور اپنی فکر کرو کہ تمہارے پاس وقت ہے بھی یا نہیں۔“ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ یہ کیا میرا موبائل غائب تھا۔ وہ میرے بہت نزدیک دو بار بیٹھی تھی اور تب اس نے کام دکھا دیا تھا۔

”میرا فون کہاں ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ وہ ہنوز مسکرا رہی تھی۔ میں خوں خوار انداز میں اس کی طرف پڑھا اور اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ ابھی تو میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔

دیکھتے دیکھتے اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، اپنے بالوں کو بکھیر ڈالا۔ مجھے اس کے اس ڈرامے سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں تھا لیکن فرق پڑتا تو اس بات سے کہ میں اس کے گھر میں کھڑا تھا۔ ابھی میں شش و پنج میں ہی تھا کہ دوسرا دروازہ زور سے کھلا اور پولیس کے کئی اہلکار اندر داخل ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرابھر گیا۔ مہربانوں رو رو کر دہائیاں دے رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کی تسلی کے لیے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

کھلی حقیقت میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

پولیس اہلکاروں نے مجھے گھیر لیا اور وہ میری تلاشی لینے لگے۔ میں اپنی جگہ منجمد کھڑا تھا۔

”سریرہ یو الور ملا ہے۔“

”مزید تلاشی لو۔“

”یہ سراسر ایہ رومال ملا ہے۔“

”اس میں سے تو بو آ رہی ہے۔“

”لگتا ہے بے ہوشی کی دوا لگی ہے اس میں۔“

میں بھٹی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لیکن میری زبان جیسے سل گئی تھی۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ رومال میرا نہیں ہے۔ لیکن میں بول نہیں سکا۔

”باہر لے چلو اسے۔“ بڑے افسر نے حکم دیا تو دوسرے افسروں نے مجھے باہر کی طرف دھکیلا۔

مہربانو مجرم ہوتے ہوئے بھی قانون کا دھڑلے سے سہارا لے گی۔ مجھے نہ تو اندازہ تھا اور نہ ہی یقین۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ خود مجھ سے تاوان مانگ رہی ہے وہ پولیس کو بیچ میں ہرگز نہیں لائے گی۔

لیکن یہ کیا، سب ہی کچھ میری سوچ کے عین منافی ہو گیا۔ میں ولید رضا کمال جس نے زندگی میں کبھی چوٹ نہیں کھائی تھی۔ یہ آج میرے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔

اس کی بیوی سامنے کھڑی رو رہی تھی اور اس کا دوست اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ وہاں اس کے اور بھی دوست کھڑے تھے جو بظاہر تو بہت ہمدرد دکھائی دیتے تھے لیکن اس کے دوست اس کی خوب صورتی اور اس کے اسٹینس سے حسد محسوس کرتے تھے۔ جو آج ملیا میٹ ہو گیا تھا اور حبیب جس نے شطرنج کی ساری بساط بچھائی تھی۔ کس طرح اسے تسلیاں دے رہا تھا کہ جلد از جلد اس کی ضمانت کرا لے گا۔ مجھے دل ہی دل میں ہنسی آ رہی تھی۔

ولید رضا کے صحیح معنوں میں رنگ تب اڑے تھے جب اس نے میرا بیان پڑھا تھا۔

یہ تو سیدھا سیدھا حدود آؤڈینس کا ٹیکس تھا اور اس کی آخری سراسزائے موت سے کم نہیں تھی۔ لیکن اس کی سزائے موت سے مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ زندگی ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے اور ظاہر ہے ولید رضا کو بھی ہوگی۔ وہ اب صورت حال کی سنگینی سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا لہذا ضرور مجھ سے مفاہمت کی بات کرے گا اور میں کیس بھی واپس لوں گی۔

میں نے یہ بات صرف حبیب سے کی تھی تاکہ وہ ولید تک میرے خیال پہنچا دے۔ لیکن اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے ضرورت سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش میں تم نے سونے کی چڑیا اڑا دی ہے۔“

یہ کیس صرف تمہاری ذات سے وابستہ نہیں تھا جو کیس واپس لے لوگی اور قانون خاموش ہو جائے گا۔ یہ معاملہ ایک ادارے سے وابستہ ہے۔ اس میں معصوم اور انجان خواتین کی حرمت کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔ یہ معاملہ بہت دور تک جائے گا۔ ممکن ہے قانون تمہیں بھی شکنجے میں لے لے۔“

حبیب نے جیسے میری آنکھیں کھول دیں۔

”تمہارے وکیل نے مجھے بتایا ہے کہ مہربانو نے اخبارات میں بہت ہی بے ہودہ بیانات دیے ہیں۔ اگر اخبارات نے اس معاملے کو کورنگ دی تو تمہارا کیس بہت پیچیدہ ہو جائے گا۔ کسی طرح بھی ہو اسے اس کو اس سے روکنا ہوگا۔“ میں نے حبیب کی بات سننے کے بعد فکر مندی سے کہا۔ ”لیکن میں یہ

سوچ رہا ہوں کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ ابھی ہم ایک معاملے سے نمٹتے نہیں اور وہ دوسرا کھول لیتی ہے۔“

”تم اس معاملے میں وکیل سے مشورہ کرو کہ ہمارے لیے بہتر کیا ہے۔“ میں نے الجھتے ہوئے سر پکڑ لیا تھا۔

”بہت سی فلاحی این جی اوز ایسی ہیں۔ جن کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ ہے۔ اگر ان کی دلچسپی اس معاملے میں پڑ گئی تو معاملہ اور خراب ہو جائے گا اور یہ تنظیمیں ایسے معاملات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتی ہیں۔ حقوق نسواں کے علم بردار دراصل ملک دشمن عناصر ہیں۔ اس لیے یک طرفہ صورت حال کے بجائے ہمیں بھی اپنا موقف سامنے لانا ہوگا۔ تمہارے وکیل نے یہی مشورہ دیا ہے۔“ اس طرح جو بدنامی ہوگی وہ تو سب میرے حصے میں آئے گی۔ مہربانو کا تو کچھ نہیں جائے گا۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

تو حسیب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ایسی عورتوں کا کچھ جاتا بھی نہیں۔ جاتا انہی کا ہے جن کی عزت ہوتی ہے۔ تمہاری اگر ضمانت ہو جائے گی تو ہماری آدھی تکلیف دور ہو جائے گی۔“

”میں ایک دفعہ باہر آ جاؤں اس کی ساری اصلیت قانون کے سامنے پیش کر دوں گا۔ اسے سلاخوں کے پیچھے نہ لوادیا ہو تو میرا نام بھی۔۔۔“ میں نے غصے میں ہاتھ پہ مکا مارا۔

”فکر نہیں کرو، ہم بھی اسی کوشش میں ہیں۔ اسے ہم کیفر کردار تک ضرور پہنچائیں گے۔“

”اس نے میرا سارا کیریئر داؤ پر لگا دیا ہے۔ وہ مجھ سے بچ نہیں سکتی۔“ میں نے دبے دبے انداز میں کہا۔

”ماریہ اور بچے تو ٹھیک ہیں۔“ مجھے ایک دم ماریہ اور بچوں کا خیال آیا۔

”ماریہ بھابھی بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی گئی ہیں۔“ حسیب نے اطلاع فراہم کی۔

ایک دم مجھے خالی پن نے آ گھیرا۔ ماریہ کا کوئی بھی بھائی ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اور میرے اتنے سارے دوست وہ سب کہاں گئے؟ جو ہمہ وقت میرے ارد گرد ہوتے تھے اور جن کے پیچھے میں نے اپنی ساری زندگی ضائع کر دی۔

میں نے حسیب کی طرف دیکھا۔ تشکر و فکر میری آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔

”میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ فقط تم ہی میرے کام آ رہے ہو۔“ حسیب دھیرے سے مسکرا دیا۔

”چلتا ہوں۔ صبح ملاقات کے لیے آؤں گا۔“

”سنو۔ میرے اندر ایک معصوم سا بچہ ٹپ رہا تھا۔ جسے اپنے ماں باپ یاد آنے لگے تھے۔ حسیب نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

”اسید بھائی کو فون کر کے سارے معاملے سے آگاہ کر دینا۔ ان سے کہنا ولید بہت اکیلا ہے۔ وہ آپ سب کو یاد کر رہا ہے۔“ میں نے غم ہوئی آنکھوں کو جھکا لیا تھا۔

ماں باپ کے بعد اسید بھائی ہی تو ہمارا سب کچھ تھے۔ مگر میں نے ہی رشتوں کی قدر نہ جانی تھی۔



”اب تو تم میری بیٹی کو دے دو۔ تمہیں اب ساری حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ تمہاری خاطر میں نے کتنا کچھ کیا ہے۔ مجھے ولید سے جو کچھ بھی ملتا میں تمہیں ہی دیتی۔ پلیز بتا دو میری بیٹی کہاں ہے؟“
راجو سکون سے کان صاف کرتا رہا۔

”لگتا ہے کچھ عرصہ میں تم بہت بڑی لیڈر بن جاؤ گی۔ آئے دن اخبارات میں تمہارے بیانات دیکھنے اور پڑھنے سے قابل ہوتے ہیں۔ کیا اخبارات والے بھی تمہیں کچھ دے رہے ہیں یا۔۔۔“
”بیانات صرف اپنے تحفظ کے لیے دے رہی ہوں۔“

”شہرت بھی تو خوب مل رہی ہے تمہیں۔“ وہ طنزیہ بولا۔
”میں تم سے بلیک میل نہیں ہوؤں گی راجو!“

”اور میں بھی تم سے بلیک میل نہیں ہو سکتا۔ مجھے ولید مت سمجھنا کہ چار مسٹڈے پولیس اہلکار کو ہلا کر مجھے گرفتار کرادو گی۔“

”میں ایسا کیوں کروں گی؟“ میں منتوں پہ اتر آئی۔

”تمہیں بتا ہے، پارسا میرا سب کچھ ہے۔ میں پارسا کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن کچھ بھی نہیں کر سکی۔ تم اس کا بوجھ کہاں سنبھالو گے۔ تم تو خود بال بچے دار انسان ہو۔ میری بیٹی کو مجھے دے دو۔“
”پارسا تو بہت پیاری بچی تھی۔ وہ بوجھ کہاں تھی۔“ بہت دیر کے بعد وہ بولا۔
”تو میری سوئی صرف ایک لفظ پہ انک گئی۔“
”تھی۔۔۔“

”تھی سے کیا مراد ہے تمہاری؟ کہاں ہے میری بچی۔ بولو، جواب دو۔ میری بیٹی کہاں ہے۔ کیا تم نے اسے مار ڈالا۔“ میں لرز گئی۔

”چہ، چہ، چہ، معصوم بچوں کو مار نہیں جاتا۔“ راجو نے مجھے چکارتے ہوئے بٹھادیا۔
”اسے تو میں نے بہت ہی محفوظ ہاتھوں میں بیچ دیا ہے۔ پورے پانچ لاکھ کی گئی ہے وہ۔ بالکل نقد۔“ میرے ارد گرد دھماکے ہونے لگے۔ میں نے وحشت سے راجو کی طرف دیکھا۔
”وہ تمہاری بیٹی جیسی تھی راجو۔“ میری زبان لڑکھڑاہی تھی۔
”لیکن بیٹی تو تمہیں تھی۔“ وہ خباثت سے ہنسا۔

”میں نے تو تمہارا بوجھ ہی ہلکا کیا ہے۔ آئے دن تمہیں اس کے لیے کسی نہ کسی تکلیف سے دوچار ہونا پڑتا تھا اب تم کھل کر جی سکوگی۔ اور جو ایڈوکیٹ تمہارے ہاتھ لگا ہے۔ اس سے تو تم کہیں کی کہیں بچتی جاؤ گی۔“ یہ کہہ کر وہ بے ہتکم انداز میں ہنسا اور میرے وجود میں جیسے بھا بھڑ جلنے لگے۔
”پارسا میری بیٹی۔“ میں بری طرح چیخ رہی تھی۔
”سب کچھ، سب ہی کچھ تو ختم ہو گیا تھا۔“

”نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ میں راجو کی طرف بڑھی۔ میں اسے مارنا چاہتی تھی۔ لیکن میرے

قدم بے جان ہو رہے تھے۔ میں زمین پہ اوندھے منہ گر پڑی۔ میرے منہ سے خون آ رہا تھا۔ لفظ حلق میں ہی دم توڑ رہے تھے۔ وجود بے جان ہو رہا تھا۔ میں نے پھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا راجو میری حالت پہ ہنستے ہوئے میرے گھر سے نکل رہا تھا۔

جیل کے تاریک دن اور اذیت ناک راتیں۔۔۔ میری زندگی جن عذابوں سے گزر رہی تھی، وہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ ضمیر کے کوڑے تھے جو مجھے ایک پل چین نہ لینے دیتے تھے۔ ماں جی، بابا، ماریہ، بچے مجھے یاد آتے تھے تو میرے آنسو نہیں رک پاتے تھے۔ میں اللہ تعالیٰ کا مجرم تو تھا ہی، ان سب کا بھی مجرم تھا۔

حسب کی کمینگی بھی مجھ پر ٹھل چکی تھی۔ ماریہ نے مجھے بتایا تھا کہ حسب اس سارے کھیل میں برابر کا شریک تھا۔ اسی نے مہربانو کو یہ راہ بھائی تھی۔ یہ جان کر مجھے شدید دھچکا لگا تھا۔

اسید بھائی میری ضمانت کے لیے دن رات کوششیں کر رہے تھے۔ پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ میرا جما جایا کاروبار تو بالکل ختم ہی ہو چکا تھا۔ چاروں طرف مجھے اندھیرا ہی نظر آ رہا تھا۔

اور اس دن تو میری مایوسی کی انتہا نہ رہی جب وکیل نے مجھے بتایا کہ میری ضمانت ممکن نہیں ہے کیونکہ کیس اخبارات میں شائع ہونے کی وجہ سے عوام کا شدید دباؤ ہے کہ مجرم کو کسی صورت رہا نہ کیا جائے۔

اس رات پہلی بار میں اللہ تعالیٰ کے حضور گڑ گڑایا تھا۔ رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی اور آئندہ کے لیے توبہ کی تھی۔

اور ندامت کے یہ آنسو بارگاہ الہی میں مستجاب ہوئے تھے۔ دوسری صبح عدالت میں پیشی پر میری ضمانت ہو گئی۔ ایک سال بعد میں جیل کی سلاخوں سے نکل کر باہر کی دنیا میں آیا تھا۔

زندگی اب اتنی آسان نہیں تھی، کاروبار دوبارہ شروع کرنا اور جمانا بہت مشکل تھا۔ ماریہ بچوں کی خاطر گھر لوٹ آئی تھی لیکن وہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اک جامد چپ کے ساتھ وہ سارے فرائض تو انجام دیتی تھی مگر۔۔۔ ندامت سے میری نظریں نہیں اٹھتی تھیں۔ ہمارے درمیان جیسے ایک گہری خلیج حائل ہو گئی تھی۔

جن راستوں کا انتخاب میں نے کیا تھا، یہ اس کا نتیجہ تھا جو مجھے نہ جانے کب تک بھگتنا تھا۔



چاند نے بادل اوڑھ لیا



مجھے معلوم تھا، جاشیہ سلطان میرے ساتھ ایک دن ایسا ضرور کرے گی۔ یعنی وہ مجھے بغیر بتائے جا ب چھوڑ کر چلی جائے گی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں نے اسے رکھ لیا تھا۔ اس بد تمیز اور نا اہل لڑکی کو۔ جسے وقت کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ مجھے اس پر انتہائی غصہ تھا۔ اس کی دود جوہ تھیں، ایک تو وہ بنا بتائے چلی گئی تھی۔ دوسری تنخواہ بھی زیادہ لے گئی، ایڈوائس لینا تو جیسے اس کا مشغلہ تھا۔ اگر اس نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو اس کی انتڑیوں سے رزم وصول کر لوں گا۔ جب وہ ایک پائی بھی میری طرف نہیں چھوڑتی۔ تو میں کون سا حاتم کا پوتا تھا۔

میں اس کا نمبر ملا ملا کر تنگ آ گیا تھا۔ لیکن وہاں کوئی فون ریسیو ہی نہیں کرتا تھا۔ یہ لڑکی اچانک یوں ہی مجھے پریشان کر دیتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کا اتنا عادی کیوں ہو گیا ہوں یعنی اس کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

ادھر یوسف کمال، ماہنامہ زینت کا ایڈیٹر مجھ سے مسلسل کہانی کا تقاضا کیے جا رہا تھا نئے سال کے لیے۔ وہ چاہتا تھا کہ میری کہانی زینت میں خاص تحریر کے طور پر شائع ہو۔ وہ ایسی کون سی خاص تحریر تھی، جسے میں زیر قلم لا کر اپنے قارئین کے دلوں میں مزید محبتوں کی جگہ پاتا۔ ایسا اچھوتا موضوع کہاں سے لاتا جو تہلکہ مچا دیتا۔

گزشتہ گیارہ سال سے لکھتے ہوئے مجھے کبھی اتنا خلجان نہیں ہوا تھا جتنا اب ہو رہا تھا۔ مسلسل لکھ لکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں ایک جیسا لکھ رہا ہوں۔ اس کے باوجود لوگ مجھے پسند کر رہے تھے۔ میں جانتا ہوں اس کی سب سے بڑی وجہ میری کہانیوں کا رومان پرور ماحول تھا۔ جس میں قاری خود کو مکمل طور پر گم کر دیتا تھا اور ایک ذہنی سکون حاصل کرتا تھا۔

محبت ہر شخص کی ضرورت ہے اور ہر دور میں نئے انداز سے ہوتی ہے، لیکن بہر حال میں نے کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں کی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ میری کم ہمتی تھی۔ بنیادی طور پہ میں ایک بزدل اور وہی شخص ہوں۔ میں نے کسی لڑکی سے باضابطہ محبت نہیں کی، کالج کے زمانے میں مجھے بہت سی لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔ میں چپکے چپکے انہیں دیکھا کرتا اور پھر اکیلے میں بیٹھ کر ان کے بارے میں سوچتا اور پھر گھنٹوں سوچتا رہتا۔

لطیف کی بات یہ تھی کہ میری کم گوئی اور الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے اکثر لڑکیاں مجھ پہ بے پناہ اعتماد کرتی تھیں اور اکثر اپنے چاہنے والوں کے قصے، خاص کر ان کی بے وفائیاں آکر مجھے سنایا کرتیں اور پھر ہلکی ہو جاتیں۔ میں ان سب لڑکیوں کے لیے سفارت خانے کی ایک کتاب کی مانند تھا۔ جس میں سفیر آتے اور اپنے تاثرات قلم بند کرتے اور حلے جاتے۔

کبھی کسی سفیر نے پلٹ کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ کتاب محبت کی کہانیوں سے لبریز ہو گئی ہے۔

میں ہر اس لڑکی سے محبت کرنے لگتا تھا، جو اپنا حال دل مجھ سے بیان کر کے جا چکی ہوتی۔ لیکن میں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں واقعی بزدل شخص تھا۔ جو بڑھتے ہوئے بھی ڈرتا تھا اور دوسرے کو بڑھتا دیکھ کر بھی۔

میری محبت کی حد صرف یہ تھی کہ میں ان رنگ برنگی تیلیوں کے خیالوں میں رہتا۔ رات کو سوتا تو ان سے ہم کلام ہوتا۔ حال دل بیان کرتا اور پھر اس طرح ہماری بے شمار ملاقاتیں ہو جایا کرتیں۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں اپنے محبوب کے ساتھ دنیا جہاں گھوم آتا۔ مجھے اس کھیل میں بہت مزا آتا تھا۔

وہ لڑکیاں جو مجھے کالج میں گھاس نہیں ڈالتی تھیں اور جو مجھے اپنی نخوت، تکبر اور سب سے بڑھ کر حسن کی وجہ سے اچھی لگتی تھیں میرا خیالوں میں زیادہ وقت ان ہی کے ساتھ گزرتا۔ میری ایک کلاس فیلو بھی یہاں۔ بے پناہ ذہن، حاضر جواب اور ملکوتی حسن کی مالک۔ بڑے بڑے پھٹنے خاں اس کے سامنے دم دبا کر چلتے تھے۔ لیکن بتائیں کیا وجہ تھی اچانک یہاں کی توجہ مجھ پہ ہوئی تو ایسی ہوئی کہ وہ ہمہ وقت میرے ساتھ نظر آنے لگی۔

میں اس کی رفاقت میں اپنے آپ کو بہت دبا دبا محسوس کرتا حالانکہ یہاں کا رویہ میرے ساتھ بہت مخلص اور دوستانہ تھا۔ لیکن مجھے ان لڑکوں سے ڈر لگتا تھا جو یہاں کے پرستار تھے اور جو ہمیں ساتھ دیکھ کر حسد کا برملا اظہار کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا یہاں کو خاطر خواہ ان باتوں سے دلچسپی نہیں تھی جبکہ میری راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔

میں یہاں سے کترایا کترایا رہنے لگا۔ میں جتنا اس سے دور بھاگتا تھا، وہ میرے اتنے ہی قریب آتی تھی مجھے اس کی قربت سے وحشت ہونے لگی۔ یہ میرے اندر کا احساس کمتری اور بزدلی تھی وگرنہ ہمارے مابین واضح طور پر کسی نے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کالج کا آخری سال تھا، تب یہاں نے مجھے اپنے والد صاحب سے ملوایا۔

نہ جانے اس نے میرے متعلق کیا کہا تھا کہ وہ بڑے پرتپاک انداز میں مجھ سے ملے۔ وہ میرے مستقبل کے بارے میں مجھ سے بات چیت کر رہے تھے۔ میری ذات کے متعلق پوچھا اور بھی بہت ساری باتیں۔ میں بڑے لڑکھڑائے سے انداز میں انہیں جواب دے رہا تھا ایک توجہ یہ تھی کہ میں اس قسم کے تجربے سے پہلی بار گزر رہا تھا۔ اور دوسری وجہ اس کے باپ کا عالی شان گھر، قیمتی گاڑی، پرسنالٹی اور گفتگو کا انداز۔ میرا متاثر ہونا فطری تھا۔

انہوں نے مجھ سے بہت ساری باتیں کیں اور مجھے موقع دیا کہ میں بولوں، میں بولا ضرور تھا لیکن بڑا واجبی سا۔

میری اس ہچکچاہٹ کو وہ کیا معنی دیتے، میں نے ان کا یہ تذبذب بھی محسوس کر لیا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے ان کے گھر میں سخت گھٹن محسوس ہو رہی تھی حالانکہ سردیوں کا موسم تھا اور وہ ایک خوب صورت شام تھی لیکن پھر بھی میں یہ چاہتا تھا جلد از جلد اس امیر آدمی کے چنگل سے آزاد ہو جاؤں۔ ہمارے درمیان بہت دیر تک گفتگو ہوئی رہی۔

یہاں ہمارے درمیان موجود نہیں تھی۔ لیکن اس گفتگو کا کوئی حاصل نہیں تھا کیونکہ وہ بات کرنے کے لیے سوال پر سوال کر رہے تھے اور میں صرف جواب دے رہا تھا۔

مجھے یاد ہے انہوں نے آخری سوال مجھ سے یہ کیا تھا۔

”کیا تم یہاں کو پسند کرتے ہو؟“

”جی ہاں۔“

”اس کا مطلب ہے اسے اپنا نا چاہتے ہو۔“

”جی نہیں۔“ میں نے گھبراتے ہوئے فوراً انکار کر دیا۔

مجھے یہ خوف تھا، یہ امیر آدمی مجھے بری طرح لعن طعن کر دے گا اور انکار کر کے گھر سے نکال دے گا۔ سو میں نے پہلے ہی انکار کر دیا۔ شاید اس وقت مجھے اپنی عزت نفس زیادہ عزیز تھی۔ اس شخص نے میرا چہرہ دیکھا پھر سوچ کر بولے۔

”اب تم جاسکتے ہو۔“

میں تو پہلے ہی یہاں سے نکل کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ان کے کہنے کی دیر تھی اور میں ایسے نکلا کہ اگر پیچھے مڑ کر بھی دیکھا تو پتھر کا ہو جاؤں گا۔

گھر آ کر میں یہی سوچتا رہا کہ میں نے ایسا کیوں کیا، اگر مجھے ایسا ہی کرنا تھا تو میں یہاں کے ساتھ گیا ہی کیوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن یہ کیسی کمزوری محبت تھی جس کا

اظہار میرے لیے ناممکن تھا۔

میں اپنے آپ کو بہت دیر تک لعن طعن کرتا رہا اور اس طرح کئی دن گزر گئے۔ لیکن یہاں کا خیال میرے دل سے نہیں نکلا بلکہ وہ مزید حواسوں پہ چھاتی گئی۔

میں چاہتا تو اس سے مل سکتا تھا۔ لیکن وہی بات۔ قبل از وقت اپنی ہتک کا احساس اور کمزور قوت ارادی کی بدولت میں یہ قدم بھی نہیں اٹھا سکا۔ وہ یونیورسٹی کا آخری دن تھا۔

تب مجھے اپنے کلاس فیلو سے معلوم ہوا کہ یہاں احمد نے ایک معذور شخص سے شادی کر لی ہے۔ یہ میرے لیے بم کا دھماکا تھا۔ میں لرز کر رہ گیا کلاس فیلوز کے درمیان چہ گوئیاں ہو رہی تھیں۔

لڑکے لڑکیاں طرح طرح کی باتیں بنا رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا جس سے یہاں نے شادی کی ہے وہ دونوں ناگوں سے مفلوج ہے۔ شکل بھی واجبی سی ہے۔

مگر اس نے ایسا کیوں کیا۔ شاید وہ جس سے محبت کرتی تھی۔ اس کی بے وفائی سے دلبرداشتہ ہو کر اس نے یہ قدم اٹھایا ہے۔

طرح طرح کی باتیں سن کر میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔

اور میں بارہا اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا کیا میں نے واقعی یہاں سے بے وفائی کی ہے۔ میں نے تو کبھی اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ پھر بے وفائی کیسی۔ پھر سنا تو یہاں احمد اپنے اچانچ شوہر کے ساتھ

بے حد خوش ہے یقیناً وہ کوئی امیر ترین آدمی ہوگا۔ میں نے خود کو مطمئن کرنا چاہا لیکن بہر حال مجھے یہاں سے ملنے کا جتنس بہت تھا۔

حیرت کی بات تھی اس تجسس کے پیچھے میں اس کے گھر تک چلا گیا۔

وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئی اور مسکرا کر بولی۔

”شادی کی مبارک باد دینے آئے ہو۔ یا شکایت کرنے کہ میں نے تمہیں اپنی شادی میں کیوں نہیں بلایا؟“

میں اس کی بات سے گھبرا گیا۔

”میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ قہقہہ مار کر طنز یہ بنی۔

”ہم اتنا عرصہ ساتھ رہے۔ تم، آپ سے تم یہ نہیں آسکے۔ آج اتنا ذالی سوال عجیب سا لگ رہا

ہے۔“

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ میں اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔

”میں نے تو تم سے نہیں پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ مجھ سے زیادہ تیزی سے بولی۔

میں خاموش ہو گیا۔ پھر توقف سے بولا۔

”مگر تم کسی سے بھی شادی کر سکتی تھیں۔ میرے جیسے ادھورا شخص تمہیں کیا خوشیاں دے سکتا تھا۔

میں تو صرف اس لیے آگئے نہیں بڑھا تھا۔“

میرے جواز پہ وہ لٹی سے ہنس پڑی۔

”جو شخص بظاہر ادھورا نظر آتا ہے۔ وہ مجھے بے پناہ خوش رکھ سکتا ہے۔ حالانکہ اس کا کمپلیکس تو

سب پہ واضح ہے اور اس کی شخصیت کے ساتھ رہتا ہے کیا تم باہر سے بھی زیادہ معذور تھے۔“ میں پھر لا جواب ہو گیا۔

”اسید صاحب۔ انسان میں اعتماد اور حوصلہ ہو تو اس کی ذات کا ادھورا پن کبھی آگے نہیں آتا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں ایسے شخص کے ساتھ مطمئن زندگی گزار رہی ہوں۔ جو ادھورا ہو کر بھی مجھے مکمل محبت اور تحفظ سے نوازا رہا ہے۔“

نہ جانے اس نے مجھ سے کتنی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔

اگر میں یہ احساس اپنے اندر جگا لیتا۔ تو وہ آج اپنے آپ سے یوں انتقام نہ لے رہی ہوتی۔ میں یہاں سے معافی مانگنے کے لیے بہت ساری لفظ استعمال کرنا چاہتا تھا، لیکن ہر لفظ اس کی دل نشنی کے آگے حقیر تھا۔ میں ندامت و شرمندگی کے ساتھ ساتھ ضمیر کے بوجھ تلے بھی دب گیا۔ میرے پاس اسے مطمئن کرنے یا اپنی صفائی کے لیے کوئی لفظ نہیں تھا۔

میں گھر چلا آیا۔

بے چین، مضطرب۔ اور پھر بہت سارے دن گزر گئے۔

اور تب میں نے اپنے احساسات کو قلم بند کیا۔

ایسا بہت کچھ جو میں یہاں سے کہنا چاہتا تھا۔ میں لکھتا چلا گیا۔

لکھنے کے بعد مجھے یک گونہ سکون کا احساس ہوا اور پھر میں روز ایسا ہی کرتا۔ مجھے نہیں معلوم کس طرح میری وہ تحریر جامع کہانی کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کہانی کا انجام اتنا تکلیف دہ تھا کہ میں نے کئی بار اس کہانی کا انجام لکھا، اس طرح جیسے کوئی اپنے آپ کو بار بار پھانسی دے رہا ہو۔ سرد، جو میرا بچپن کا دوست تھا اکثر دیکھا کرتا تھا۔ میں فارغ وقت میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔

اسے شک تھا کہ شاید میں شاعری کرتا ہوں کیونکہ مجھے شاعری سے بے حد شغف تھا۔ اور میں اکثر مشاعروں میں جاتا رہتا تھا۔

ایک روز اس کے ہاتھ میرا کاغذوں کا پلندہ لگ گیا وہ میری نثری تحریروں پڑھ کر دنگ رہ گیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے اپنی تحریروں چھپوانی چاہیے۔ میں نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں تھا۔ یہ تو میرا کھار س تھا۔ لیکن وہ بھند تھا کہ وہ چھپوا کر رہے گا۔ میری بزدلی یہاں بھی سر اٹھائے کھڑی تھی۔ لیکن سرد کی ہٹ دھرمی تھی کہ وہ مجھ سے پلندہ چھین کر لے گیا۔

اس کے بچا، یوسف کمال ماہنامہ زینت کے مدیر اعلیٰ اور ہفت روزہ نوائے گردش کے ایڈیٹر تھے۔ اس نے وہ کاغذ کا پلندہ انہیں جاتھمایا۔ انہوں نے وہ تحریر اپنے پاس رکھ لی۔ کچھ عرصہ کے بعد سرد زینت کا پرچہ لے کر آیا۔ میری پہلی تحریر اس میں شائع ہوئی تھی۔

مجھے اپنی کامیابی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن مجھ سے کہیں زیادہ خوش سرد تھا۔ مجھے اپنی تحریر کے شائع ہونے کی سب سے زیادہ خوشی یہ تھی کہ جب یہاں یہ تحریر پڑھے گی تو اس کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے گا اور پھر۔۔۔ میں نے اسی پس منظر میں کتنی بہت ساری کہانیاں لکھ ڈالیں۔

صرف یہی پلاٹ تھا۔ لیکن مختلف طریقوں سے میں نے اس پہ بے شمار کہانیاں لکھ ڈالیں۔ اور وہ

سب لوگوں نے بہت پسند کیں۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ مجھے دوسرے رسالوں کی طرف سے بھی آفرز آنے لگیں۔ میں انگلش میں ایم اے کر چکا تھا۔ اور انگلش لٹریچر سے مجھے خاص لگاؤ تھا۔ انگریزی ناول اکثر میرے زیر مطالعہ رہتے تھے انگلش می ایسی بہت سی تحریریں جنہیں میں پاتا تھا لوگ پڑھیں میں نے ان تحریروں کو اردو میں ترجمہ و تلخیص کے ساتھ نقل کیا۔ وہ چھپنے لگیں۔ جو تین رسائل اور تھے جن میں، میں کبھی کبھار لکھ لیا کرتا لیکن جب سے میں نے ”سرشت“ میں قسط وار کہانی لکھنا شروع کی تھی تب سے مجھے ایک مددگار کی ضرورت پڑ گئی تھی۔

جاشیہ سلطان سے پہلے میرے ساتھ ایک لڑکی بھی کام کر چکی تھی جس کا نام ناز تھا۔ جو میری تحریروں کی بذات خود دلدادہ اور شوقین تھی۔ میں جس طرح بولتا تھا وہ فرفر لکھتی جاتی تھی۔ کبھی اس نے کوئی نقطہ اعتراض نہیں اٹھایا۔ کبھی میرے جملوں پر تنقید نہیں کی۔ نہ ہی اسے فالتو بولنے کی عادت تھی اور نہ فالتو کھانے کی۔

جبکہ جاشیہ میں یہ دونوں خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس کے باوجود میں یہ کہوں گا جاشیہ، ناز سے زیادہ ذہین اور زیرک تھی، میں یہ تعریف اس کے منہ پہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی کبھی کروں گا مجھے معلوم ہے جیسے ہی میں نے اسے توصیفی جملوں سے نوازا وہ کھٹ سے بخواہ بڑھانے کا مطالبہ کر دے گی۔ اس کی سب سے بری عادت یہی تھی کہ وہ بات بے بات پیسے بڑھواتی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس کی ایسی کون سی ضروریات تھیں جو اسے ایسا کرنے پہ مجبور کرتی تھیں شاید اس کی سترہ سہیلیاں۔ جنہیں بھگتنا ناوہ اپنا شرعی حق سمجھتی تھی، میں سمجھتا ہوں انسان کو حقوق و فرائض میں اتنا آگے بھی نہیں نکلنا چاہیے۔ وہ اپنی سہیلیوں کو اپنا قیمتی اثاثہ سمجھتی تھی اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ نوکری بھی اسی بات کا نتیجہ ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کسی ایسی تحریر کی جسے میں لکھ کر اپنی شہرت و محبت میں مزید اضافہ کر سکوں۔ میں کسی نئے کردار اور پلاٹ کی تلاش میں تھا۔ اب کی بار مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ غلبان کچھ نہ کچھ کر کے چھوڑے گا کیونکہ اب مجھے اپنی کہانیوں کا رومان خود بھی گھسا پٹا لگ رہا تھا غصہ تھا تو صرف اس وقت جاشیہ پہ۔ بلاشبہ وہ اس مسئلہ کا حل بخوبی نکال سکتی تھی۔ اب وہ نہیں تھی۔ تو میں سخت پریشان تھا اور اس کو کوس رہا تھا جب میں نے اسے ایک ذہین ترین خاتون سمجھ کر اس پہ انکھار کرنا شروع کر دیا تھا۔

ناز کے چلے جانے کے بعد میں نے جب اخبار میں اشتہار دیا تو پہلی امید وار یہی محترمہ آئی تھیں۔ ”یقیناً آپ نے اشتہار تو پڑھ لیا ہوگا۔“ میں نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

”جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ اشتہار پڑھا ہے تو یہاں تک آئی ہوں۔ آپ کو ایک عدد دشتہ اردو جاننے اور لکھنے والے کی ضرورت ہے۔ جو مہارت سے آپ کے بولے ہوئے لفظوں کو قلم بند کرتا رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لکھا کی خوب صورت اور اسپنڈا اچھی ہو۔ روزانہ چار گھنٹے ماہانہ بخواہ دو ہزار۔“

اس نے فرفر اشتہار سنایا

”آپ کی تعلیمی قابلیت کیا ہے؟“ میں نے پہلا سوال کیا۔

”آپ کے اشتہار میں تعلیمی قابلیت کی ڈیمانڈ نہیں تھی، میٹرک یا ایف اے کے امیدوار بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ شرط صرف املا اور لکھائی کا درست ہونا ہے۔ بہر حال میں نے حال ہی میں ماشاء اللہ بی اے کا امتحان دیا ہے اور ابھی رزلٹ نہیں آیا ہے۔

میں بہت زیادہ ذہین تو نہیں ہوں۔ لیکن میرے لکھنے کی رفتار ہمیشہ ایسی رہی کہ کبھی بھی کسی ایگزامینر نے مجھ سے پرچ نہیں چھینا۔ میں پانچ دس منٹ پہلے ہی پرچہ دے کر اٹھ جاتی تھی۔ آپ چاہیں تو میرا ٹیسٹ لے سکتے ہیں۔ یقیناً آپ مایوس نہیں ہوں گے۔ بے شک یہ میری پہلی نوکری ہے اس سے پہلے میں بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتی تھی۔

لیکن بچوں کے والدین انتہائی کنجوس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں وہ صرف بچے پیدا کرنے میں فراخ دل ہو سکتے ہیں۔ باقی معاملات میں انتہائی محتاط اور کنجوس اور دورانہ لیش۔“

(لاحول ولا) میں نے دل ہی دل میں استغفار پڑھی۔

”میں ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے والدین بخوبی میرا خرچ برداشت کر سکتے ہیں لیکن اضافی خرچ برداشت کرنے کی ان میں ہمت نہیں۔ اس لیے مجھے ادھر ادھر دیکھنا پڑتا ہے آپ کا کام معقول لگا تو چلی آئی لیکن آج کل دو ہزار میں ہوتا ہی کیا ہے مگر نہ ہونے سے بہت بہتر ہے۔ پھر ہر کام میں ترقی کے چانسز بھی تو ہوتے ہیں۔“

(سبحان اللہ نوکری ملی نہیں، تنخواہ کے بڑھنے پہ نظر ہے)

وہ خاموش ہوئی تو اسے میری خاموشی کا احساس ہوا۔

”آپ بولتی بہت زیادہ ہیں۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”بولنا عورت کی پیدائشی مجبوری ہے لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ جب میں مصروف ہو جاتی ہوں تو میری توجہ صرف کام کی طرف ہوتی ہے پھر میں بولتی نہیں۔“

یہ بات تو مجھے بعد میں پتا چلی کہ اسے چاہے کتنا ہی مصروف کر لیا جائے اس کی زبان بند نہیں ہوتی۔

”ٹھیک ہے آپ ٹیسٹ دے دیں۔“

اس کے بعد میں نے اس سے چند پیرا گراف لکھوائے اس نے بہت تیزی سے لکھا۔ اس کی لکھائی واقعی خوب صورت تھی بلکہ مجھ سے بھی کہیں زیادہ۔

”مجھے آپ کی جاب پکی ہے۔ کل سے آپ کو آنا ہوگا، لیکن میرے کام کی ایک شرط ہے کہ آپ چھٹی نہیں کریں گی۔ اگر مجبوری ہو جائے تو آپ کو قبل از وقت مجھے اطلاع کرنا ہوگی۔ یاد رکھیے گا آپ کے اچانک غائب ہو جانے سے میرے کام کا بہت حرج ہوگا۔“

”اوکے سر!“ وہ خوش ہوگئی اور چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں نے اس کا نام تک نہیں پوچھا تھا۔ وہ بولتی ہی اتنا زیادہ تھی کہ مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

اگلے روز وہ وقت پہ آگئی۔

”کل آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”آپ نے پوچھا بھی نہیں تھا لیکن بہر حال مجھے جاشیہ سلطان کہتے ہیں، کہنے کو تو مجھے اور بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ اماں کی اعلاظرفی کہ وہ مجھے صرف چیل کہنے پہ ہی اکتفا کرتی ہیں۔“

”چیل۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”اماں کا خیال ہے کہ میں ان کی اولاد نہیں ہوں۔ آج سے بائیس سال پہلے ایک چیل اپنا انڈہ ہمارے گھر کی چھت پر رکھ گئی تھی۔ میں اسی انڈے کی پیداوار ہوں۔ مجھے اپنی پیدائش کا یہ مرحلہ بہت اچھا لگتا ہے۔“

آپ سوچ تو رہے ہوں گے کہ مجھے چیل کیوں کہا جاتا ہے۔ بات تو ہماری اندرونی ہے لیکن اب آپ سے کیا پردہ، بچپن میں ہم اپنے دادا کے ہاں رہتے تھے یعنی تایا، چچا، بہت بڑی فیملی تھی سب کے پانچ پانچ چھ بچے تھے۔ صرف میں ہی اپنے والدین کی ایک اولاد تھی۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کی بدولت سب اکٹھے رہا کرتے تھے۔ گھر کے سب افراد جب ایک وقت میں بیٹھ کر کھانا کھاتے تو ہمیشہ میری حق تلفی ہو جاتی تھی۔ پھر میں نے ان سب کے درمیان چھین چھوٹ کر کے کھانا سیکھ لیا۔ میری اس اضافی خوبی کو اماں بھی نہیں سراہتیں کبھی ہیں۔ نہ جانے میں نامراد کس پہ چلی گئی۔ حالانکہ مجھے کہیں بھی جانے کا شوق نہیں۔ جہاں بھی جاتی ہوں واپس آ جاتی ہوں۔ لیکن اماں ہمیشہ نالاں رہتی ہیں۔“

اس کے اتنے لمبے چوڑے جواب پہ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور آئندہ سوال نہ کرنے کا مصمم عہد کر لیا۔

”میرا خیال ہے، سارا وقت باتوں میں ہی گزر رہا ہے۔ ہمیں کچھ کام کرنا چاہیے۔“

”کیوں نہیں سر!“ میری سنجیدگی پہ وہ تھوڑی سی جھل ہو گئی۔

میں اسے اپنی ہمرابی میں آفس نمراد میں لے آیا۔ اس نے چلتے ہوئے پھر سوال کیا۔

”سر! آپ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ جو آپ کو مددگار کی ضرورت پڑی۔“

”نہیں۔ میں افسانے، ناول لکھتا ہوں۔“ میں نے اسے صفحات اور قلم تھما دیا۔

”شکریہ۔ قلم میں ہمیشہ اپنا استعمال کرتی ہوں۔“

اس نے صفحات لے لیے اور قلم پرس سے نکال لیا۔

”یہ قلم مجھے میری دوست اینلا نے دیا تھا۔ وہ میری بچپن کی دوست ہے۔ یہ قلم میرے ساتھ ہوتا ہے تو گویا مجھے اس کے ہونے کا احساس رہتا ہے۔“

”اچھا احساس ہے۔“ میں جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ مبادا وہ سہیلی کی ہسٹری نہ لے کر بیٹھ جائے۔ ابھی ہمیں کام کرتے ہوئے آٹھ دن ہوئے تھے کہ جاشیہ نے ایک سوال اٹھایا۔

”سر! آپ محبت کے موضوع پہ بہت زیادہ لکھتے ہیں کیا یہ آپ کا من پسند موضوع ہے؟“

جاشیہ کوئی پہلا فرد نہیں تھی جس نے یہ سوال کیا تھا۔ اکثر لوگ مجھ سے یہی سوال کرتے تھے۔

”کہہ سکتے ہیں۔“ میں نے ہنس کر نال دیا۔

”اگر آپ چاہیں تو اور بھی بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔“ اس نے چند دن کے بعد کہا۔

”میں ٹینشن میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔“ میرا جواب ہمیشہ کی طرح مختصر تھا۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں ان باتوں سے ٹینشن دور ہو جاتی ہے۔“

”کسی کی ٹینشن دور ہو یا نہ ہو۔ کم از کم میری تو ہو جاتی ہے۔“ میرے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا۔
 ”تو گویا آپ لوگوں کو اپنا غلجان دے رہے ہیں۔“ اس نے بات پکڑ لی۔
 ”میں نے آج تک ایسا محسوس نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ میری تحریروں کی ڈیمانڈ نہ کرتے۔“
 ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی تحریروں میں ایسا کیا ہے جو لوگ اتنا پسند کرتے ہیں۔ سر! یہ کمپیوٹر کا دور ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کا دور۔ ان ماورائی قصوں سے ہمیں باہر آنا چاہیے اور ایسا آپ جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ پاکستان کو محبت کی نہیں ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے۔ اس بے جا محبت نے نوجوان نسل کو نکمٹا کر دیا ہے۔ یہ محبت صرف معیشت پہ بوجھ ہے اور کچھ نہیں۔“
 ”محبت۔۔۔ معیشت پہ بوجھ۔“ میں نے بڑی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”لیں۔ سر۔ محبت کیا دیتی ہے۔ نسل میں اضافہ، غیر ضروری بڑھتی ہوئی آبادی، معیشت پہ بوجھ نہیں تو اور کیا ہے۔“

”ادہ مائی گاڈ!“ اس کے نظریہ پہ میرا سر چکر ا گیا۔
 لیکن اس کی گفتگو ابھی جاری تھی۔
 ”سر! آپ چاہیں تو اپنی کہانیوں میں کچھ اور ورائٹی بھی ڈال سکتے ہیں، جو انسانیت کے حقیقی پہلو ہیں اور ویسے بھی ادیب معاشرے کا ترجمان ہوتا ہے۔“
 ”محبت کیا معاشرتی موضوع نہیں ہے۔“ میں نے بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔
 ”کیا صرف محبت ہی معاشرے کا موضوع ہے اور بھی بہت سارے موضوع ہیں، جنہیں آپ چاہیں تو احاطہ تحریر میں لاسکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی شہرت کو مزید چاند لگ جائیں۔“
 اس نے قائل کرنے والے انداز میں کہا تو میں مصلحتاً خاموش ہو گیا۔
 ”اوکے۔ اوکے۔ میں آپ کی تجویز پہ یقیناً غور کروں گا۔“
 ”تھینک یو۔ سر۔“ اس نے پھولی سانسوں کے ساتھ اس طرح شکریہ ادا کیا، گویا کہ ٹو سر کر لیا ہو۔



اور پھر اگلے ہی روز عجیب واقعہ ہوا، جاشیہ کے ساتھ چار پانچ عورتیں آئی تھیں۔
 ”یہ سب کون ہیں؟“ میں نے جاشیہ سے پوچھا۔
 ”عورتیں ہیں سر!“
 ”وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔“
 ”لیکن آئی کہاں سے ہیں؟“
 ”اپنے اپنے گھر سے سر۔“
 میرا سر گھوم گیا۔ لیکن جاشیہ نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔

”سر! یہ انتہائی درد مند اور خستہ حال عورتیں ہیں۔ ان کی کہانی سنیں تو آپ کا دل پاش پاش ہو جائے گا اور آپ کے قلم میں وہ سوز پیدا ہوگا کہ آپ کے قارئین آپ کے اور قہیب ہو جائیں گے۔ ہر

ایک کی ایک سے بڑھ کر ایک دردناک کہانی ہے۔ میرا خیال ہے۔ سب سے زیادہ ماسی بتول غم زدہ ہے۔ ماسی بتول۔۔۔ تم آگے آ جاؤ۔“

”شٹ اپ۔ جاشیہ! میری برداشت جواب دے چکی ہے۔ اگر آپ نے میرے ساتھ سنجیدگی سے کام کرنا ہے تو کریں۔ ورنہ آپ بمعہ ان خستہ حال کہانیوں کے تشریف لے جاسکتی ہیں۔“ میں نے ان سب خواتین کی طرف اشارہ کیا۔

اس کے بعد میں رکنا نہیں اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اتنی کرختگی کا اظہار میں نے پہلی بار کیا تھا۔ دس منٹ کے بعد جاشیہ میرے کمرے میں آئی۔

”ایم۔ سوری سر! میں نے تو آپ کی مدد کرنا چاہی تھی۔“

میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

”آپ جس کام کے لیے آئی ہیں صرف وہی کام کریں۔ سوچنے اور کہانیاں ڈھونڈنے کا کام میرا ہے۔ میں کیا لکھتا ہوں اور کیا لکھنا چاہتا ہوں۔ وہ پسند کیا جاتا ہے یا نہیں۔ یہ میرا اور میرے قارئین کا مسئلہ ہے۔ آپ کا سر درد نہیں۔ اب آپ جاسکتی ہیں۔ فی الحال مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ ہم کل کام کریں گے۔“

جاشیہ چلی گئی اور میں یونہی اکیلا بے زاری سے ٹہلتا رہا اور پھر بایںک کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ دراصل پس پردہ مجھے اپنی کہانی پہ غصہ تھا۔ جو ایسے موڑ پر آ کر پھنس گئی تھی جس کا حل میرے اختیار سے باہر تھا۔ ایسے میں جب لکھنے کا ارتکاڑ ٹوٹتا تھا تو میرے سر پہ یونہی دھشت سوار ہو جاتی تھی۔ پھر یا تو میں بہت زیادہ افسوس کنگ کرتا۔ یا یونہی سڑکیں ناپتا پھرتا۔ کبھی کبھار انگلیں مودیر بھی دیکھ لیتا تھا۔ سرمد کو بلا لیتا اور تاش کے پتوں میں الجھ جاتا۔ اس وقت کچھ بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ سڑکیں ناپی جائیں۔

دور دراز سی طرح گزر گئے۔ جاشیہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی وجہ سے میری یہ کیفیت ہے۔ اس نے آج پھر مجھ سے معذرت کی۔

”میں آپ کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔ بس میرا دل اُچاٹ ہو رہا ہے۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

اس نے بے تکلفی سے کھڑکیوں کے پردے سرکا دیے۔

”سر! موسم بہت خوش گوار ہو رہا ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو ہم آج نیچے لان میں بیٹھ کر کام کریں۔“

میں نے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی۔ موسم واقعی دل فریب ہو رہا تھا۔ سرمئی بدلیاں آسمان پہ منڈلا رہی تھیں اور بڑی پیاری خنک ہوا چل رہی تھی۔ بہار کا موسم عروج پہ تھا۔

میں نے کسی خیال کے تحت ہامی بھر لی۔

ہم دونوں نیچے آ گئے۔ اس نے ستائشی انداز میں لان کی طرف دیکھا۔

”سر! آپ کا ذوق بہت اعلیٰ ہے۔“

میں مسکرا دیا۔ پھر گلاب کی باڑھ کو چھو کر بولا۔

”یہ ذوق میرا نہیں کسی اور کا ہے۔ جیسے یہ گھر میرا نہیں کسی اور کا ہے۔“

اس نے سوالیہ نگاہ مجھ پہ ڈالی۔ ”میں سمجھی نہیں۔“

”میں اس گھر میں بحیثیت کرایہ دار اوپر کی منزل میں رہتا ہوں۔ مالک مکان پہلے نیچے رہتے تھے

اب دوسری جگہ شفٹ ہو گئے ہیں۔ میں لان کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرے پاس اتنا وقت نہیں

ہوتا۔ اس لیے یہاں مالی آتا ہے۔“

”اور آپ کے والدین۔ بہن بھائی؟“

”والدین بہت پہلے انتقال کر گئے تھے ایک بہن ہیں جو کونڈہ میں رہتی ہیں۔ دو بھائی کراچی میں رہتے ہیں۔ بہنوئی چمڑے کا کام کرتا ہے اور بھائی کپڑے کا علیحدہ علیحدہ بزنس کرتے ہیں۔

میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ تینوں بہن بھائی مجھ سے بڑے ہیں اور شادی شدہ ہیں۔ تعلیم سب

سے زیادہ میں نے حاصل کی تھی۔ سو اس طرف آ گیا۔ چاہتا تو میں بھی بزنس کر سکتا تھا۔ کراچی میں میرا

ذاتی گھر ہے جو ہمارا آبائی گھر تھا۔ والدین نے میرے نام کر چھوڑا ہے۔ کراچی کا ماحول مجھے پسند نہیں۔

شور، ہنگامہ۔ میں سکون کی وجہ سے اسلام آباد آ گیا۔ قلم سے دوستی میری بہت پرانی ہے۔ لیکن وقت کے

ساتھ ساتھ یہ میرا ذریعہ معاش اور تنہائی کا ساتھی بن گیا ہے۔“

”سر! آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟“ اتنا ذاتی سوال اس نے بے دھڑک پوچھ لیا تھا۔

”شادی کے بارے میں۔۔۔ اگر میں سنجیدگی سے سوچتا تو شاید وہ بھی ہو چکی ہوتی۔“ میں نے

لا پرواہی سے جواب دیا۔

ہم دونوں چہل قدمی کرتے کرتے کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔

”اس کا مطلب ہے سر! آپ حقیقت سے بہت دور ہیں۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف

دیکھا۔

”افسانوی کرداروں کے ساتھ رہتے رہتے آپ کو اپنی تنہائی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔“

”میں تنہا کہاں ہوں۔“ میرے دل میں میس سی اٹھی۔ یہاں کا خیال ایک بار پھر پوری توانائی سے

میرے اعصاب پہ لگانے لگا تھا۔

”میرا تخیل۔ میری سوچیں۔ میرا قلم اور سب سے بڑھ کر میرے چاہنے والوں کا پیار۔ کیا میں پھر

بھی اکیلا ہوں۔“

”سر! آپ نے وہ گانا سنا ہے۔“

میں ہل دو ہل کا شاعر ہوں

ہل دو ہل میری کہانی ہے

ساحر لدھیانوی نے لکھا ہے اسے۔“

”جانتا ہوں۔“

”سر! لوگ آپ سے پیار نہیں کرتے۔ آپ کی تخلیق سے پیار کرتے ہیں۔ کل آپ لکھنا چھوڑ دیں

گے۔ کون آپ کو یاد کرے گا۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں ان چاہنے والوں کا پیار آپ کے لیے ہمیشہ رہے گا۔ جبکہ آپ نے ہمیشہ قلم کے ذریعے ہی ثابت کیا ہے۔ محبت کے بنا زندگی نہیں گزرتی۔“

”کیا تم اس بات سے انکاری ہو؟“

”سر! محبت اتنی ضروری بھی نہیں ہوتی۔“

”تو پھر ضروری کیا ہے؟“

”صرف پیسہ ضروری ہے۔“

”بڑی مادیت پسند ہیں آپ۔ حالانکہ پیسہ ضرورت پوری کرتا ہے۔“

”اور ضرورت ہی سکون مہیا کرتی ہے۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”اس طرح محبت بھی ایک ضرورت

ہی ہے۔“

”یعنی آپ کی سترہ سہیلیاں آپ کی ضرورت ہیں۔ آپ کو ان سے محبت نہیں۔“

”پڑھنا تو میری مجبوری تھا۔ اور مشاغل میرے بہت سارے تھے، سہیلیاں بنانا میرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ اچھا حلقہ احباب کے پسند نہیں۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ انہیں تحفے لینا اور دینا اور سب سے زیادہ اچھا جب لگتا ہے جب وہ میرے گرد ہوتی ہیں اور مجھے ان میں ممتاز حیثیت حاصل ہوتی ہے تب میں خود کو بہت خوش نصیب محسوس کرتی ہوں۔ اپنی ذات کا احساس میری زندگی کی ضرورت ہے اور یہ احساس میرے اخلاق اور میرے طرز عمل پر بہت اچھا اثر ڈالتا ہے۔“

محبت کو کس طرح اس نے صرف ضرورت پر موقوف کر دیا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔

میں اگر محبت کے معاملے میں بزدل تھا تو یہ لڑکی خود پسند بھی یعنی صرف اپنی ذات سے محبت کرنے

والی۔

”آپ کی اکثر کہانیاں محبت نہیں بلکہ جنونی محبت کا شکار نظر آتی ہیں۔ ایسا آج کل کہاں ہوتا ہے کوئی کسی کے لیے اتنا مخلص نہیں ہوتا اور خاص طور پر مرد حضرات ناممکن۔ اس لیے مجھے یہ سب کچھ کو اس لگتا ہے۔“

”اس لیے کہ تم نے کسی سے محبت نہیں کی۔“ میں نے جل کر کچھ عجیب سے انداز میں کہا۔

”سر! آپ نے کی ہے؟“ وہ جھٹ بولی۔

”ہاں۔ اپنی بزدلی سے۔“ میں کہہ دینا چاہتا تھا لیکن کہا تو صرف اتنا۔

”شاید۔۔۔ ایک طرف۔“ اس نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا اور پھر ہنس پڑی۔

”اس طرح جیسے آپ کا یہ ہیرو کر رہا ہے۔“

میں آج کل جس کہانی میں الجھا ہوا تھا اس نے اسی کی طرف اشارہ کیا۔

(میرے سارے ہیرو۔ میری طرح ہی محبت کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی میں انہیں کامیاب کر دیتا

ہوں۔ کیونکہ یہ میرے اختیار میں ہے)

”آج کل آپ جو کہانی لکھ رہے ہیں اسے ہی لے لیجیے۔ ہیرو ایک لڑکی سے شدید محبت کر رہا

ہے اور اس سے اظہار نہیں کر سکا۔ ہیرو ان کی شادی ہوگئی۔ ہیرو نے خود کشی کا منصوبہ بنالیا۔ اول تو

ایک انسان کی خاطر یوں زندگی برباد کرنا کہاں کی دانش مندی ہے پھر ادھر ہیروئن، ہیرو کے جذبوں سے ناواقف رہی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ایک شخص اسے اتنی شدت سے چاہتا رہا اور وہ بے خبر رہی۔“

”وہ خبردار ہے لیکن۔ تمنا کرتی ہے کہ ہیرو پہل کرے۔“
 ”لیکن آپ نے کہانی میں تو ظاہر نہیں کیا۔ اس کا یہ رد عمل شادی کے بعد آتا ہے یہ کیسی بات ہے سر! کیا وہ اپنی شادی سے خوش نہیں ہے؟“
 ”خوش ہے۔ لیکن۔۔۔“ میں رک گیا۔ جا شیہ کے سوال نے مجھے چونکا دیا تھا۔

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا اور جان بوجھ کر بات بڑھائی۔
 ”جس شخص سے اس کی شادی ہوئی ہے۔ وہ ایک معروف بزنس مین ہے، لڑکی بہت حساس ہے۔ معمولی معمولی خوشیوں پہ خوش ہونے والی۔ وہ شوہر کی مصروفیات و بے توجہی سے بے زار ہو گئی ہے۔ اب ماضی کی طرف دیکھتی ہے تو پچھتاتی ہے اور خیال کرتی ہے اسے سلمان کو یوں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”اس لیے ہیروئن کو واپس پہلے ہیرو کی طرف پلٹا دینا چاہتے ہیں کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ ایم آئی رائٹ سر۔“

(مسئلہ تو سارا یہی ہے) ”تم بتاؤ کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔“

میں نے جا شیہ کو اپنے ساتھ میدان میں اتار لیا۔
 وہ کچھ دیر رکی۔ پھر سوچ کر بولی۔

”ہونہر۔ بات غور کرنے کی ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اسے ہیرو کی طرف پلٹنا چاہیے یا نہیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ کہانی معاشرے کے کلچر سے ہٹ کر ہوگی۔ شادی شدہ عورت کا ایسا طرز عمل ہمارے یہاں پسند نہیں کیا جاتا۔“

میں اس کی بات غور سے سن رہا تھا۔ درمیان میں کاٹ کر بولا۔
 ”یہ بات میری نظر میں بھی ہے۔ اور اس قسم کی کچھ باتیں ہیں جو کہانی کو آگے چلنے سے روک رہی ہیں۔“

”سر۔۔۔ آپ اس بات کو نظر انداز کر دیجیے کہ لڑکی پہلے ہیرو میں دلچسپی لیتی تھی یا نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”وہ لڑکی صرف محبت کی تمنائی ہے۔ اگر اسے یہ محبت اپنے شوہر سے مل جاتی تو وہ کبھی بھی ماضی کی طرف نہ دیکھتی۔ وہ ایک مشرقی اور باخیا لڑکی ہے۔ تب ہی اس نے شادی سے پہلے سلمان کی محبت کو قبول نہیں کیا تھا۔“

وہ کچھ دیر رکی اور پھر سوچ کر بولی۔ ”ایسے میں آپ اگر سلمان کے کردار کو تھوڑا سا تبدیل کر دیں۔ آئی مین۔ اس کی شخصیت میں کچھ بولڈنیس اور جارحانہ پن آجائے اور پھر ایسے میں آپ ہیروئن کے شوہر کے ساتھ اس کے تعلقات ظاہر کیجیے۔ یعنی سلمان کا ان کے گھر آنا جانا۔“

اور بس کہانی میرے سامنے بالکل واضح ہو گئی یوں لگا جیسے کوئی بوجھ تھا وہ سرک گیا۔
 جاشیہ بول رہی تھی اور میرا ذہن اپنی کہانی کی طرف بہہ رہا تھا۔ میری کہانی اپنا مقصد کھوئے بغیر
 میرے ذہن کے درپچوں میں محو سفر تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ جاشیہ اتنے کام کی لڑکی ہے۔ وہ مطالعاتی
 باریک بینی سے کرتی ہے کہ اس کی خامیاں اور خوبیاں با آسانی محسوس کر سکتی ہے۔ وگرنہ اس سے پہلے
 میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ لا پرواہ اور بے جا تنقید کرنے والی لڑکی ہے، لیکن آج میں واقعی اس کی ذہانت و
 صلاحیت سے متعارف ہی نہیں، متاثر بھی ہوا تھا۔ میری ساری کلفت دھل گئی۔ دل چاہتا تھا ابھی قلم کا غد
 لے کر بیٹھ جاؤں اور اسے کسی انجام تک پہنچا دوں۔

نت نئے سین میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔
 میں نے جاشیہ کی طرف دیکھا جو کہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔
 ”تھینک یو سو مچ“ میں نے فراخ دلی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کی ذہانت کی تعریف کی تو
 وہ خوش ہو گئی۔
 مجھے نہیں معلوم تھا، یہ تعریف مجھے آگے چل کر ہنگی پڑے گی۔



اگلے مہینے میری کہانی کیا شائع ہوئی قارئین کے خطوط کا انبار لگ گیا۔ ان کی پذیرائی اور داد و
 تحسین میرے لیے کچھ ناہمیں تھا۔ لیکن اپنی تعریف مجھے ہمیشہ ہی اچھی لگتی تھی۔ جاشیہ بھی میرے ساتھ
 بیٹھی خط پڑھ رہی تھی کہنے لگی۔

”تاج محل مزدوروں نے بنایا تھا اور نام کسی اور کا آتا ہے۔“ میں واقعی نہیں سمجھا۔
 ”سر! کیسی عجیب بات ہے۔ آپ کو اتنی محنتیں وصول ہو رہی ہیں اور آپ نے ہمارا منہ بھی میٹھا
 نہیں کرایا۔“

مجھے ہنسی آ گئی۔ ”ہاں، تمہارا حق تو بتا ہے۔ اس کہانی کو مشکل سے نکالنے والی تم ہو۔ بتاؤ۔۔ کیا
 منگاؤں تمہارے لیے؟“

”نہیں سر! کچھ منگانے کی ضرورت نہیں۔“ میرن فراخ دلانہ پیشکش پر وہ کچھ کھسیا سی گئی۔
 ”نہیں بھی! تمہارا حق تو بنتا ہے۔“

”سر! میں ڈانٹ کی وجہ سے بیٹھے کا پرہیز کرتی ہوں۔“
 ”تو پھر۔“

”اگر آپ زیادہ اصرار کر رہے ہیں تو زیادہ نہیں۔ صرف پانچ سو روپے دے دیجیے۔“

وہ کچھ انک کر جھک کر بولی۔ تو میں نے اس کی طرف بڑی حیرت سے دیکھا۔

”سر! بات یہ ہے کہ عاصمہ کا منگیتر ہے نا۔ اس کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔“

”تو اس کے لیے آپ نے دوائیاں خریدی ہیں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ ذرا جانا ہے عیادت کے لیے کچھ پھول لے کر، پھول تو سستے ہی آتے ہیں

دراصل میں نے اپنے لیے ایک کائن کا سوٹ بھی لینا ہے نئے کپڑوں سے شخصیت کا امپریشنز اچھا پڑتا ہے۔“

میں نے چپ چاپ پانچ سو روپے اسے دے دیے۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد اس نے مجھ سے ایک ہزار روپے ادھار لیے۔ کہانی لکھنے کے دوران میری کچھ عادت سی بن گئی تھی اس سے مشورہ کرنے کی بلکہ یہ عادت اس نے خود ڈالی تھی، خواہ مخواہ میرے کام میں ناگ اڑا کر۔

اور پھر اس سے اس نے فائدہ بھی خوب اٹھایا۔ ہزار روپے بلکہ جب اس نے دیئے کام نام نہیں لیا تو ناچار مجھے مانگنے پڑے۔

”سر! وہ پیسے تو خود بخود کٹ گئے تھے۔“

”کٹ گئے۔“

”سر! اس قدر تو مشورہ لیتے ہیں آپ مجھ سے۔ اب وہ کیا بچے ہوں گے۔“ اس کی لا پرواہی پر میں جزبہ سا ہو کر رہ گیا۔

پھر میں نے خود ہی فیصلہ کیا کہ اس کی تنخواہ بڑھا دوں۔ کیونکہ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ میرے ساتھ کام کرتی رہتی تو میرا فائدہ ہی فائدہ تھا۔ میں نے اس کی تنخواہ بڑھا دی تاکہ وہ مشوروں کی فیس علیحدہ نہ مانگے لیکن اسے تو جیسے چسکا پڑ گیا تھا۔

جانشین کی اول روز سے عادت تھی، اپنی سہیلیوں کا ذکر فرضی عبادت سمجھ کر بلا ناغہ مجھ سے کرتی تھی۔ اب میں نے تو اس سے نہیں کہا تھا کہ آتے ہی وہ اپنی کسی نہ کسی سہیلی کا قصہ ضرور سنائے یوں جیسے کوئی تازہ اخبار سنایا کرتا ہے۔ شروع میں مجھے اس کی یہ چیز چڑ بہت بری لگتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ اس کی سہیلیوں کے کردار اور ان کے ارد گرد کے کردار بڑے دلچسپ ہیں۔ میں انہیں لکھنے لگا۔ ظلم یہ ہوا کہ اسے علم ہو گیا کہنے لگی۔

”سر! یہ تو بہت بری بات ہے۔ میں آپ سے برسیل تذکرہ ذکر کرتی ہوں اور آپ ان سے کہانیاں بنا لیتے ہیں۔“

میں لحوں میں بھانپ گیا اس بات کے پیچھے یقیناً پیسوں کی خواہش پنہاں ہے۔

آخر بچھو کے ڈنک سے کچھوا ہوشیار ہو ہی گیا تھا۔ میں صاف مکر گیا۔

”تمہارا وہم ہے، ہو سکتا ہے یہ کہانی کسی اور کی ہو اور اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہانیوں کے کردار حقیقی کرداروں سے مطابقت رکھنے لگتے ہیں جب ہی تو لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔“

وہ خاموش تو ہو گئی۔ لیکن اس نے مجھے بخشا نہیں۔ اگلے چند دن کے بعد اس نے مجھ سے ڈیڑھ ہزار روپے ادھار مانگے اور اپنی سخت مجبوری ظاہر کی۔

میں ادھار دینے پہ ذرا بھی رضامند نہیں تھا لیکن وہ بضد تھی۔

”آخر ایسی بھی کون سی مجبوری آگئی اور پھر ابھی تو تنخواہ لی ہے تم نے۔۔۔“

”سر۔۔۔! میری جیسے ہی کمیٹی کھلی گی۔ میں آپ کو رقم لوٹا دوں گی۔“

”مگر۔۔۔ میں۔۔۔“

”سر۔۔۔ پلیز۔۔۔“ میں اپنی ہمدردانہ فطرت کے آگے مجبور تھا۔

”دیکھو۔ یہ رقم جلد لوٹا دینا۔“ میں نے اسے پیسے دیتے ہوئے کہا۔

”بے فکر رہیں۔ سر! آپ۔“

اور پھر۔ پیسے لے کر وہ خود اتنی بے فکر ہوئی۔ ایک دو اور تین ماہ گزر گئے۔

”جاشیہ! تم نے میرے پیسے نہیں دیے۔“

”سر! کیوں نہیں۔ لیکن جس وعدے پہ لیے تھے اسی پہ دوں گی۔“

”اور ابھی میری میٹھی نہیں کھلی۔“

”آخر تمہاری یہ میٹھی کب کھلے گی۔“

”ان شاء اللہ جیسے ہی ڈلے گی، پہلی میری ہوگی میں ممبر اکٹھے کر رہی ہوں۔ بس آپ دعا کریں۔“

مجھے ایمان دار میر ملیں۔“

مجھے تو آگ لگ گئی۔ ”ان شاء اللہ یہ رقم تمہاری تنخواہ میں سے کٹے گی۔“

میں نے بھی اسی کی طرح کہا۔

حالانکہ میں نے آج تک ایسا نہیں کیا تھا۔

”سر! آپ تو بے اعتباری یہ اتر آئے۔ میں آپ کی رقم لے کر بھاگ تو نہیں رہی اور کون سا میں

نے وہ رقم خود استعمال کی ہے۔ اپنی سہیلی کو ادھار دی تھی۔“

”تم خود کتنی بڑی لینڈ لارڈ ہو جو لوگوں کو مقروض کرتی پھرتی ہو۔“

”بس سر۔ کسی کو مدد کرنا بھی تو ثواب ہی ہے۔ آپ بے فکر رہیں اسے جیسے ہی پہلے کمرشل کا چیک

ملے گا، وہ میرا قرض لوٹا دے گی اور میں آپ کا۔“

”کمرشل کا چیک۔“

”جی سر! میری سہیلی نشا ہے نا۔ جو ماڈل بن گئی ہے اور سر، میں آپ کو بتاؤں۔ اس کا کمرشل

ابھی آن ایئر بھی نہیں گیا اور فلموں میں آفرز دھڑا دھڑ شروع ہو گئیں۔ میں بتا نہیں سکتی وہ کتنی خوش

ہے۔“

اور میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ یعنی میری رقم ڈوب چکی ہے اب مجھے صبر کر لینا چاہیے۔

اس کے بعد اس نے اچانک چھٹیاں شروع کر دیں۔ چار چھٹیوں کے بعد آئی تو بے حد افسردہ

تھی۔ میں نے اس کی افسردگی کی وجہ پوچھی۔ اتنا تو مجھے اندازہ تھا کسی سہیلی ہی کا غم ہوگا۔ اب تو مجھے اس

کی ذاتیات چھیڑتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ کہیں وہ ادھار نہ مانگ لے۔

لیکن بس میرے ایک سوال کرنے کی دیر بھی اور اس نے پوری داستان امیر حمزہ سنادی۔ داستان

اس کی ماڈل بننے والی سہیلی کی تھی اتنی سنسنی خیز کہانی۔ میں ڈیڑھ گھنٹہ دم بخود سا سنتا رہا۔

وہ واقعی پریشان اور افسردہ تھی۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور اسے سمجھایا۔ کہ وہ زیادہ فکر نہ کرے۔

قصور تمہاری سہیلی کا ہے، گلیمر کی دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے اسے اس فیلڈ میں آنا نہیں چاہیے تھا، یہاں

شریف لوگ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ تو مجھے پتا نہیں کہ میرے دلا سے سے اسے کتنی تقویت ملی۔
ہاں البتہ اس کی سنائی گئی کہانی مجھے کسی نفع کی طرح لگی تھی۔
میں نے دنوں میں وہ کہانی لکھ ڈالی۔



مجھے نہیں پتا تھا۔ یہ کہانی میری تقدیر بدل دے گی۔
ایک مشہور و معروف ڈرامہ پروڈیوسر کا فون میرے پاس آیا۔
وہ میری کہانی کو ڈرامائی تشکیل دینا چاہتا تھا۔
اس نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اتنا اوپر چلا جاؤں
گا۔ شہرت تو شہرت دولت بھی خوب ملی۔
جاوید میرے سر ہو گئی۔ ”سر! یہ کہانی تو میری سہیلی کی تھی۔ آپ نے اسے میری اجازت کے بغیر
کیوں لکھا۔“

”کیوں۔ کیا تم نے اس کہانی کے جملہ حقوق محفوظ کیے ہوئے تھے۔“ میں چڑ کر بولا۔
”لیکن سر! یہ اخلاقاً جرم ہے۔“ وہ بھی طیش میں آ گئی۔
مجھے معلوم تھا۔ اسے پتا چل گیا ہے کہ یہ کہانی ڈرامہ بننے والی ہے۔ اسی لیے وہ کوئی موٹا مطالبہ کرنا
چاہتی ہے اور مجھے رعب دکھا رہی ہے لیکن میں رعب میں کیوں آتا۔
”اخلاقاً جرم تو یہ بھی ہے کہ تم اپنی سہیلیوں کے ذاتی قصے مجھے سناتی ہو۔“ میں نے کہہ دیا۔ ”اگر
تمہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہاری کہانیاں چرا لیتا ہوں۔ تو اپنے منہ میں تالا لگا کر رکھا کرو۔ میں
تمہاری منتیں نہیں کرتا کہ اپنی سہیلیوں کے قصے مجھے سناؤ اور کیا یہ کہانی ہو بہو ایسی ہے جیسی تم نے بتائی
تھی؟“

”ہو بہو نہیں ہے لیکن مرکزی خیال تو میرا ہی دیا ہوا ہے۔“
”یہ مرکزی خیال تم کسی اور کو دے کر دیکھ لو۔ اگر وہ ایسی کہانی لکھ لے۔ تو مجھ سے بات کرنا یا پھر تم
خود بھی کوشش کر لو۔ خواہ تم میری شہرت میں شریک بن رہی ہو۔ پاکستان کا خواب علامہ اقبال نے
دیکھا تھا۔ لیکن پاکستان کس نے بنایا تھا قائد اعظم نے۔ یہاں جو محنت کرتا ہے وہی منظر عام پہ ہوتا ہے
اگر تم نے میرے ساتھ کام کرنا ہے تو کرو، ورنہ روزانہ یہ احسان کا ٹوکرا میرے سر پہ رکھنے کی ضرورت
نہیں۔ میں تم سے پہلے بھی مشہور تھا اور بعد میں بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“
میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ میں اتنے جلدی بد لحاظ کیسے ہو گیا تھا۔ شاید شہرت کا نشہ ہی ایسا ہوتا ہے
لیکن وہ کون سی لحاظ والی تھی۔ اس نے میرے ڈیڑھ ہزار روپے ایسے ہضم کیے تھے کہ ڈکار بھی نہیں
لی۔

ڈرامہ آن ایئر چاچکا تھا۔ میرے مداحوں میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا دوسرے پروڈیوسر بھی
مجھ سے رابطہ کر رہے تھے۔ اسی دوران ادارے نے میرے اعزاز میں بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا تھا

میں یہ کہوں گا یہ عرصہ میری شہرت کا چار چاند لگا گیا۔ نہ جانے جاشیہ کی وجہ تھی یا نصیب ہی اس وقت عروج پہ تھا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جاشیہ کے حق میں میرا کچھ بھی کہنا مہنگا پڑ سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سرد، جاشیہ کی لالچی طبیعت سے ناواقف تھا۔ جب بھی ملتا مجھ سے یہی کہتا۔

”آج کل تو ہواؤں میں سفر کر رہے ہو۔“ اور میں ہنس کر چپ ہو جاتا۔

ایک دن اس نے جاشیہ کے سامنے میری تعریف یوں کی۔

”پہلے بھی تم لوگوں کے درمیان مشہور تھے۔ لیکن جب سے تمہاری یہ کولیگ آئی ہے۔ تم ممتاز ہو گئے ہو۔“ مس جاشیہ یقیناً تمہاری اچھی ہیلپر ثابت ہو رہی ہیں۔“

یہ میری نہیں جاشیہ کی تعریف تھی۔ مجھے آگ لگ گئی اور جاشیہ کو کلف۔ مسکرا کر بولی۔

”مگر یہ بات آپ کا دوست نہیں مانتا حالانکہ یہ پاکستان ہے، یہاں پر سنیلٹی جتنی مشہور ہوتی ہے، سیکریٹری اس سے زیادہ مشہور ہو جاتی ہے۔“

ادہ ہو۔ پہلے تو پیسے کی ہوس تھی اب محترمہ کو شہرت کا شوق بھی چرا رہا ہے۔ سوچتا ہوں اسے نو دو گیارہ کر ہی دوں۔ لیکن میں کچھ نہیں بولا۔

تھوڑی دیر میں جاشیہ فارغ ہو کر چلی گئی تو میں نے سرد کو پکڑ لیا۔

”کیا ضرورت تھی تمہیں اس لومڑی کے سامنے اتنی بکواس کرنے کی۔“

”لومڑی۔۔۔؟“ سرد نے اچنبھے سے مجھے دیکھا۔

”ہاں۔۔۔!“ میں نے تنک کر کہا۔

”بار! رہنے دو۔۔۔ اچھی خاصی لڑکی ہے۔“

”اچھی خاصی ہوگی، تمہارے لیے۔ مجھے تو بالکل چیل لگتی ہے۔ پائی پائی پہ جھٹنے والی۔“

سرد ہنس پڑا۔ وہ ساری صورت حال سے واقف تھا۔

”بہر حال جو کچھ بھی ہے۔ کام تو تمہارے بہت آ رہی ہے۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے کئی بار دھمکی دے چکا ہوں۔ لیکن کام چھوڑ کر نہیں جاتی۔ لگتا ہے اس سے اچھی

نو کری اسے کہیں نہیں ملے گی۔“

”اور اس سے اچھی مددگار تمہیں بھی کہیں نہیں ملے گی۔ خوب کیش کر رہے ہو۔“

”یہ میری ذہانت ہے اس کی نہیں۔“ میں نے بات ختم کر دی۔

جاشیہ کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے پتا چل گیا تھا کہ میں فطرتاً لالچی آدمی ہوں، لیکن میں اس کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔ اور نہ کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے کوئی بھی شخص اپنا منفی پہلو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اور خاص طور پہ مجھ جیسی مشہور شخصیت۔

لیکن جاشیہ کو میری اس فطرت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ مجھے حیلے بہانوں سے بلیک میل کر رہی تھی۔ اور اکثر چاہتی تھی کہ میں اس کی ذہانت کی بار بار تعریف کروں وہ جو بھی مشورہ دے میں اس کا مشکور ہو جاؤں اور ساتھ ساتھ مقروض بھی لیکن میں ایسا کیوں کرتا۔ اب میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ میں اس سے صرف اتنا ہی کام لوں گا۔ جتنے کے لیے میں نے اسے رکھا تھا اور وہ کیا سمجھتی ہے، کیا میں

اس کے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ آج کل میں ویسے بھی بہت خوش تھا۔ طبیعت میری بڑی رواں تھی اور ذہن بھی ہشاش بشاش تھا۔

جاشیہ کو شاید یہ سب کچھ ناگوار گزر رہا تھا۔ اس لیے وہ اچانک غائب ہو گئی۔ کچھ دن تک تو مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ اس کے جانے سے مجھے کتنا فرق پڑ رہا ہے۔ میں اپنے کاموں میں مصروف رہا۔ کچھ دن کے بعد مجھے پتا لگا کہ جتنی فصل اگی تھی سب کٹ چکی ہے، اب زمین کو نئے بیجوں کی ضرورت ہے۔

ایسے میں، میں اپنے آپ کو خالی چھوڑ دیتا تھا۔ فصل موسم کے ساتھ ہی پکتی، اس میں عجلت سے کام نہیں چلتا۔ لیکن یوسف کمال کے ٹیلی فون نے میرے اندر بالکل مچادی تھی اور میں کوئی تہلکہ خیز کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ ایسے میں مجھے جاشیہ کی سخت ضرورت محسوس ہوئی وہی میری مدد کر سکتی تھی۔



تقریباً کس دن کے طویل انتظار کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ اس کے گھر جاؤں اور پتا کروں کہ کیا وجہ ہے میں آج تک اس کے گھر نہیں گیا تھا۔ حالانکہ اس نے مجھے کئی بار آفر کی تھی۔ اس کا گھر اندرون شہر میں تھا۔ میں نے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر گھر کا جائزہ لیا۔ گھر چھوٹا سا تھا لیکن پکا اور پنپٹ شدہ تھا۔ میں نے ڈور بیل پہ انگلی رکھ دی۔ بجائے اندر سے جواب آنے کے کئی میں سے ہی ایک بچہ پھیلے پھیلے میری طرف آیا اور پوچھنے لگا۔ ”آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ میں نے سوچا یہ بچہ اسی گھر کا ہوگا جب ہی مجھ سے سوال کر رہا ہے۔

میں نے اسے بتایا۔ ”مجھے جاشیہ سلطان سے ملنا ہے۔ کیا وہ اسی گھر میں رہتی ہیں؟“ میرے منہ سے جاشیہ کا نام سن کر بچے کی عمر یک دم بارہ سال سے اسی سال ہو گئی۔ اس نے پیشانی پہ بل ڈال کر میری طرف دیکھا۔ اور بڑے سخت انداز میں بولا۔ ”شاید آپ کو معلوم نہیں جاشیہ آپا کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ مایوں بیٹھی ہیں اور جب ہمارے یہاں لڑکیوں کی شادی کی تاریخ پکی ہو جاتی ہے تو وہ کسی مرد سے نہیں ملتیں۔“ میرے لیے یہ خبر بڑی حیرت انگیز تھی۔

اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ میں ابھی بچے سے مزید سوال کرتا کہ گھر کا دروازہ کھلا اور ایک اچھی خاصی عمر کی عورت نمودار ہوئی۔

”کون ہے؟ کس سے ملنا ہے؟“

میں نے پہلے اس خاتون کی طرف دیکھا پھر بچے کی طرف۔ ”یہ جاشیہ آپا کی امی ہیں۔“ بچے نے اپنے سابقہ انداز میں بتایا۔

میں نے فوراً نہیں سلام کیا۔
 ”میرا نام اسید شمران ہے۔ آپ کی بیٹی جاشیہ میرے ہاں کام کرتی ہیں، کئی روز سے نہیں آرہیں۔
 میں پتا کرنے آیا ہوں کہ کیا وجہ ہے؟“
 ”اچھا۔ تو آپ ہیں وہ مصنف۔ آئیے اندر آجائیے۔“
 میں اندر آ گیا۔ چھوٹی سی راہداری کے بعد ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔
 خاتون نے مجھے وہاں بٹھا دیا۔ پھر سلجھے ہوئے انداز میں بولیں۔
 ”جاشیہ آپ کے ساتھ کام کرتی تھی۔ لیکن اب نہیں کرے گی۔ کیونکہ ہم اس کی شادی کر رہے ہیں۔“

(اس بات کا تو مجھے گھر کے باہر ہی پتا چل گیا تھا، اندر لا کر بتانے کی ضرورت کیا تھی)
 ”اچھا مبارک ہو آپ کو۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔
 خاتون تھوڑا سا مسکرا دیں۔ پھر پوچھنے لگیں۔
 ”آپ چائے پیئیں گے یا۔“
 ”نہیں۔ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہو سکے تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیجیے اور اگر آپ برا
 نہ محسوس کریں تو کیا میں جاشیہ سے مل سکتا ہوں۔“ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
 ”کیوں نہیں۔ میں ابھی بھیجتی ہوں۔“
 وہ چلی گئیں تو میں ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔
 ابھی تک مجھے اس گھر سے یا گھر کی مالکن کے انداز سے ایسا محسوس نہیں ہوا تھا کہ یہ لوگ غریب
 ہیں۔ یقیناً جاشیہ شوقینہ نوکری کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جاشیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میرا خیال تھا
 اس نے پیلا جوڑا پہن رکھا ہوگا اور رو رو کر آنکھیں سجا رکھی ہوں گی۔ لیکن سب کچھ اس کے الٹ تھا۔ وہ
 لان کے تھری پیس سوٹ میں تھی۔ آنکھوں میں ہمیشہ جیسی شوخی اور ذہانت تھی۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ۔
 مجھے دیکھ کر یہ مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔
 ”السلام علیکم سر!“

”وعلیکم السلام۔“ میں اس کی آمد پہ نہ جانے بے ساختہ کیوں کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”بیٹھیے تشریف رکھیے۔“ اس نے بڑے مہمان نواز انداز میں کہا اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔
 ”آج آپ ہمارے گھر کی طرف کیسے آ گئے؟“
 ”مجھے پتا لگا تھا تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ سوچا مبارک باد دیتا چلوں۔“ مجھے اس کے سوال پہ
 غصہ آیا تو میں نے طنز سے جواب دیا۔

وہ ہنس پڑی۔
 ”میں نے تم سے کہا تھا جاشیہ اگر تمہیں چھٹی کرنی ہو تو مجھے بتا کر کرنا۔ جو نمبر تم نے مجھے دیا تھا میں
 وہاں فون کر کر کے تھک گیا۔ وہاں یا تو کوئی فون اینڈ نہیں کرتا اور اگر کوئی اٹھا بھی لے تو سوائے بچوں
 کے رونے کے کوئی آواز نہیں آتی۔“

”جی ہاں سر! مرزا صاحب کے گیارہ بچے ہیں۔ ہمیں ہمیشہ اپنے رشتہ داروں سے ایسی ہی شکایت ملتی ہے۔“ وہ سکون سے بولی۔

”مجھے مرزا سے کیا لینا۔ مجھے تو تم پر غصہ ہے۔ تم نے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ اگر میں اب بھی پتا نہ کرتا تو تم تو چند روز تک پیاسنگ سدھار چکی ہوتیں۔“

”بس سر۔ مصروفیت ہی ایسی رہی۔ میں ایک دو روز تک آپ کو اطلاع کرنے والی تھی۔“

”لیکن یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہوا کیسے، تم نے اس سے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔“

”بتانا میں نے، سب کچھ بس جلدی جلدی میں ہی ہوا ہے۔“ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کوئی بھی نیا تاثر نہیں تھا، نہ غم کا نہ خوشی کا۔

”تمہاری شادی ہو کس سے رہی ہے؟“

”اپنے منگیتر سے سر!“

”اوہ۔ ہو۔“ میں جھنجھلا گیا۔ ”میرا مطلب ہے تم اسے پہلے سے جانتی تھیں۔“

”بالکل نہیں۔“

”ایک انجانے شخص کے ساتھ کیسے زندگی گزارو گی۔“ وہ میرے اچنبھے پر ہنس پڑی۔

”سر! یہ زندگی ہے کوئی آپ کا افسانہ نہیں۔ جس میں پہلے سے محبت کرنا ضروری ہو۔ اور زندگی کا

دار و مدار محبت کی کامیابی یا ناکامی پر ہو۔“ مجھے اس کے ریمارکس پر بہت غصہ آیا، وہ جاتے جاتے بھی میری تحریروں پر چوٹ کر رہی تھی۔

(نہ جانے یہ لڑکی اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ حالانکہ سب لڑکیاں اندر سے ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اگر مجھے تقدیر موع دیتی تو میں اس پر اپنا آپ ثابت کر سکتا تھا۔)

اتنے میں وہ لڑکا جس نے باہر مجھ سے گفتگو کی تھی لوازمات کی سادہ سی ٹرائی لے آیا۔ جاشیہ چائے بنانے لگی۔

”یہ لڑکا تمہارا بھائی تھا؟“ اس لڑکے کے جانے کے بعد میں نے جاشیہ سے پوچھا۔

”یہ مرزا صاحب کا چوتھا بیٹا تھا۔ میرا نہ کوئی بھائی اور نہ بہن۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ شاید میں نے آپ کو بتایا بھی تھا۔ محلے کے سب بچے مجھے آپا کہتے ہیں کیونکہ محلے کے بچوں میں

سب سے بڑی ہوں۔“

”تم ابھی تک اپنے آپ کو بچوں میں شمار کرتی ہو؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

جاشیہ ہنس پڑی۔ پھر میری طرف چائے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”ویسے سر! آپ کی آمد میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ میری غیر

حاضری کو اتنی اہمیت دیں گے اور گھر تک چلے آئیں گے۔ بائی داوے میں نے آپ سے کوئی ادھار تو نہیں لے رکھا۔“

میں ہنس پڑا۔ ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے تمہاری کمی محسوس ہوئی تو پوچھنے آ گیا۔ اور کئی روز

سے تو زیادہ ہی کمی محسوس ہو رہی تھی۔“

آج مجھے اس کی تعریف کرنے میں کوئی گھانا یا نقصان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے میں نے جی بھر کر اس کی تعریف کی۔

”واقعی جاشیہ! تم ایک ذہین لڑکی ہو۔ میں کتنے ہی بددگار رکھ لوں تمہیں کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔“

میرے تعریف کرنے پر وہ ہمیشہ کی طرح چمک اٹھی اور کہنے لگی

”میں بھی سر! آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی اور زندگی میں فرصت ملی تو آپ سے ملنے آیا کروں گی۔“

میرا خیال تھا کہ اسے شادی کے بعد مجھ سے ملنے کی فرصت کبھی نہیں ملے گی اس لیے مجھے جاشیہ کو بھول جانا چاہیے۔

لیکن جاشیہ بھول جانے والی چیز نہیں تھی۔ ہر قدم پر مجھے اس کی تنقید جو میرے لیے اصلاحی پہلو رکھتی تھی، یاد آ رہی تھی۔

میں نے اس کے خیال کو جھٹکنے کی بہت کوشش کی۔ کیا میں جاشیہ سے پہلے رانسٹر نہیں تھا۔ مجھے اپنی کمزوری بری لگ رہی تھی۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ نئی ہیلپر رکھ لوں لیکن جاشیہ کی عادت نے مجھے سب سے بے زار کر دیا تھا۔



ڈھائی ماہ کے بعد جاشیہ کو آج اپنے گھر میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

”اتنی جلدی تمہیں مجھ سے ملنے کی فرصت مل گئی؟“

”جبکہ آپ کا خیال ہوگا کہ میں آپ سے کبھی نہیں مل پاؤں گی۔ ہاں۔۔۔ ایسا ہو سکتا تھا بشرط یہ کہ

میری شادی ہو جاتی لیکن چونکہ میری شادی کینسل ہو گئی ہے سو مجھے مصروف تو رہنا ہے۔“

”شادی کینسل ہو گئی؟“

”نہ صرف کینسل بلکہ قصہ بالکل ختم۔“ وہ مزے سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ میری حیرت جائز تھی۔

”دراصل سر! جس لڑکے سے میری مٹگنی ہوئی تھی وہ کسی اور کو پسند کرتا تھا۔ اس کے والدین نے

زبردستی مٹگنی تو کر دی، لیکن اسے شادی کے لیے رضامند نہیں کر سکے اور یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔“

اس نے اطمینان سے کہا۔

اور میں اس کے اطمینان پر حیران رہ گیا۔

”تمہیں کچھ نہیں ہوا؟“

”کیا مطلب سر؟“

”مطلب یہ کہ تمہیں اپنی انسٹ محسوس نہیں ہوئی۔“

”اس میں انسٹ کی کیا بات ہے سر! وہ پہلے سے کسی اور کو پسند کرتا تھا۔ اس کے والدین کو یہ

بات سوچنی چاہیے تھی۔ انسٹ میری نہیں اس کے والدین کی ہوئی ہے۔ اور شاید میری انسٹ تب

ہوتی جب میں اس لڑکے میں انوالو ہوئی۔ جب کہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی اور آپ کی اطلاع

کے لیے عرض ہے کہ یہ رشتہ ختم کرنے میں میرا اپنا ہاتھ تھا۔ کیوں کہ اس نے مجھ سے خود رابطہ کیا تھا۔“

”کیا ایسا تمہارے ساتھ پہلی بار ہوا ہے۔“

”آف کورس۔ آپ کا کیا مطلب ہے کیا روز میری منگنیاں ہوتی ہیں اور نوتی ہیں لا حول ولا۔۔۔ منگنیاں نہ ہوں تو می اسبلی ہو گئی۔“

میں ہنس پڑا۔ اور توقف سے بولا۔

”چلو، یہ بھی اچھا ہوا۔ کہ تم خود اس رشتے میں انوالو نہیں تھیں وگرنہ تم اس وقت بے حد دکھی ہوتیں۔“

وہ ہنس پڑی۔ اور بڑے اعتماد سے بولی۔

”میں انوالو ہو بھی نہیں سکتی تھی۔“

”خیر یہ بات تو رہنے دو۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اپنے منگیترا کا۔“

”حمزہ۔۔۔۔“

”ہاں۔ اگر حمزہ صاحب تم میں تھوڑی سی بھی دلچسپی رکھتے تو تمہارا انوالو ہو جانا فطری سا تھا۔“

”سر! کہانیوں اور حقیقی کرداروں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، اگر ہم ملتے ملتے جلتے تو

میں اُسے پسند کرنے لگ جاتی۔ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے مردوں کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”لیکن شادی تو تمہاری کسی مرد سے ہی ہوگی۔“

”بے شک۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے مردوں کی محبت پہ زیادہ اعتبار نہیں ہے۔“

”کیا کسی مرد نے تم سے بے وفائی کی ہے۔“

وہ ہنس پڑی اور لاپرواہی سے بولی۔ ”کوئی وفا کرتا تو بے وفائی کی نوبت آتی۔“

میں فوری بھانپ گیا اس لڑکی کا مسئلہ کچھ بھی نہیں معمولی سی بات ہے یہ لڑکی خود سے محبت کرتی

ہے۔ صنف مخالف کو اگنور کر کے اپنے آپ کو ارفع محسوس کرتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی مرد اس کے

قریب آیا ہی نہیں۔ تو وہ اس جذبے کو کیسے محسوس کر سکتی تھی۔

اور میں نے اسی وقت ارادہ کیا کیوں نہ اس لڑکی کے ساتھ ایک کھیل کھیلا جائے۔ ایک محبت کا

کھیل۔

اگر وہ اپنی ذات سے محبت کرتی تھی تو میں کون سا اپنے دائرے سے باہر تھا اور یہی میری

سب سے بڑی کمزوری تھی کیوں نہ اپنی اس کمزوری کو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دور

پھینک دوں۔ اپنی ذات سے باہر تو نکلوں۔ آخر کب تک میں ایسا ہی رہوں گا۔ ڈرپوک اور

بزدل۔ جاشیہ اگر میری اسلٹ بھی کرے گی تو کیا ہے اس چار دیواری میں ہی تو ہوگا سب کچھ۔

کون دیکھ رہا ہے؟

یہ خیال کتنا خوش گُن تھا میں ایک لڑکی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ حالانکہ مجھے اس سے محبت نہیں

تھی۔ لیکن میرا دل چاہتا تھا میں اس سے اظہارِ محبت کروں۔ اور اپنے جذبات کا رنگ اس کے چہرے پہ دیکھوں۔

جاشیہ نے باقاعدگی کے ساتھ آنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس بار میں اس کی ذات میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ یعنی وہ کپڑے کیسے رنگوں کے پہنتی ہے۔ میں اس کے انتخاب کی گاہے بگاہے تعریف کر دیتا۔

نازک مگر سانولی سی۔ بڑی بڑی آنکھوں والی مس جاشیہ سلطان میرے لیے ایک کھلونا تھی جس سے میں نے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا اس عمل سے میں خود کو صرف جرات کے قریب کر رہا تھا۔ قلم کے ساتھ کر داروں کو کھلاتا ہوں۔ ذرا خود بھی تو کھیلوں اور پھر یہ کھیل شروع ہو گیا تھا۔ سرد کو میری دلچسپی کا اندازہ ہوا تو ایک روز اس نے اکیلے میں مجھے آن لیا۔ ”مجھے تو معلوم تھا۔ ایسا تو ضرور ہوگا۔“ میں ہنس دیا۔ جب وہ مجھے زیادہ تنگ کرنے لگا تو میں نے اسے سچ بتا دیا۔

وہ بھی خود لاپرواہ اور کھلنڈر سا تھا۔ میری بات سے بہت محظوظ ہوا۔



وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے جاشیہ سے انسیت ہوتی جا رہی تھی۔ میں لکھواتے لکھواتے اس کے ہاتھ دیکھنے لگ جاتا۔ سب خواتین کے ہاتھ ایسے ہی ہوتے ہیں یا جاشیہ کے ہاتھ اتنے ملائم اور خوب صورت ہیں، تب جاشیہ قلم بجائی اور مجھے متوجہ کرتی۔ ”سر! آپ منظر میں بہت زیادہ کھو جاتے ہیں۔“ میں خفیف سا ہوجاتا۔ اور پھر لکھوانے لگتا۔ اسی طرح آج ہوا۔ میں بول رہا تھا اور جاشیہ کا قلم چل رہا تھا۔ ”سین اتنی خوب صورت تھی کہ راحیل اسے دیکھتا تو دیکھتا رہ جاتا ایک دن راحیل نے سین سے کہا۔“

”تمہیں دیکھ کر دل کرتا ہے شاعر بن جاؤں اور تمہارے بارے میں اور صرف تمہارے بارے میں لکھوں۔ تمہارے بال، تمہاری آنکھیں، تمہاری ہنسی۔ سین تم کیا ہو۔ آئی لو یو۔ آئی لو یو۔“ ”سر!“ جاشیہ زور سے چلائی اور میں جو راحیل بنا سین اور جاشیہ کو ایک کیے بیٹھا تھا۔ اچھل پڑا، اس نے اپنے ہاتھ سے میرا ہاتھ ہٹایا اور جتانے والے انداز میں بولی۔

”سر! سین نہایت کالی اور بھدی لڑکی ہے اور راحیل، راحیل تو اندھا ہیرو ہے۔“

”مگر۔ میں تو اندھا نہیں ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ جاشیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”میرا مطلب ہے کیا اندھوں کے جذبات نہیں ہوتے۔“ میں نے ذرا عجب سے کہا۔

”وہ۔۔۔ اندھا ہے۔ تب ہی تو کالی اور بھدی کی تعریف کر رہا ہے۔“

”اوہ۔“ جاشیہ ہنس پڑی۔

سلسلہ تحریر پھر چل پڑا۔ میں جاشیہ کو دیکھ رہا تھا اور بس بول رہا تھا۔
 ”سر! اب بس کیجیے۔“ جاشیہ نے اکتا کر قلم رکھ دیا۔ ”اس کا لو کی تعریف میں تقریباً تین صفحے ضائع ہو چکے ہیں۔“

”تم تو کالی نہیں ہو جاشیہ!“

”واٹ ڈو یو مین سر!“

”میرا مطلب ہے سین بھی تمہاری طرح ہے۔ فراخ دل، خوش اخلاق، خوش مزاج۔“

”سر! آپ بھی تو فراخ دل ہیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ پیے ہوں گے۔“

”ایک تو تمہاری یہ پیسے مانگنے کی عادت بہت بری ہے۔“

”سر! خوش مزاج رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی من پسند اشیاء کھائی جائیں۔ اچھا ایسا کرتے ہیں دونوں اکٹھے برگر کھاتے ہیں۔“

”تم ایسا کرو۔ چائے بناؤ۔ میں برگر لے کر آتا ہوں۔“

”سر! یہ پیسے خواہ میں سے تو نہیں کٹیں گے؟“ وہ خوف زدہ ہو کر بولی تو میں ہنس پڑا۔

رفتہ رفتہ مجھ میں اور جاشیہ میں بے تکلفی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب میں ان کے گھر بھی آنے جانے لگا تھا۔ اس کی ماں کو دیکھ کر لگتا کہ وہ صرف گھر کے کام کاج کرنے کے لیے دنیا میں آئی ہے اور باپ عبادت کرنے کے لیے۔ وہ لوگوں کو تعویذ بنا کر دیتا تھا۔ جھاڑ پھونک بھی کرتا تھا۔ یوں سارا دن اس کے پاس گھر کے لیے کوئی وقت نہ ہوتا۔ ایسے میں واقعی جاشیہ کو گھر کے ماحول سے ٹھنن ہوتی ہوگی۔ تب ہی اس نے سترہ سہیلیاں اور خود کفالت سیشن رکھ لیا تھا۔

ان کا ذریعہ آمدنی اس کے باپ کا لوگوں کا روحانی علاج اور کرائے کی تین دکانیں تھیں۔ ظاہر ہے اس لگی بندھی رُم میں کیا اخراجات پورے ہوتے ہوں گے۔

میں نے جاشیہ کی خواہ بڑھادی۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھی اور میں بھی اس سے بہت خوش تھا۔ میں اس کی تعریف کرتا تو وہ برانہ مانتی لیکن مجھے اس بات کا کیا فائدہ تھا۔ میں ایک لڑکی کی طرح اس کے چہرے پر اپنے جذبات کے رنگ دیکھنا چاہتا تھا۔

آج وہ کالا سوٹ پہن کر آئی تھی۔ کالے کپڑوں میں اس کا گندمی رنگ سونے کی طرح کھل رہا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں آج اور پھر پُرکشش لگ رہی تھیں۔

”کالا رنگ تمہیں بہت سوٹ کرتا ہے۔“

”شکریہ سر۔“

”کبھی آدھی رات کو تم نے پورا چاند دیکھا ہے؟“ میں اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے جذب سے

بولا۔

”سر! اگر میں نے کبھی ایسا کیا تو اماں پاگل سمجھ کر گھر سے نکال دیں گی۔“ وہ لاپرواہی سے بولی تو

میں نے سر پکڑ لیا۔

”جاشیہ! تم نے عمر کہاں گزاری ہے؟“

”آدھی دھیال میں اور آدھی ماں باپ کے پاس، کیوں سر؟“
 ”ایسے ہی جی چاہ رہا تھا۔ تمہارے رشتہ داروں کو سلام کر کے آؤں۔“ میں نے چڑ کر کہا اور کام شروع کر دیا۔
 ”جاشیہ! تم نے کبھی بال نہیں کھولے۔“ میں نے اس کے لمبے گہرے سیاہ بالوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”سر! روز کھولتی ہوں نہانے کے لیے۔ اور جب اماں کو مجھ پہ پیارا آتا ہے تو گھنٹوں جو میں دیکھتی رہتی ہیں۔ سر! یہ ہمارے یہاں بہار کرنے کا عجیب ہی انداز ہے کسی پر جیسے ہی پیارا آیا۔ جھٹ پکڑا۔ اور بال چند دنے بیٹھ گئیں۔ ایک نئی نوٹلی دلہن کے ساتھ جب بہت ساری خواتین نے بیک وقت اظہار محبت کا یہ انداز اپنایا تو دولہا گھر سے بھاگ گیا۔ نہ جانے کتنی جوئیں ہوں گی دلہن کے جو ساری غورتیں و فویر شوق سے جت گئی ہیں۔ مائی گاڈ۔۔۔“

جاشیہ اپنے لطیفہ پہ خود ہی دانت نکال رہی تھی اور میں اسے غصے سے دیکھ رہا تھا۔
 آج بس میں نے سوچ لیا تھا۔ اسے اس نور کستی میں چت نہ کر دوں تو اسید نام نہیں۔ آج اس نے ہلکے آسمانی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی کلاں سادی سی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ میرے سامنے بھی اور میں اس کے سامنے۔ میرا دل چاہا اس کی چوڑیوں کو پھینٹوں اور پھر اچانک میری انگلی اس کی چوڑیوں کو گننے لگی اور پھر اس کی کلائی تک پہنچ گئی۔

جاشیہ اچانک بدک گئی۔ اس کے چہرے پہ خفیف سارنگ تھا اس نے جلدی سے میز پہ سے ہاتھ اٹھا لیا اور حیرت و جھجک کے ملے جلے تاثرات سے مجھے دیکھنے لگی۔ حیرت کی بات ہے، مجھے ذرا بھی شرمندگی نہیں ہوئی اور میں ڈھٹائی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اس کی جھجک نے مجھے اس پہ حادی کر دیا تھا۔

”تمہارے ہاتھ بہت خوب صورت اور ملائم ہیں جاشیہ!“
 اور دوسرے ہی پل چٹاخ سے جاشیہ کا زوردار پھنٹر میرے منہ پہ آگیا۔ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”سر! یہ ہاتھ وقت پڑنے پہ کھر درے بھی ہو جاتے ہیں۔“
 میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ کیا جاشیہ میرے حوالوں پہ اتنی سوار ہو گئی تھی کہ مجھے رات دن اس کے سپنے دکھائی دینے لگے تھے۔
 میں نے ایک سردی جھر جھری لے کر اپنے گال پہ ہاتھ رکھا۔ شکر ہے کہ سپنا تھا حقیقت نہیں۔ میں لالچول پڑھ کر واپس لیٹ گیا۔



آج جاشیہ نے واقعی آسمانی سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجھے رات کا خواب یاد آ گیا۔ میں نے سوچا کہیں

خواب کچ ثابت نہ ہو جائے۔ اس لیے آج جاثیہ سے محتاط رہوں گا۔ جاثیہ نے بال کھولے ہوئے تھے۔ حالانکہ سپنے میں وہ چوٹی کے ساتھ تھی۔ کیا وجہ تھی جاثیہ میرے حواسوں پہ چھاتی جا رہی تھی۔ میں اسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔

”سر! ادیب لوگ نہایت بزدل ہوتے ہیں، اپنی خواہشات کا اظہار قلم سے کرتے ہیں۔“ اس نے میری چوری پکڑ لی تھی۔

میں گھسیسا گیا۔

”شاید انہیں پتھر سے ڈر لگتا ہے۔“

”کیا مطلب سر؟“

”کچھ نہیں۔“ میں جلدی سے بولا۔

”کیوں نہ جاثیہ! ہم باہر لان میں بیٹھ کر کام کریں۔ موسم بہت خوش گوار ہو رہا ہے۔“

”سر! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ باہر تو بڑی سخت دھوپ ہے۔“

اس کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ تھی میں سر کھجانے لگا۔

”شاید تمہارے بالوں کی گھٹائیں میرے حواسوں پہ چھا رہی ہیں۔“

میری ازلی بزدلی میرا گلا گھونٹ رہی تھی۔ لیکن ہمت کر کے میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہہ

دیا۔

وہ کہنے لگی۔ ”سر! میرے حواس ابھی قائم ہیں۔ مجھے کسی کہانی کا کردار مت سمجھئے گا۔“

”جاثیہ آئی لو یو۔۔۔!“ میں نے کہنے میں ایک سینڈ لگایا۔

جاثیہ ایسے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے اس کی کرسی کے نیچے بم پھٹ گیا ہو۔

”مجھے کیا معلوم تھا دل لگی، دل کی لگی بن جائے گی۔“

”سر! میرا خیال ہے مجھے یہ جاب چھوڑ دینی چاہیے۔ آپ کہانی لکھواتے لکھواتے کہانی کا کردار

بن رہے ہیں۔“

”تو تم اس کہانی کو مکمل کر دو نا۔“

وہ کچ بک بکھلا گئی اور کچ مچ مجھے بہت مزا آیا۔

”آئی ایم سوری سر! میں چلتی ہوں۔“

وہ جانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرا جذبہ صادق تو تھا اس پہ اثر کیوں نہ کرتا۔

اس نے نگاہیں پتلی کر لیں۔

”جاثیہ! میری بات کا یقین کرو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے میری طرف دیکھا اور دوسرے ہی بل نگاہ جھکالی۔

”تھپ۔۔۔ تھپ۔۔۔ تھپ۔“ تالی کی آواز پہ ہم دونوں نے بیک وقت مڑ کر، دیکھا۔

سامنے ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”اس بات سے ثابت ہوا سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔“ میں جلدی سے سنبھل گیا۔ جاثیہ

خفیف سی ہوگئی، وہ تالی بجاتے بجاتے ہمارے قریب آگیا۔
 ”بہت زبردست پچویشن تھی۔ اگر حقیقت ہوتی تو۔۔۔ اب ہمارا ہیرو بھی ہیرو بننا چاہ رہا ہے۔“

اس نے مجھے تھپکی دی۔ جاشیہ کبھی اس کی اور کبھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔
 ”مس جاشیہ! پریشان نہ ہوئے۔ یہ محض ایک کھیل تھا جس میں یہ بے وقوف کامیاب ہونا چاہتا تھا۔ سو ہو گیا۔“

”کھیل!“ جاشیہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
 میں بوکھلا گیا۔ جبکہ سرمد لاپرواہی سے ہنس رہا تھا۔
 ”تو آپ کیا سمجھ رہی ہیں۔ یہ آپ سے واقعی محبت کرنے لگا ہے، جسٹ فار جوک۔ یہ محض تجربہ کر رہا تھا آپ پر۔“

تذکیل کے احساس سے جاشیہ کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا۔
 ”یہ آج تک کسی لڑکی سے اظہارِ محبت نہیں کر سکا تھا۔ آج اس نے جرات کی تو آپ پر۔ اس کریڈٹ کی حق دار آپ ہیں۔ خیر اس نے آپ کو بھی ایک نئے احساس سے روشناس کرا دیا ہے۔“

جاشیہ کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ اس نے اپنا پرس اٹھایا۔ اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر میرے کمرے سے نکل گئی۔

”جاشیہ سنو تو سہی۔“ میں تیزی سے اس کے پیچھے بھاگا، لیکن وہ ہوا کی طرح غائب ہوگئی۔
 ”یہ کیا بد تمیزی تھی؟“ میں سرمد یہ چڑھ دوڑا۔
 ”بد تمیزی یا! خواجہ لڑکی خوش تھی کا شکار ہو جاتی میں نے جلد ہی پول کھول دیا۔ تم بد تمیزی کہہ رہے ہو۔“

”تم نے بہت غیر اخلاقی حرکت کی ہے۔“ مجھے بہت غصہ تھا۔
 ”اور تم جو اخلاق کے دائرے سے باہر ہوئے جارہے تھے۔“
 ”شٹ اپ! تمہیں میرے معاملات میں یوں دخل اندازی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ میرا اور اس کا ذاتی معاملہ تھا۔“

”ذاتی معاملہ۔“ سرمد حیران ہو کر رہ گیا۔
 ”کل تک تو ایک ڈرامہ تھا۔ اچانک ذاتی معاملہ کیسے ہو گیا۔“
 ”میں اسے سچ مچ پسند کرنے لگا ہوں۔“ میں نے اقرار کیا۔
 ”اے بھائی!“ سرمد نے مجھے جھنجھوڑا۔ ”کیا تم ہوش میں ہو؟“
 ”ہاں۔ میں ہوش میں ہوں۔“ میں چلا یا۔

”یہ سچ ہے کہ میں اس کے ساتھ ڈرامہ کر رہا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ ڈرامہ میری زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے سرمد! تم نے اس کے دل کو ہی نہیں پہنچائی، مجھے بھی

اس کی نظروں میں ذلیل کر دیا ہے۔“

سرمد چپ چاپ مجھے دیکھتا رہا۔

”آئی ایم سوری۔ مجھے یہ سب معلوم نہیں تھا۔ اگر تم اتنے ہی سیریس تھے تو اس کے والدین کے پاس پر پوزل بھیجتے۔“

”ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔“ میں زچ ہو گیا۔

”اب وقت ضائع نہ کرو۔ اپنا پر پوزل بھیج دو اور باوقار طریقے سے شادی کرلو۔ ویسے بھی اب تمہاری عمر عشق لڑنے کی تو ہے نہیں۔“

وہ پھر غیر سنجیدہ ہونے لگا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کچھ بول رہا تھا، لیکن مجھے جاشیہ کی فکر تھی۔

اگلے ہی روز میں اس کے گھر ملنے گیا اور اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ جاشیہ میرا چین، سکون سب کچھ لوٹ کر لے گئی تھی کیا میں دوسری بار بھی پونہی تہی دست رہ جاؤں گا۔ میں نے آپا کو فون کیا جنہیں صرف سال میں دو بار میری شادی کی فکر ستاتی تھی اور پھر بھول جاتیں۔ جیسے ہی آپا کو پتا چلا کہ میں شادی کے لیے رضا مند ہو گیا ہوں۔ وہ کوئٹہ سے سرپنٹ دوڑی آئیں۔

میں بتا نہیں سکتا وہ کتنی خوش تھیں، لیکن میں تب خوش ہوتا جب جاشیہ ہاں کر لیتی۔ وہ جاشیہ کے گھر سوال لے کر گئیں لیکن وہاں سے انکار ہو گیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ جاشیہ اتنی کٹھور ثابت ہوگی۔

ایک بار نہیں میں نے کئی بار آپا کو بھیجا لیکن مسلسل انکار ہوتا رہا۔ آپا اس پر پوزل سے اکتا گئیں۔ ایک تو وہ خاصے امیر شخص کی بیوی بن چکی تھیں۔ اس لیے جاشیہ کے گھر والوں کے زیادہ نخرے برداشت نہیں کر سکیں۔ دوسرے جاشیہ کا گھر انہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جو انہیں اپنی شخصیت کے شایان شان نہیں لگ رہا تھا۔ کہنے لگیں۔

”تمہیں بھی پوری دنیا میں ایک وہی لڑکی ملی تھی۔ تیس سال کی عمر میں شادی کی ہامی بھی بھری تو اس مولانا کی بیٹی سے جس کی نہ شکل ڈھنگ کی اور نہ مزاج۔ ماں ایسی ہے اس کی جیسے سولہویں صدی کی روح ہو۔ اس سے بھی اچھی اچھی بہت لڑکیاں ہیں، اگر تم کہو تو بات کروں۔“

مجھے آپا کی بات بہت بری لگی۔ اب میں آپا کو ساری بات تو نہیں بتا سکتا تھا۔

سرمد میری پریشانی کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”اب اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔ میں بہ نفس نفیس محترمہ سے معافی مانگ آیا اور اسے ہزار ہا یقین دلایا کہ میں مذاق کر رہا تھا۔ لیکن وہ تو ایسے مسند پہ بیٹھ گئی ہے جیسے بہادر شاہ ظفر کی پوتی یا سلطان اعظم سے اس کا حجرہ ملتا ہو۔ یار! میں تو کہتا ہوں خواجواہ اس جیل کو شاہین کا رتبہ نہ دو اور جہاں آپا کہتی ہیں شادی کرلو۔“

”تم نے جیل کسے کہا؟“ مجھے سرمدز ہر لگ رہا تھا۔

”اے، جسے تم بھولی بلبل سمجھ رہے ہو۔ اگر اپنا وقار اور اپنے فن کی بقا چاہتے ہو تو کسی اچھی سی جگہ چپ چاپ شادی کرلو۔ سمجھ لو جاشیہ تمہاری زندگی میں آئی ہی نہیں تھی۔“

”کیسے یقین دلاؤں اس دل کو۔ جو صرف جاشیہ، جاشیہ پکارتا رہتا ہے۔“ میرے دل میں ٹیس سی اٹھی۔
 نہیاں کی محبت، خاموش محبت تھی۔ لیکن جاشیہ سے میں اعتراف کر چکا تھا۔ اور جاشیہ دنیا کی پہلی لڑکی تھی۔ جس سے میں نے اعتراف محبت کیا تھا یعنی اپنی زندگی بھر کی پونجی اس کے حوالے کی تھی۔
 پھر کیسے اس دل کو سنبھالوں۔ سمجھاؤں۔



کئی دن کئی راتیں بے چین مضطرب گزر گئیں۔
 اور مجھے آیا کے فیصلے کے آگے ہار ماننا پڑی۔ آپا نے میرے لیے ایک اور لڑکی دیکھ لی تھی۔ پڑھی لکھی تھی، ذہین تھی، خوب صورت تھی اور نہ جانے اس میں کیا کیا خوبیاں تھیں۔ لیکن وہ جاشیہ نہیں تھی اور شادی کا دن بھی طے ہو گیا۔
 شادی بڑی سادگی سے انجام پائی۔ سادگی کی وجہ یہ تھی کہ لڑکی کا گھرانہ مذہبی تھا۔ شادی کی رسومات میرج کلب میں انجام پذیر ہوئیں۔ رات گئے مہمانوں کو رخصت کر کے ہم دہن کو گھر لے آئے۔

میری بھابھیاں اور بہن دہن کو میرے کمرے میں لے گئیں۔ میں اپنے قریبی دوستوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ لیکن میرا دل ویران تھا، اور میں اپنے دل کو اس نئے فیصلے سے ہم آہنگ کرنے میں لگا ہوا تھا۔

اور پھر وہ گھڑی بھی آگئی جب مجھے اس اجنبی خاتون کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ کمرے میں داخل ہو کر میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ کاش یہاں جاشیہ ہوتی۔ تو یہ کرا جو رنگ برنگی خوشبوؤں سے معطر اور پھولوں سے آراستہ ہو کر بھی مجھے زہر لگ رہا ہے کتنا خوب صورت لگتا۔

مگر۔۔۔ نہیں۔۔۔ محبت میں دوسری بار ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد مجھے ہیٹ ٹرک سے بچنا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو۔ میری بے زاری کو دیکھتے ہوئے یہ خاتون جو میری بیوی بن چکی ہے۔ مجھ سے دل برداشتہ ہو کر مجھے چھوڑ جائے۔ اس لیے بہتر ہے زندگی کی اس صورت کو قبول کر لوں۔

اور پھر میں کرسی کھینچ کر بیڈ کے قریب بیٹھ گیا۔ اور سلسلہ کلام شروع کیا۔
 ”آپ اور میں، ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں، حتیٰ کہ میں آپ کا نام بھی نہیں جانتا۔ میں نے بنا پڑھے ہی نکاح کیا ہے یہ دستخط کیسے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آپ کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن آپ کو میرے دل میں جگہ پانے کے لیے خود محنت کرنا پڑے گی۔ میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں اس وقت بہت بھرا ہوا ہوں۔“

”آپ سے پہلے میری زندگی میں دولڑکیاں اور بھی آچکی ہیں، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ آخری لڑکی ہیں۔ آپ کے بعد میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔“

میں نے شکستہ سے انداز میں کہا۔
 ”ذرا ان دلوں کیوں کے نام بھی بتا دیجیے۔“ گھونگھٹ میں سے بڑی سریلی آواز آئی۔
 ”میرا خیال ہے آپ کو ان ناموں اور انسانوں کی فکر نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ان سے اب میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔“
 ”میں مکسے یقین کر لوں؟“ چمک کر پوچھا گیا۔ ساتھ ہی گھونگھٹ بھی اٹھ چکا تھا۔
 میری توجہ نکل گئی۔
 ”تت۔۔۔ تم۔۔۔“

”کیوں پسند نہیں آئی؟“ جاشیہ نے شرارت سے پوچھا۔
 اور میں بتا نہیں سکتا۔ میری کیا حالت تھی۔ خوشی کے مارے میں چکرا گیا۔ کئی لمحے مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کس کے ساتھ اپنی خوشی شیئر کروں۔ اتنی بڑی خوشی پا کر کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔ اسی دیوانگی میں میں نے جاشیہ کو بازوؤں میں جکڑ لیا۔
 ”جاشیہ! جاشیہ! میری جان۔ آئی لو یو۔ آئی لو یو۔ تم نہ ملتیں تو میں۔۔۔ میں مر جاتا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ تمہیں پا کر میں کتنا خوش ہوں۔“

جاشیہ میری دیوانگی، وحشت پر سراسیمہ رہ گئی۔ یہ روپ تو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ میرے جنون سے ادھ موٹی ہو گئی۔ تب مجھے خیال آیا تو میں کچھ نارمل ہوا۔
 ”مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔“ میری خوشی چھلکی جا رہی تھی۔
 ”جب آپ میرے ساتھ ڈرامہ کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہ بدلہ لیتی۔“ وہ بہت دیر کے بعد بولی۔
 ”میں واقعی تمہارے ساتھ دل لگی کر رہا تھا لیکن نہ جانے کب دل کی لگی بن گئی۔ لیکن۔۔۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟“

مجھے اچانک خیال آیا تو میں جلدی سے بولا۔
 ”اس لیے کہ میں یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ سب لڑکیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔“
 میں سرمد کے لفظوں پہ شرمندہ ہو گیا۔
 ”وہ تو بس ایسا ہی ہے۔“

”ایسا ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے آپ نے اسے میرے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا رکھا تھا۔“
 سر! اگر آپ کے اظہار محبت پہ میں خاموش ہو گئی تھی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ میں نے وہیں آپ کو دل دے دیا تھا۔“

”اب یونہی۔ اگر دل نہیں دیا ہوتا تو تم آج یہاں نہیں ہوتیں۔“ میں نے اس کا جھوٹ پکڑا۔

وہ ذرا سا جھینپ گئی لیکن بات بناتے ہوئے بولی۔

”آپا کے بے حد اصرار پہ ہاں کی تھی میں نے۔“

”یعنی سب نے مل کر مجھے الو بنایا۔“

”الو اور چیل کی کبھی نہیں بنتی۔ ذرا تسنجل کر رہنا۔“

آپا اچانک کمرے میں داخل ہوئیں تو ہم دونوں ہی سنبھل گئے، ان کے ہاتھ میں دو لنگن تھے۔
 ”امی جی دی ہوئی نشانانی تمہاری دھن کو پہنانے آئی ہوں۔“

آپا نے جاشیہ کی کلاسیوں میں لنگن ڈالتے ہوئے کہا۔

”خوش آواز ہے؟“

پھر ہم دونوں کو دعائیں دے لگے۔ ”خوش آواز ہے؟“ میں نے آپا سے شکوہ کیا۔
 ”یعنی آپ بھی ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گئی تھیں۔“

”بھئی! مجبوری تھی اور وہ مجھ کو بلا کر لے گیا تھی۔ جاشیہ کی سترہ سہیلیاں۔ وہ سترہ تھیں اور میں اکیلی۔ بات تو ماننا تھی۔“ آپا نے لاچاری سے کہا۔
 ”آپا! آج کے بعد سے جاشیہ سے کہہ دیں اپنی سترہ سہیلیوں کو بھول جائے۔“ میں نے ذرا رعب سے کہا۔

”مگر کیوں؟“ جاشیہ نے دبا دبا احتجاج کیا۔

”اس لیے کہ یہ میرا حکم ہے۔“

”آپا!“ جاشیہ نے مدد طلب نگاہوں سے آپا کی طرف دیکھا، وہ کاندھے اچکا کر فارغ ہو گئیں۔
 ”بھئی یہ میرا مسئلہ نہیں ہے اب اسے خود ڈیل کرو۔۔۔ اور ہاں ذرا یہ خیال رکھنا کہ یہ اب تمہارے سر نہیں سرتاج ہیں۔“

مجھے کلف لگ گیا۔ جاشیہ کا منہ پھول گیا۔ آپا کمرے میں سے جا چکی تھیں۔ مجھے اس کی صورت دیکھ کر ہنسی آگئی اور پھر میں نے اسے خود سے قریب کر لیا۔

”میری زندگی کی کہانی کو تم نے بہت خوب صورت انجام دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تمہارا کیسے شکریہ ادا کروں۔“ میں نے بڑے جذب سے کہا۔

”میری سترہ سہیلیوں پر سے پابندی ہٹا کر۔“

جواب پٹ سے آیا۔ میں نے سر پکڑ لیا۔

اب کی بار جاشیہ ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی کا جلت رنگ پورے کمرے کو معطر اور تابندہ کر رہا تھا۔

